گا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
Pakistanipoint
Waqar
Azeem

نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر مشاورت
طاہر احمد قریشی
تزئین
نورالدین

جلد	38
شمارہ	06
مئی	2014

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)............40روپے
پاکستان (سالانہ)............500روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchalpk.com/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

ابتدائیہ

دستک	مشتاق احمد قریشی	10
گفتگو	عمران احمد	12
اقرا	طاہر قریشی	19

متفرق کہانیاں

مجازی خدا	محمد اعظم خاں	21
بے آواز	طاہرہ جبیں تارا	131
صیدوصیاد	ادیب سمیع چمن	139
ایک ستارہ	وقارالرحمن	145
یقین کامل	خلیل جبار	191
زخمی ممتا	انجم فاروق ساحلی	199

پبلشر مشتاق احمد قریشی، پرنٹر طاہر قریشی، مطبوعہ نئے افق پرنٹرز، کھنڈ وگوٹھ بلاک B نارتھ ناظم آباد کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

پختہ کار	اقبال احمد	69
محبت نفرت	اسرار احمد	77
تابوت	حسن اختر پریم	89
دریاب	شکیل صدیقی	91

سلسلے وار ناول

آتش زیرپا	سید بدر سعید	103
قلندر ذات	امجد جاوید	153
جگت سنگھ	شمیم نوید	223

مستقل سلسلے

روحانی علاج	حافظ شبیر احمد	217
خوشبوسخن	عمر اسرار	219
ذوق آگہی	عفان احمد	221

پبلشر مشتاق احمد قریشی، پرنٹر طاہر قریشی، مطبوعہ نئے افق پرنٹرز، کھنڈ وگوٹھ بلاک B نارتھ ناظم آباد کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

دستک

مشتاق احمد قریشی

پاک بھارت مذاکرات کیا کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں......؟

اب تک کئی بار بھارتی حکمراں مقبوضہ کشمیر کو متنازعہ قرار دے کر مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔ بھارتی حکمران اس بات سے خوب واقف ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان سب سے اہم اور بڑا مسئلہ ہی کشمیر کا ہے۔ جس کی حیثیت کا تعین ہی سارے جھگڑوں کی جڑ و بنیاد ہے' اگر مسئلہ کشمیر طے پا جائے تو نا صرف پورے کشمیر میں بلکہ دونوں فریقوں پاک بھارت کے درمیان بھی بہت سارے مسائل از خود حل ہو کر ختم ہو سکتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جس جس طرح انسانی حقوق کی بھارت خلاف ورزی کر رہا ہے اپنی لاکھوں فوج کے بل بوتے پر جو جو مظالم کر رہا ہے' وہ تمام دنیا کے سامنے ہیں' لیکن مظلوم کشمیری مسلمانوں کے ساتھ پاکستانی مسلمان ہیں اس لیے اقوام عالم کا ادارہ بھی چپ سادھے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی جس سے بھارتی حکمرانوں کو مزید شہہ مل رہی ہے۔ بھارتی حکمراں بتدریج مسئلہ کشمیر کو گمبھیر سے گمبھیر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ امریکا اور دیگر غیر مسلم حکمرانوں کی پشت پناہی سے بھارتی حکمران کشمیر سے نکلنے والے دریاؤں کا پانی پہلے ہی پوری طرح پاکستان پہنچنے نہیں دے رہے پاکستان کو ملنے والے پانی کا مسئلہ بھی کشمیر سے ہی جڑا ہوا ہے۔

بھارتی منصوبہ سازوں نے خوب سوچ سمجھ کر بلوچستان میں اپنی تخریبی کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں تاکہ پاکستان پر دو طرفہ دباؤ قائم رہے اور پاکستان' بلوچستان کے حوالے سے اپنی بقا کے مسئلے پر اُلجھا رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیر اور بلوچستان دونوں ہی پاکستان کے لیے یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر پانی کا مسئلہ تو سب پر بھاری ہے۔ جس سے پاکستان کی زراعت' معاشیات' اور اقتصادیات کا گہرا تعلق ہے۔

بھارتی حکمرانوں کی سوچ میں وہی ہٹ دھرمی ہے وہ آج بھی کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ مانتے ہیں اس لیے وہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور مذاکرات مذاکرات میں اگر کہیں کسی طرح سے باتوں باتوں میں بھی کشمیر کا ایشو اٹھنے کا خطرہ نظر آنے لگتا ہے تو بھارتی مذاکراتی وفد کی آنکھیں چڑھ جاتی ہیں اور ان کی بلیاں ان کے تھیلوں سے باہر ہی نہیں آتی۔ بلکہ باہر آ کر غرانے بھی لگتیں ہیں۔

بھارتی قیادت اگر واقعی خطے میں امن چاہتی ہی اور دونوں طرف امن کی آشا کو پورا کرنا چاہتی ہے تو انہیں کچھ قربانیاں دینا پڑیں گی۔ انہیں ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اور دونوں اطراف کے امن پسند عوام یہ توقع اور امید بھی رکھتے ہیں۔ خطے میں امن قائم رکھنے کے لیے مذاکرات کے عمل کو جاری رہنا چاہیے اور مذاکرات میں خلوص دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بھی اور جتنے بھی اختلافی مسائل حل ہو سکے انہیں حل کر لینا چاہیے کسی طرف سے بھی کسی قسم کی انا' ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے دونوں اطراف کے پر امن عوام اپنے اپنے ممالک کی قیادت سے یہ امید رکھتے ہیں کہ اپنے ممالک کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے بجائے اپنے عوام کے [illegible] ات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے اختلافات کو مثبت مذاکرات کے ذ[illegible] کی حفاظت فرمائے اور دشمنوں کو صبر و برداشت کا حوصلہ عطا[illegible] فرمائے۔ آمین

تو بہت خوشی
پھر اس میں
چار چاند لگا دیے۔ شہناز بانو کا
خاں کی کہانیاں لاجواب تھیں۔

دستک

مشتاق احمد قریشی

پاک بھارت مذاکرات کیا کبھی کامیاب ہو سکتے ہیں......؟

اب تک کئی بار بھارتی حکمراں مقبوضہ کشمیر کو متنازعہ قرار دے کر مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کی یقین دہانی کرا چکے تھے۔ بھارتی حکمران اس بات سے خوب واقف ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان سب سے اہم اور بڑا مسئلہ ہی کشمیر کا ہے۔ جس کی حیثیت کا تعین ہی سارے جھگڑوں کی جڑ و بنیاد ہے‘ اگر مسئلہ کشمیر طے پا جائے تو نا صرف پورے کشمیر میں بلکہ دونوں فریقوں پاک بھارت کے درمیان بھی بہت سارے مسائل از خود حل ہو کر ختم ہو سکتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جس جس طرح انسانی حقوق کی بھارت خلاف ورزی کر رہا ہے اپنی لاکھوں فوج کے بل بوتے پر جو جو مظالم کر رہا ہے‘ وہ تمام دنیا کے سامنے ہیں‘ لیکن مظلوم کشمیری مسلمانوں کے ساتھ پاکستانی مسلمان ہیں اس لیے اقوام عالم کا ادارہ بھی چپ سادھے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی جس سے بھارتی حکمرانوں کو مزید شہہ مل رہی ہے۔ بھارتی حکمراں بتدریج مسئلہ کشمیر کو گمبھیر سے گمبھیر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ امریکا اور دیگر غیر مسلم حکمرانوں کی پشت پناہی سے بھارتی حکمران کشمیر سے نکلنے والے دریاؤں کا پانی پہلے ہی پوری طرح پاکستان پہنچنے نہیں دے رہے پاکستان کو ملنے والے پانی کا مسئلہ بھی کشمیر سے ہی جڑا ہوا ہے۔ بھارتی منصوبہ سازوں نے خوب سوچ سمجھ کر بلوچستان میں اپنی تخریبی کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں تا کہ پاکستان پر دو طرفہ دباؤ قائم رہے اور پاکستان‘ بلوچستان کے حوالے سے اپنی بقا کے مسئلے پر الجھا رہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیر اور بلوچستان دونوں ہی پاکستان کے لیے یکساں اہمیت کے حامل

ہیں اور ان پر پانی کا مسئلہ تو سب پر بھاری ہے۔ جس سے پاکستان کی زراعت‘ معاشیات‘ اور اقتصادیات کا گہرا تعلق ہے۔

بھارتی حکمرانوں کی سوچ میں وہی ہٹ دھرمی ہے وہ آج بھی کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ مانتے ہیں اس لیے وہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور مذاکرات مذاکرات میں اگر کہیں کسی طرح سے باتوں باتوں میں بھی کشمیر کا ایشو اٹھنے کا خطرہ نظر آنے لگتا ہے تو بھارتی مذاکراتی وفد کی آنکھیں چڑھ جاتی ہیں اور ان کی بلیاں ان کے تھیلوں سے باہر ہی نہیں آتی۔ بلکہ باہر آ کر غرانے بھی لگتیں ہیں۔

بھارتی قیادت اگر واقعی خطے میں امن چاہتی ہی اور دونوں طرف امن کی آشا کو پورا کرنا چاہتی ہے تو انہیں کچھ قربانیاں دینا پڑیں گی۔ انہیں ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اور دونوں اطراف کے امن پسند عوام یہ توقع اور امید بھی رکھتے ہیں۔ خطے میں امن قائم رکھنے کے لیے مذاکرات کے عمل کو جاری رہنا چاہیے اور مذاکرات میں خلوص دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بھی اور جتنے بھی اختلافی مسائل حل ہو سکے انہیں حل کر لینا چاہیے کسی طرف سے بھی کسی قسم کی انا‘ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے دونوں اطراف کے پر امن عوام اپنے اپنے ممالک کی قیادت سے یہ امید رکھتے ہیں کہ اپنے ممالک کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے بجائے اپنے عوام کے اپنے ملک کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے اختلافات کو مثبت مذاکرات کے ذریعے طے کریں گے۔ اللہ وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور دشمنوں کو صبر و برداشت کا حوصلہ عطا کرے اور ہمارے تمام اہل وطن کی حفاظت فرمائے۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آگاہ رہو جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست رہے تو تمام بدن درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے فرمایا کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔'' (البخاری و مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

مئی 2014ء کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔ امید ہے آپ کے ذوق مطالعہ پر پورا اترے گا۔

گزشتہ دنوں ایک دوست ملاقات کے لیے تشریف لائے ہم نے انہیں نئے افق پیش کیا تو وہ ورق الٹتے پلٹتے ہوئے بولے کہ میں ہر ماہ شمارہ کا مطالعہ کرتا ہوں گفتگو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جبکہ اپوزیشن والے بھی فرشتہ نہیں وہ بھی اپنے وقت میں بڑے اعلیٰ قسم کے کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ ذرا ان کی بھی خبر لے لیا کرو۔ ہم نے انہیں گفتگو کے صفحات دوبارہ دیکھنے کا مشورہ دیا۔ ہمارا مخاطب پوری قوم ہوتی ہے۔ جس میں ہم بھی شامل ہیں ہمارا مقصد خود احتسابی ہوتا ہے، ہم کوشش کرتے ہیں کہ گفتگو میں اپنا احتساب کریں خود پر تنقید کریں۔ جو لوگ اپنے آپ پر تنقید نہیں کرتے وہ کبھی زندگی کی دوڑ میں کامیاب نہیں ہوتے۔ حکومت ہو یا اپوزیشن انہیں اقتدار تک پہنچانے کے لیے، ہم ہی اپنے کندھے پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ ایوانوں میں جا کر قومی خزانے کا غلط استعمال کریں تو اس کے ذمہ دار بھی ہم ہی ہیں کہ ہم نے غلط لوگوں کا انتخاب کیا ہمارے ہاں تو ایسا مذاق بھی ہوا ہے کہ ایک پرائمری پاس پورے سندھ کی جامعات کا چانسلر بنا دیا گیا۔ ہم نے ووٹ کا استعمال کرتے ہوئے کبھی نہیں سوچا کہ ہم جسے قانون سازی کے لیے قومی اسمبلی میں بھیج رہے ہیں وہ امیدوار قانون سے واقف بھی ہے یا نہیں۔ ہم جسے وزیر خزانہ بنا رہے ہیں وہ معیشت سے واقف بھی ہے یا نہیں۔ جہاں ایک انجینئر وزیر صحت، جاگیر دار وزیر تعلیم ہو، وہاں تعلیم اور معیشت کا کیا حال ہوگا۔ کیا وہ ہمارے مسائل حل کر سکیں گے۔ ان سب کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہم نہیں ہیں؟ اسلام تو امت کے سب سے متقی اور پرہیزگار شخص کو امت کی سربراہی کے لیے منتخب کرنے کی ہدایت کرتا ہے مگر ہم ایسے لوگوں کو ووٹ دیتے ہیں جن پر قتل لوٹ مار، ٹیکس چوری، بجلی اور گیس کی چوری کے مقدمات ہوتے ہیں۔ جب وہ ایوانوں میں جائیں گے تو کیا کریں گے۔ ہمیں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا احتساب ضرور کرنا چاہیے کہ یہ ہمارا آئینی و جمہوری حق ہے لیکن ہمیں خود اپنا احتساب بھی کرنا چاہیے کہ کیا ہم نے اللہ تعالیٰ اور دین کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داری پوری کی؟ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کی ہمت اور سوچ نہ ہو۔

ریحانہ سعیدہ لاہور۔ محترم عمران صاحب! السلام علیکم، اُمید سب موسم بہار سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جیسے سرورق کے خوب صورت منظر کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا بچپن کی پڑھی ہوئی ساری پوئمز اس سرورق کو دیکھ کر یاد آ گئیں اُڑتے پرندے کھلے گلاب اور ہر رنگ اور ہر طرح کے کھلے پھول ہیٹ پہنے دو پیاری بچیاں فروٹ باسکٹ پکڑے ہوئے واہ جی واہ۔ اب ہو جائے کہانیوں کے گلدستے پر تبصرہ محمد حنیف، انجم فاروق، بشیر احمد، اور ان تمام لوگوں کا شکریہ جو ہمارے دکھ میں تسلی کا باعث بنے اور جنہوں نے میری شاعری کو پسند کیا عمر صاحب محبت کے موضوع پر آپ کی سوچ بہت سطحی اور بچگانہ ہے انقلاب جیسے موضوع کے پیچھے بھی محبت کا ہاتھ ہوتا ہے میں فلسفے کی طالبہ ہوں اسی انداز میں شاعری کرتی ہوں گہری سوچ کے ساتھ۔ جیسے ساحل پر کھڑے لوگ سمندر کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتے اسی طرح آپ اس بات کو سمجھ نہیں پائیں گے آپ بس ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار پڑھا کریں ویسے سچ بتائیں کہ آپ تحریک انصاف کے انقلابی بندے تو نہیں محمد اعظم کی مجازی خدا کی دوسری قسط پڑھے بغیر مجھے اندازہ ہے کہ اس کا اختتام کیا ہوگا اللہ نے اسی لیے کنوارے مرد و عورت کی بے راہروی کی سزا کم اور شادی شدہ کی زیادہ رکھی ہے حسن صاحب نے اپنی کہانی سے ثابت کر دیا کہ چیونٹی بھی ہاتھی کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے، ہمت مرداں کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی زین صاحب کی کہانی نے اختتام پر کلائمکس سے کہانی میں جان ڈال دی آتش زیر پا اور قلندر ذات کی تو کیا ہی بات ہے۔ شیطانی گروہ خلیل جبار کی ایوریج کہانی تھی قرآن میں جب واضح ہے کہ اچھے اور نیک مردوں کے لئے اچھی اور نیک لڑکیاں تو پھر جو لڑکیاں اسلامی حدود کی خلاف ورزی کرتی ہیں اُنہیں سزا بھی ضرور ملنی چاہئے ویسے یہ میرا پرسنل پوائنٹ آف ویو ہے ضروری نہیں آپ اس سے متفق ہوں ریاض صاحب کے تو کیا کہنے جناب ہر دفعہ مزے دار سی کہانی لے آتے ہیں کبھی آپ سیاست دانوں اور بیوروکریٹ کو بے نقاب کرنے والی کہانی بھی لکھیں شہناز آپی نے ثابت کر دیا کہ یہ بات ٹھیک کہی جاتی ہے،،، یادِ ماضی عذاب ہے یا رب، چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔ ماضی کی غلطیاں حال اور مستقبل کو تباہ کر سکتی ہیں قسیم صاحبہ کی دو گز زمین کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر، پروفیسر شفق کی کہانی بالکل بے تکی تھی کہ روح ہر چیز دیکھ سکتی تھی اور اپنے وجود کو ہی نہیں دیکھ پائی ریاض صاحب آپ کی فرمائش پر خوشبوئے سخن پر تبصرے کا سوچا اور میری ہی نظم عمران بھائی نے دوبارہ شائع کر دی جناب عمر صاحب کے لیے تنقید کا قدرتی موقع شاعری زیادہ تر روح کی اور ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جو لفظ ہمارے دل کے قریب ہوں وہ شاعری ہم پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے خوشبوئے سخن کے ہر لفظ ہر مصرعے ہر شعر نے کسی نہ کسی کے دل کو ضرور چھوا ہوگا شمیم صاحب کی جگت سنگھ نے اللہ اللہ کر کے نیا موڑ لیا جس سے کہانی اب دوبارہ دلچسپ ہو جائے گی میرا مقصد تبصرے سے کسی کی دل آزاری کرنا نہیں یہ تو آپ لوگوں کی کاوشوں کو نکھارنے کا ذریعہ ہے اللہ سب پہ اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے۔

نسیم سکینہ صدف۔ بہت اچھے اور میرے اپنے بھائی عمران صاحب، بہت سی خوشیاں آپ کی زندگی میں آپ کی منتظر ہوں۔ السلام علیکم! بذریعہ فون تو آپ سے بات کرنے کا شرف حاصل کر چکی ہوں بذریعہ خط پہلی بار مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔ نئے افق کا رجسٹرڈ لفافہ ملا تو بہت خوشی ہوئی پہلی بار اس کو دیکھا خوب صورت ٹائٹل اور اتنا معیاری پرچہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر اس میں ہمارے ٹاپ کلاس ناول نگار امجد جاوید صاحب کا ناول ''قلندر ذات'' نے تو چار چاند لگا دیے۔ شہناز بانو کا ماضی کا بھوت، روح کا انتقام، پروفیسر شفق کھوکھر اور مجازی خدا محمد اعظم خاں کی کہانیاں لاجواب تھیں۔

خوش بوسخن پڑھ کر بھی کافی دیر لفظوں کی خوشبو پھیلی رہی۔ ابھی تک اتنا ہی پڑھ سکی ہوں۔ آئندہ طویل تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ والسلام

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ اپریل کا نئے افق ممی ڈیڈی ٹائٹل کے ہمراہ وقت پر مل گیا۔ یہ آپ کو اتنا بچکانہ سا ٹائٹل بنانے کی کیا سوجھی؟ خیر پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے سو معاف کردیتے ہیں آئندہ خیال رکھیے گا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک میں حاضری دی۔ اب ہم جیسے پینڈو لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے کہ بارش رحمت سے زحمت کیسے بنتی ہے بلکہ بنائی جاتی ہے کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا منہ زور پانی کبھی اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوا ہوتا تو ہمارے خادم اعلیٰ و ادنیٰ کہلانے والے اس کی تباہ کاریاں جان پاتے غریب کی کٹیا ڈوب جانے کے بعد ایک مذمتی بیان جاری کردینا بہت ہی آسان ہے مگر اس قوم کے پیسے پر سیاست کرنے والے ستائیس اٹھائیس امیر خاندان مل کر بھی غریب کی گری ہوئی جھونپڑی دوبارہ تعمیر نہیں کرسکتے۔ انہی خاندانوں کے ہاتھوں پوری قوم یرغمال بنی ہوئی ہے۔ یارب تعالیٰ اس وطن پر رحم فرما، اس کے باشندوں پر رحم فرما۔ اس پاک سرزمین پر سے ناپاک ارادوں والوں کو اٹھالے۔ عمران بھائی نے بھی بہت اچھی بات کی طرف توجہ دلائی۔ عزتیں لٹ رہی ہیں۔ انصاف دولت کے پلڑے میں رکھ کر تولا جارہا ہے روٹی مہنگی اور موت سستی ہے۔ مگر میلے اور فیسٹیول منانا زیادہ ضروری ہے۔ تھر اور چولستان کا حلق سوکھ کر کانٹا ہوجائے لیکن ہم نے نام نہاد ثقافت پر کروڑوں روپے خرچ کرنا ہے۔ یہ انسانی جانوں سے زیادہ اہم ہے کاش کہ میں بلاول ہاؤس اور تخت لاہور کی دیواروں پر یہ جملہ لکھ سکتا۔ تم کیا جانو اے امیرو، روٹی بندہ کھا جاتی ہے۔ دوسرے ساتھیوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ ریاض بٹ صاحب محفل میں دکھائی نہیں دیے لیکن ان کی کہانی نے کمی دور کردی۔ ساحل دعا بخاری، ہم نے عورت کو ڈرامہ باز نہیں کہا تھا۔ ذرا غور سے دوبارہ پڑھیے گا۔ پھر بھی اگر آپ نے کچھ اور سمجھا اور آپ کو ٹھیس لگی تو میری طرف سے معذرت قبول فرمایئے گا۔ ناول آتش زیرپا شامل تھا۔ مگر مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہ یعقوب بھٹی صاحب نے نہیں لکھا۔ کسی اور سے لکھوایا گیا ہے۔ انداز تحریر میں فرق تھا۔ چونکہ کہانی میں کوئی جھول نہیں تھا اس لیے یہ بات زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ جگت سنگھ تبدیلیوں کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس لیے یہ قسط بھرپور رہی۔ قلندر ذات ابھی پڑھا نہیں سو تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ دیگر کہانیوں میں ابتدائی صفحات پر مجازی خدا انتہائی نازک و اہم موضوع پر کاوش ہے۔ مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی عمدگی سے ہمارے گلی محلے کی منظر کشی کی ہے۔ اگلے حصے کا انتظار رہے۔ مغرب سے انتخاب ہمیشہ اچھا ہوتا ہے لیکن اس بار تقریباً ساری منتخب شدہ کہانیوں میں طوالت کچھ زیادہ تھی۔ اس چیز سے گریز کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ مغربی ادب سے ایسی کہانیوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو مختصر اور چونکا دینے والے انجام سے مزین ہوں۔ متفرق کہانیوں میں ماضی کا بھوت' شہناز بانو کی ایک نارمل سی کہانی تھی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پراسرار کہانیوں کے ڈھنڈورے نے ان جیسے مصنفین کو بھی اس لائن پر لگا دیا ہے۔ بہرحال، ہم کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ خفیہ توپوں کا رخ ہماری طرف ہوجائے گا لوگ پہلے ہی شک کررہے ہیں کہ ہمیں کسی کی سفارش پر چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ دراصل سچ ہضم کرنے میں پاکستانی قوم کا ہاضمہ ذرا کمزور رہی ہے۔ اب بڑھتے ہیں خوش بوسخن کی طرف۔ عمر اسرار بھائی

یار آپ پلیز امریکن بادام کھایا کرو، آپ کی یادداشت کا مسئلہ زیادہ ہی پیچیدہ ہوتا جارہا ہے ہماری غزلیں تین ماہ سے آپ کی جیب میں پڑی ہوئی ہیں مگر چھپ نہیں رہیں اور ادھر ریحانہ سعیدہ کی پچھلے ماہ غزل پھر سے شائع کردی گئی۔ اس طرح پہلے بھی کئی دفعہ ہوچکا ہے۔ خدا کے لیے جناب یہ نشر مکرر والا کلیہ الیکٹرانک میڈیا پر ہی چھتا ہے آپ پرنٹ میڈیا پر اس طرح کے تجربے نہ کریں۔ دیگر غزلیں ٹھیک تھیں۔ اللہ تمام بیماروں کو شفا عطا فرمائے۔ آخر میں ساتھیوں سے گزارش ہے کہ میری والدہ اور والد کے لیے خصوصی دعا کریں اللہ ان کو صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔ آپ کی دعاؤں کا صلہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے مل جائے گا، ان شاء اللہ۔ والسلام

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ ماہ اپریل کا نئے افق خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل میں بچے خزاں میں گرتے پتوں سے محظوظ ہورہے ہیں۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے پانی کی اہمیت نکاسی آب میں بے قاعدگیوں اور باقی امور میں کوتاہیوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے والی قوم ہیں۔ بس اللہ رب العزت ہمیں اپنے کرم سے چلنے پھرنے کے لائق کیے ہوئے ہے ورنہ ہم تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑیاں مارنے والے لوگ ہیں۔ عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث بیان کی ہے اور ابتدائیہ میں تو آپ نے صاحب اقتدار لوگوں کے منہ پر اتنے زور کا طمانچہ مارا ہے کہ ذرا سا شعور بھی رکھتے ہوں تو کانپ گئے ہوں گے۔ اقرا میں محترم طاہر قریشی صاحب ہمارے ایمان کو تازہ کرتی احادیث لے کر تشریف لائے ہیں۔ گفتگو میں کرسی صدارت پر براجمان محترم حنیف قادری صاحب نہایت ہی اچھے پاکیزہ خیالات کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ تخریب کاری اور دہشت گردی کو جہاد کا نام دے کر پیارے اور مقدس دین اسلام کو بدنام کیا جارہا ہے۔ اسلام تو سراسر امن و آشتی اور بھائی چارے کا دین ہے جو ایثار و قربانی کا دین ہے۔ اس میں وہ قوتیں ملوث ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان، قیام پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جو کرکٹ کے میدان میں ہماری برتری کو تسلیم نہیں کرسکتی ان کے آگے ہم بچھ بچھ جاتے ہیں۔ خدا ہمیں دین اسلام کی حقانیت پہچاننے کی سمجھ اور توفیق عطا فرمائے، آمین۔ جناب اسلم جاوید صاحب حسب عادت مختصر سے خط کے ساتھ تشریف لائے انہوں نے مفصل خط لکھنا تھا مگر ناگزیر وجوہات کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکے کاش ہم ان کا تفصیلی خط پڑھ سکیں۔ محترم عمر فاروق ارشد صاحب ایک لمبے خط کے ساتھ تشریف لائے اپنی گفتگو میں میری غیر حاضری اور غزل میگزین میں شائع نہ ہونا عجیب لگا بھائی عمر فاروق یہ تو ہم جناب عمران احمد صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا میں تو اپنا کلام ہر ماہ روانہ کرتا ہوں۔ جناب انجم فاروق ساحلی صاحب ایک اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں اس بار سردیوں میں بہت سے لوگ علیل ہوئے۔ رب ذوالجلال سب علیل ساتھیوں کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین۔ جناب بشیر احمد بھٹی صاحب ایک اچھے خط کے ساتھ تشریف لائے۔ بھٹی صاحب خونی رشتوں کا بچھڑنا اور اس کا غم عمر بھر کا روگ ہوتا ہے۔ مگر مشیت ایزدی کے آگے ہم خاکی بہت مجبور ہیں۔ پیارے بھائی ساحل دعا بخاری گفتگو میں مختصر نویسی کا مقابلہ جیت گئے مبارک ہو بھائی، آخر میں اچھے بھائی سید عبداللہ شاہد اپنے مخصوص انداز کے خط کے ساتھ تشریف لائے اور محفل گفتگو کو رونق بخشی غیر حاضر ساتھیوں کو واپس تشریف

اان کی استدعا۔ خداوند کریم محمد بخش صابر لنگاہ صاحب کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے ان کے بچوں کو چاہیے کہ وہ محفل میں مسلسل شرکت فرمایا کریں۔ اس سے جناب محمد بخش صابر صاحب کی صحت کا پتا چلتا رہا کرے گا۔ جریدہ کے باقی مندرجات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں جناب ریاض بٹ صاحب کی تصویر کا راز بہت پسند آئی۔ محترمہ شہناز بانو صاحب کی کہانی ''ماضی کا بھوت'' خوب رہی۔ اللہ کریم ہمارے اس پیارے جریدہ کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔ آداب! امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب واہلخانہ بخیر وعافیت ہوں گے اپریل کا نئے افق خوشنما رنگوں سے جگمگاتے ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ بڑے قریشی صاحب نے آبی مسائل کا بھرپور جائزہ قلمبند کیا۔ بھائی عمران احمد نے حکومت پنجاب کی فضول خرچیوں اور سندھ کی قحط سالی پر عمدہ پیرائے میں اداریہ رقم کیا۔ غربت اور افلاس سے ہونے والے المناک واقعات پر بھی روشنی ڈالی۔ خطوط کی محفل خوب ہری بھری تھی باجی شہناز بانو، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب اور لنگاہ صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔ ریاض حسین قمر، بشیر احمد بھٹی، سید عبداللہ شاہد نے تذکرہ قلمبند کیا میں ان کا مشکور وممنون ہوں۔ کہانیوں میں احساس کمتری، ہمت مرداں، آتش زیرپا، جگت سنگھ، تصویر کا راز، ماضی کا بھوت اچھی تحریریں تھیں۔ اس مرتبہ اقرا میں طاہر قریشی کی مرتب کردہ گفتگو انسانی زندگی جسم اور مرکز قلب (دل) کے حوالے سے بڑی متاثر کن تھی۔ اقتباسات بھی دانش وخرد کے حوالے سے قابل تعریف تھے۔ خوش بوسخن میں اس مرتبہ بھی ریحانہ سعیدہ کا انتخاب خوب صورت ترین تھا۔ محمد حنیف قادری اور قدیر رانا صاحب کا کلام بھی خوب تھا۔ ذوق آگہی کی تحریریں بھی دلچسپ تھیں۔ مجازی خدا بھی اچھی تحریر معلوم ہوتی ہے مگر ابھی زیر مطالعہ ہے۔ اگر سال میں ایک مرتبہ بھی نئے افق کا خاص نمبر پڑھنے کے لیے میسر آ جائے تو مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جائے۔ فیصلے کے بعد تازہ تخلیق بامراد قاتل روانہ کر دی گئی ہے۔ نئے افق کی بنیاد چونکہ ابن صفی، مشتاق احمد قریشی اور مدیر کے فرائض میں اظہر کلیم نے وسعت نظر کو مدنظر رکھا چنانچہ نئے افق کے دامن میں کہانیوں کی جدت کے موتی بکھرے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹی بڑی رنگین شعاعیں جو رنگ رنگ کے فن پاروں سے نکلتی رہی ہیں وہ آج بھی تابناک ہیں آنچل کی روایتی شان بھی برقرار ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ اپریل 2014ء کا شمارہ اس بار کافی انتظار کے بعد بے قرار اور مضطرب نگاہوں کے سامنے آیا۔ خیر دیر آید درست آید کے مصداق پرچہ لے کر گھر آئے اور بے تابی سے فہرست پر نظر دوڑائی۔ اس بار بھی آپ لوگوں کی مہربانی کی وجہ سے میری کہانی موجود ہے۔ بڑی مہربانی، اس کے بعد دستک تک پہنچے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی بارش رحمت سے زحمت پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارے ارباب اختیار کیسی کیسی کوتاہیاں اور چشم پوشی کرتے رہے ہیں۔ ڈیم بنانے کے معاملات کو سیاست کی نذر کرتے رہے ہیں۔ ضروریات آبادی کے لحاظ سے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن ہنوز دلی دور است والا معاملہ ہے۔ ہمارا پڑوسی ہمارا پانی بھی ہڑپ کرنے کے لیے ڈیم پر ڈیم بنا رہا ہے۔ خیر ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔ بوجھل دل کے لیے جونہی گفتگو میں داخل ہوئے تو اپنا خط نہ پا کر دل مزید بوجھل ہو گیا اور یہ یقین کر لینا پڑا کہ ہمارا خط آپ تک پہنچا ہی نہیں کیونکہ ذوق آگہی میں بھی چھٹی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ محفل میں سب سے پہلا خط محمد

حنیف قادری صاحب کا ہے۔ محترم آپ نے بڑے خوب صورت اور مدلل انداز میں اپنا مدعا بیان کیا ہے ویل ڈن۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ریاض حسین قمر صاحب آپ کا خط بھی شاندار ہے اور تبصرہ بھی جاندار ہے۔ میرا خط اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ ہم آپ کی شاعری کے دیوانے ہیں اس معاملے میں میرا شوق بہت ہے اور اچھا شعر جہاں نظر آتا ہے میں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا ہوں۔ آپ کے کافی اشعار میری ڈائری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ محمد اسلم جاوید بھائی آپ کی حاضری بھی خوب ہے۔ اگلا خط ہے عمر فاروق ارشد بھائی کا میری کہانی پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ ارے بھائی ہر ماہ ایک کہانی ہی بہت ہے یہ بھی رسالے والوں کی عنایت ہے کہ وہ میری اتنی پذیرائی کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر قارئین کی حوصلہ افزائی میرے اندر لکھنے کی جوت جگائے ہوئے ہے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب آپ نے بالکل سچ کہا ہے کہ ہم نے درمیان میں مختلف دیواریں کھڑی کر کے دوریاں پیدا کی ہوئی ہیں۔ ہمیں صرف یہ سوچنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں۔ میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ بشیر احمد بھٹی صاحب آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے اس ناچیز کو اچھے الفاظ میں یاد کیا۔ خوش رہو اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ ساحل دعا بخاری بھائی آپ کی حوصلہ افزائی تو ہو گئی۔ اب اگلی بار تفصیل سے خط لکھیے گا۔ سید عبداللہ شاہد بھائی آپ عمران بھائی کی بات پر عمل کریں اور اپنا ادھورا ناول مکمل کر دیں تاکہ شائع ہو سکے۔ بہرحال آپ کے خطوط محفل کی جان ہوتے ہیں۔ آپ محفل سے منہ نہ موڑیے گا یہ میری درخواست ہے۔ جونہی محفل ختم ہوئی سامنے اگلے ہی صفحے پر طاہر قریشی صاحب کی اقرا ہماری منتظر تھی۔ طاہر قریشی صاحب آپ کی تحریریں دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ محفل خوشبوسخن، عمر اسرار صاحب جس محنت اور عرق ریزی سے سجاتے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ بہرحال اس بار تمام انتخاب اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔ ذوق آگہی میں سید اعجاز علی کراچی، غلام عباس خان راجن پور، عبدالصبور خان کوہاٹ اور سیدہ فوزیہ رضوی جھنگ صدر کا انتخاب خوب صورت ہے اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف مغرب سے انتخاب میں احساس کمتری مجھے زیادہ اچھی لگی۔ باقی دونوں کہانیاں بھی ٹھیک ہی ہیں۔ سلسلے وار ناول ابھی زیر مطالعہ ہیں متفرق کہانیاں مجازی خدا، شیطانی گروہ، ماضی کا بھوت، دو گز زمین اور روح کا انتقام سب اچھی ہیں۔ آخر میں دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے کہوں گا کہ تمام رسالہ قابل تعریف ہے اور سب سے آخر میں تمام غیر حاضر بہنوں اور بھائیوں سے التماس کروں گا کہ محفل میں حاضر ہوں ان کے بغیر محفل سونی سونی ہے۔ والسلام

شجاع جعفری...... اکوال۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور نئے افق کا تمام اسٹاف اور قارئین بخیر وعافیت ہوں گے سرورق ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے بعد دستک کو پڑھ کر علم میں اضافہ کیا۔ گفتگو کے شروع والی حدیث بہت اچھی تھی۔ اول میں حنیف قادری سے ملاقات ہوئی آپ کی تحریر بہت پاورفل تھی۔ اس کے بعد ریاض حسین قمر صاحب سے ملاقات ہوئی جناب کیا حال چال ہیں۔ آپ کی گفتگو اچھی تھی اس کے بعد جاوید اسلم سے ملاقات ہوئی سلام جی۔ اس کے بعد عمر فاروق ارشد، انجم فاروق ساحلی، بشیر احمد بھٹی، ساحل دعا بخاری، سید عبداللہ شاہد سے ملاقات ہوئی۔ آپ تمام کی تحریریں اچھی تھیں۔ اقرا اور احادیث شریف پڑھ کر روح کو تسکین ملی۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خوش بوسخن میں تمام شعرا کا کلام بیسٹ

تھا۔ بالخصوص ریحانہ سعیدہ، محمد حنیف قادری کا۔ ذوق آ گہی بہت اچھا جارہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے تمام قارئین کو سلام وآداب، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ملک عزیز کو دشمن کے ناپاک ارادے سے محفوظ رکھے، آمین۔

ادیب سمیع چمن...... حیدر آباد۔ محترم عمران احمد صاحب خلوص بیکراں، جگ جگ جیو، خدا آپ کو تمام اہل ادارہ نئے افق اور تمام افق پڑھنے والے باسیوں پر اپنا کرم رحم اور جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت فرمائے، آمین۔ ماہ اپریل کا تازہ اور گرما گرم نئے افق کا شمارہ ملا اف خدایا کیا جادوگر شمارہ ہے۔ کچھ دیر تو سرورق کی دلکشی اور رعنائیوں میں ہی کھویا رہ گیا۔ آپ نے اعزازی شمارہ بھیج کر مجھ ناچیز ادنیٰ قلم کار کی جو عزت افزائی فرمائی ہے دل سے ان گنت دعائیں نکلی ہیں تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے دن پچاس برس۔ یہ خط شاید آپ کو بچکانہ شرارتی سا لگے گا تو جناب آپ شکایتی فکر انگیز اور تفکرات احساسات سے لبریز خطوط پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہوں گے بعض اوقات تو گھبرا جاتے ہوں گے تو بھئی ہم نے سوچا کہ چلیں اسی طرح سے خط لکھتے ہیں جس طرح ہم بچوں کے رسالوں اور اخبارات کے چلڈرن صفحات کے انچارج صاحبان کو لکھتے ہیں کچھ تو ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلے گی نا۔ تمام تر رسالہ ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ گفتگو میں بہت کم خط تھے۔ سب سے پہلے محترم مشتاق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اللہ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے طویل عمر صحت تندرستی اور بار بار حج بیت اللہ کی توفیق عطا فرمائے دین کی جس طرح خدمت اور قومی شعور کو جگاتے نظر آتے ہیں دل سے احترام عقیدت بھری دعائیں نکلتی ہیں۔ ویسے حکایت سعدی بھی خوب سناتے اور قوم کو جگاتے نظر آتے ہیں۔ آپ کے لیے ہزار دعائیں تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات کہوں۔ رسالے کی قیمت صرف چالیس روپے اتنی محنت، اتنی خوب صورتی مارکیٹ میں کوئی رسالہ ساٹھ یا پچاس سے کم نہیں ہے۔ ادارہ اسی طرح خسارہ میں جاسکتا ہے میرا مشورہ ہے کم از کم پچاس روپے قیمت کردیں۔ مہنگائی نے پرنٹنگ اور کاغذ کا جو ایٹم بم گرایا ہوا ہے اس کا ہی احساس کریں۔ محمد اسلم جاوید صاحب، عمر فاروق ارشد، انجم فاروق ساحلی، بشیر احمد بھٹی، ساحل دعا بخاری، سید عبداللہ شاہد، سب دوستوں کو میرا اسلام میری ان پروانوں سے گزارش ہے کہ میں ان سب سے پریم بھری دوستی چاہتا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے اور خلوص چاہت کا ثبوت دیں گے۔ اس کے علاوہ کسی دوست کے پاس نئے افق میں شائع ہونے والے اے حمید صاحب کے شمارہ جات ہوں تو مجھے ڈاک سے ایک ایک عدد کر کے بک پوسٹ ارسال کردیں۔ جواب میں ان سب کو اپنا رسالہ "بچوں کا دوست" آنے والا نیا رسالہ بچوں کا زمانہ اعزازی کاپی ارسال کرتا رہوں گا۔ محفل سخن بہت اچھا سلسلہ ہے بس پروف ریڈنگ کا خیال کرلیا کریں۔ آپ جس طرح سے محنت کرتے ہیں اور رسالہ مارکیٹ میں لاتے ہیں اللہ آپ کو ہمت و طاقت عطا فرمائے۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

عداوت اور محبت صرف اللہ کے لیے ہو

ترجمہ: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھی اور اللہ ہی کے لیے دیا (جس کو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے لیے منع کیا اور نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔"

ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس لیے مسلمان کی کوشش اپنے ہر قول و فعل سے یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کام کرنے کی وجہ سے ایمان کامل ہوتا ہے۔ یعنی جس شخص نے اپنی حرکات و سکنات، اپنے جذبات اور احساسات اس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کردیے کہ جس سے تعلق جوڑتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہی جوڑتا ہے اور جس سے تعلقات توڑتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے توڑتا ہے۔ جس کو کچھ دیتا ہے اللہ ہی کے لیے دیتا ہے اور جس کے دینے سے ہاتھ روکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے۔

جس شخص کی سوچ اور تفکرات اس قدر رضائے الٰہی کے تابع ہوں، اسے اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق اور کامل ایمان نصیب ہوتا ہے۔ عداوت یعنی دشمنی اور محبت اللہ ہی کے لیے کرنا ایسا عمل ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"جو لوگ میری رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، ان کے لیے میری محبت واجب ہوجاتی ہے۔"

اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔ "جس بندے نے بھی اللہ کے لیے کسی سے محبت کی، اس نے دراصل اپنے رب کریم کی عظمت اور توقیر کی۔" کیوں کہ جب عداوت اور محبت اللہ کی رضا کے لیے ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی قدر و منزلت کا اندازہ، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوسکتا ہے۔

وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔

ترجمہ: "بندوں کے اعمال میں سے اللہ کو سب سے زیادہ پسند وہ محبت اور عداوت ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہو۔"

اللہ کی رضا کے لیے مسلمان بھائی سے محبت کرنا اور رضائے الٰہی کے لیے اس سے ملاقات کرنا، کتنا عظیم عمل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اندازہ ہوسکتا ہے فرماتے ہیں کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

"ایک شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کے لیے چلا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ اس کے راستے میں منتظر بنا کر بٹھا دیا گیا۔ جب وہ شخص اس جگہ سے گزرا تو فرشتے نے پوچھا۔ "کہاں کا ارادہ ہے؟" اس شخص نے جواب دیا۔ "میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ملاقات کے لیے جارہا ہوں۔" فرشتے نے کہا۔ "کیا تمہارا اس پر کوئی احسان ہے یا کوئی اور حق ہے جس کی خاطر اس کے پاس جارہے ہو؟" اس شخص نے جواب دیا۔ "مجھے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اس سے محبت ہے اس لیے اس سے ملاقات کے لیے جارہا ہوں۔" فرشتے نے کہا کہ۔ "مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے

پاس بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ تعالیٰ کے لیے اس شخص سے محبت کرتے ہو۔“

آج معاشرے میں محبت اور عداوت کے لیے دینوی مفادات کو بنیاد بنالیا گیا۔ چنانچہ کسی سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس کی عزت اور توقیر معاشرے کی نگاہ میں ہوتی ہے اور جس کسی سے فائدہ نہ پہنچے اسے عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس سے نفرت کی جاتی ہے۔

اس دنیا میں رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے محبت اور تعلق کا ہونا تو عام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کی مالی مدد کرتا ہے اسے ہدیے اور تحفے دیتا ہے‘ تو اس محسن کی محبت بھی ایک فطری بات ہے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ان تمام تعلقات سے قطع نظر کرتے ہوئے محبت اور عداوت اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے۔

آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں واضح ہوچکا کہ جب ہماری محبت اور نفرت کا مدار ”رضائے الٰہی“ پر ہوگا‘ تو اس سے ایمان کامل ہوگا‘ دنیا اور آخرت میں نجات اور فلاح نصیب ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور محبت حاصل ہوگی۔

اور جس سے اللہ محبت کرے گا اس سے تمام مخلوق محبت کرے گی۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

”جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرماتا ہے تو حضرت جبریل علیہ السّلام سے ارشاد ہوتا ہے کہ ”مجھے فلاں شخص سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔“ اس پر حضرت جبریل علیہ السّلام خود بھی اس شخص سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں اعلان کردیتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے تم سب اس سے محبت کرو۔“ پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں اور زمین والوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی سے محبت کرنے کا کتنا بڑا انعام ملتا ہے کہ سب آسمان اور زمین والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ والوں کی طرف‘ دل خود بخود کھنچتا ہے۔ کسی اندرونی جذبے کے تحت ان سے محبت اور الفت جوش مارنے لگتی ہے۔

بےلوث محبت کی وجہ سے دوسروں کے دل میں بھی عزت اور توقیر بڑھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینوی اور اخروی انعامات ملتے ہیں اور آخرت میں بلند و بالا درجات نصیب ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے۔

ترجمہ: ”کہاں ہیں میرے وہ بندے جو میری عظمت اور میرے جلال کی وجہ سے آپس میں محبت کرتے تھے؟ آج جب کہ میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں‘ میں اپنے ان بندوں کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا۔“

بےلوث محبت کرنے والوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ترجمہ: ”پس اللہ کی قسم ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے اور وہ لوگ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسان جس وقت قیامت کے دن خوف وہراس کا شکار ہوں گے اللہ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کرنے والے ”بےخوف اور مطمئن“ ہوں گے۔“

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی باہمی محبت اور عداوت اپنی رضا کی خاطر نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

بشکریہ: ”درس حدیث“ مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفیؒ
نائب مہتمم واستاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

مجازی خدا

محمد اعظم خان

گذشتہ صدی تبدیلی اور ترقی کے حوالے سے یاد کی جاتی ہے‘ زمانہ تبدیل ہوا اس کے ساتھ مزاج‘ انسانی رویے‘ تمام ریت و رواج تبدیل ہوئے‘ ان تبدیلوں نے سب سے زیادہ مغربی معاشرے کو متاثر کیا‘ جہاں خاندانی نظام تباہ بلکہ ختم ہو کر رہ گیا۔ جہاں حقوق نسواں یا عورت کی آزادی کے نام پر خواتین کو بازاری جنس میں تبدیل کرکے رکھ دیا گیا ہے‘ ایک ایسی بازاری جنس جس کا مقصد صرف مردوں کا بستر گرم کرکے اپنے لیے فوائد حاصل کرنا ہے۔ وہاں جسم کی نمائش کو آزادیِ نسواں کا نام دے دیا گیا ہے۔ باپ‘ بیٹی ماں‘ بیٹے غرض تمام مقدس رشتوں کا تقدس ختم ہوچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے یورپ میں پیدا ہونے والے ساٹھ فیصد سے زائد بچوں کو ان کے باپ کا نام معلوم نہیں‘ نہ ہی ان کی ماؤں کو معلوم ہے کہ ان کا اصل باپ کون ہے؟ آج ہمارا معاشرہ بھی اسلامی اقدار سے دور ہوکر مغرب کا اثر قبول کر رہا ہے۔ خاص طور پر ہماری خواتین‘ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ مقام دیا‘ یعنی انسانیت کے لیے سب سے بڑا انعام جنت کو اس کے قدموں تلے رکھا ہے‘ یہ سادہ لوح خواتین مغربی پروپیگنڈے سے زیادہ متاثر نظر آرہی ہیں اور نام نہاد آزادی کے نام پر جو غلطیاں کر رہی ہیں‘ وہ پوری قوم کو تباہی کے گہرے غار تک لے جائے گی۔

ایک شادی شدہ خاتون کا قصہ‘ اس نے مردانہ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ جب بھی ملتا‘ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوتی تھی‘ مگر اس روز اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے‘ اس کی حالت دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگئی تھی۔

”آپ اس قدر پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ سب خیر تو ہے ناں؟“ اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر میں نے سوال کیا تھا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا تھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ میری پریشانی ابھی تک برقرار تھی۔

”لگتا ہے ہمارے پیار کو کسی کی نظر لگ گئی۔“

”جنید! خدا کے لیے مجھ سے پہیلیاں مت بجھواؤ۔“

”انہیں دیکھ لو۔“ جنید نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے جلدی سے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں بہت سی تصویریں تھیں‘ پہلی ہی تصویر پر میری نظر پڑی تو میں کانپ کر رہ گئی ہر تصویر کے ساتھ میری کپکپی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا‘ میں نے ابھی چند تصاویر ہی دیکھی تھیں کہ میری ہمت جواب دے گئی‘ ان تصاویر میں میرے جسم کے بہت سے حصے دکھائی دے رہے تھے میں تصویریں دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ وہ سب اس وقت لی گئی تھیں‘ جب میں کسی ٹرائی روم میں ڈریس خریدنے سے پہلے انہیں پہن کر چیک کرنے گئی تھی‘ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ میں تمام تصاویر دیکھ پاتی‘ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا‘ ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے‘ ایک ہی جھٹکے میں سب خواب چکنا چور ہوتے دکھائی دینے لگے تھے‘ قریب تھا کہ میں چکرا کر وہیں گر پڑتی‘ جنید نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تمام تصاویر لفافے میں ڈال کر جنید کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہی بات تو مجھے پریشان کررہی ہے کہ یہ سب کیسے ہوگیا اور اس سے بھی بڑھ کر پریشانی کی بات یہ ہے کہ ان تصویروں کی آڑ میں وہ ہمیں بلیک میل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔" اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیں بوتیک کے مالکان سے بات کرنی چاہیے' انہوں نے یہ تصویریں کھینچ کیسے لیں؟"

"کس کس کے پاس جائیں گے؟"

"لیکن اب کیا ہوگا؟"

"یہی سوچ کر تو میں رات بھر سو نہیں پایا ہوں۔"

"وہ کہتے کیا ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں وہ سوچ کر بھی کانپ اٹھتا ہوں۔"

"کچھ پتہ تو چلے۔"

"وہ تصویروں کے بدلے میں آپ کی زندگی کے کچھ پل مانگ رہے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں سمجھ سکتا ہوں' ایک باعزت لڑکی کے لیے یہ کسی بھی صورت ممکن نہیں۔ مگر خود کو رسوائی سے بچانے کے لیے ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔"

"آپ ہوش میں تو ہیں' جانتے ہیں کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بات روپے پیسے کی ہوتی تو میں آپ کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا ڈالتا اور اُف تک نہ کرتا' لیکن یہاں تو معاملہ ہی اور ہے۔ مگر پھر بھی میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ ہوجانے کے بعد بھی میرے دل میں آپ کے لیے جو پیار اور احترام ہے اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔" جنید نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد گردن جھکا دی تھی۔

ہم دونوں ہی خاموش بیٹھے تھے' پیار مجھ سے بہت بڑی قربانی مانگ رہا تھا' میں کسی صورت جنید کو کھونا نہیں چاہتی تھی' اس لیے اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ بھی جنید کا حکم جان کر قبول کرلیا تھا اور میں نے اپنی محبت پانے کے لیے گردن جھکا دی تھی۔ جس شخص کے پاس مجھے بھیجا گیا تھا' اس نے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے بعد کچھ نوٹ میرے پرس میں ڈال دیے تھے' میں کمرے سے باہر نکلی تو میرے پرس میں پڑے ہوئے نوٹوں کی حدت مجھے جلا رہی تھی' میرا بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا' مجھے ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے ان نوٹوں کو آگ پکڑ لے گی' جو میرے بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی' میں نے جلدی سے نوٹ بیگ سے نکالے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا میں اچھال دیئے' جیسے جیسے ہوا ان نوٹوں کے ٹکڑوں کو اڑا کر مجھ سے دور لے جارہی تھی' میرا بدن برف کی مانند ٹھنڈا ہوتا جارہا تھا' مجھے خود سے ہی گھن آنے لگی تھی' یوں محسوس ہورہا تھا' جیسے میں جہاں جہاں سے گزرتی تھی' وہیں تعفن پھیلتا جارہا تھا۔

جنید کا پیار پانے کے لیے میں تمام حدیں پار کر گئی تھی' میں نے بلا سوچے سمجھے عشق کے جنون میں گرفتار ہوکر اپنی عصمت بھی داؤ پر لگا بیٹھی تھی' لیکن میں اس بات پر حیران تھی کہ لوگ عزت کی خاطر اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتے ہیں' جبکہ جنید نے مجھے خود ان بھیڑیوں کے حوالے کردیا تھا' مگر اتنا کچھ ہوجانے کے باوجود میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اب مجھے جنید سے دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر

پائے گی۔

اگلے روز جنید ملا تو اس کے لبوں پر ایک نئی کہانی تھی' اس کا کہنا تھا کہ جب وہ اس شخص کے پاس گئی تھی تو بلیک میل کرنے والوں نے ان لمحوں کو کیمرے میں قید کرلیا تھا' اپنی بات کی تصدیق کے طور پر اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا' اس لفافے میں میری انتہائی قابل اعتراض تصاویر تھیں' تصویریں دیکھ کر میں رونے لگی تھی' روتے ہوئے میری نگاہ جنید کے چہرے پر پڑی تھی' جہاں مجھے کسی قسم کی پریشانی یا دکھ کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔

"لگتا ہے ہم کچھ غلط لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو وہ یہ تصویریں نہ صرف آپ کے گھر بلکہ محلے کے ہر گھر میں پہنچادیں گے۔" جنید نے با آسانی اتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی۔

میں جنید کی بات سن کر الجھ کر رہ گئی تھی' میں نے جس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کے لیے جنید کے کہنے پر اتنا کچھ کیا تھا' وہ پہلے سے بھی بڑا مصیبتوں کا پہاڑ بن کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی' میں اس بات پر حیران تھی کہ وہ کس قسم کا مرد ہے' ان لوگوں کا سامنا کرنے کی بجائے مجھے بھی گھٹنے ٹیکنے کا مشورہ دے رہا تھا' لیکن اب میں کسی بھی طرح اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی' میرے انکار پر وہ منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

"زارا مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ان لوگوں سے پنگا لے سکوں' سمجھداری اسی میں ہے کہ ان کی بات مان لی جائے۔" جنید نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"مگر میں کب تک یوں لٹتی رہوں گی اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پھر وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پلیز ایک بار' صرف ایک بار' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد کسی کو بھی اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ میلی آنکھ سے بھی آپ کی طرف دیکھ سکے۔"

میں جنید کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر عجیب کشمکش کا شکار ہوگئی تھی' خدا نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا تھا' میں اس مقام پر آکھڑی ہوئی تھی' جہاں سے فرار کی بھی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی' اس لیے ایک بار پھر بزدلوں کی طرح ہتھیار ڈال دیے تھے۔

میں سمجھ رہی تھی کہ اتنا کچھ لٹا دینے کے بعد' میں جنید کا پیار پانے میں کامیاب ہوجاؤں گی' مگر پیار تو ایک طرف' میں اس کی شکل تک دیکھنے کو ترس گئی تھی' اب وہ مجھ سے فون پر بات کرنے سے بھی کترانے لگا تھا' پہلے پہل تو میں اسے فون کرتی تو وہ اٹینڈ نہیں کیا کرتا تھا' پھر کچھ روز بعد اس نے اپنا نمبر ہی بدل لیا تھا' میں نے کئی بار چاہا کہ جنید کے بارے میں باس سے بات کروں' مگر ایسا کرنے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہیں تھا' جنید نے پہلی بار باس کو اپنا انکل کہہ کر متعارف کروایا تھا' مگر حقیقت یہ تھی کہ جس روز میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی' میں نے اس روز اسے پہلی اور آخری بار آفس میں باس کے پاس دیکھا تھا۔

وہ مجھے طوفانوں کے حوالے کرکے خود کہیں غائب ہوگیا تھا' میں ایسے کیچڑ میں گر گئی تھی' جہاں سے جس قدر نکلنے کی کوشش کرتی تھی' اتنا ہی کسی گہری دلدل میں دھنستی چلی جاتی تھی' میں روز جینے' روز مرنے لگی تھی' میں جان گئی تھی کہ میں جسے پیار سمجھتی تھی' وہ محض دھوکا' فریب اور ڈھونگ تھا' عشق کے لبادے میں لپٹا ہوا ایک ایسا سنہرا جال تھا' جس میں قید ہونے

کے لیے میں بخوشی تیار ہوگئی تھی لیکن یہ اس جال کی خوب صورتی کا کمال تھا کہ میری جگہ کوئی انتہائی مضبوط کردار کی لڑکی بھی ہوتی تو شاید وہ بھی خود کو اس جال میں قید ہونے سے بچا نہ پاتی۔

مجھے اس خوب صورتی سے سونے کے پنجرے میں قید کیا گیا تھا کہ مجھے کچھ اور دکھائی دینا ہی بند ہو گیا تھا یوں لگتا تھا' جیسے دولت کی چکا چوند نے مجھے اندھا کر ڈالا تھا' میرا جرم صرف اتنا تھا کہ میں غریب گھرانے کی ایک عام سی لڑکی ہو کر بڑے گھر کی بہو بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی' لیکن میرا جرم اتنا بڑا نہیں تھا' جتنی بڑی سزا مجھے مل رہی تھی۔

محبت میرے لیے گالی بن کر رہ گئی تھی' پیار' محبت' عشق مجھے دھوکا لگنے لگے تھے' مجھے محبت کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی' اس دن کا سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے' جب میں اس کے بچھائے ہوئے چالبازیوں اور مکر وفریب کے جال کو محبت سمجھ کر اس میں پھنس گئی تھی۔ اب وقت نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے' جہاں سے واپسی کے راستے تو بند تھے ہی' آگے بڑھنا بھی ممکن نہیں رہا۔

......☆☆☆......

زارا نے اپنی بات مکمل کی تو اس کے ساتھ ساتھ فریال کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے' فریال نے کسی نہ کسی طرح اپنے آنسوؤں پر قابو پالیا تھا' مگر زارا کو جان بوجھ کر رونے سے نہیں روکا تھا تاکہ کسی طرح اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

''حوصلہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' فریال نے زارا کا سر اپنے سینے پر رکھ کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

''میرا دل چاہتا ہے۔ میں کسی گاڑی کے نیچے آ کر اپنی جان دے دوں' مگر والدین اور بہن بھائیوں کی بدنامی کا خوف میرے ارادوں کو کمزور کر ڈالتا ہے' میں جس کرب سے گزر رہی ہوں' وہ صرف میں جانتی ہوں یا میرا خدا' فریال! میری بے بسی تو دیکھو کہ میں دل کی بات زبان پر بھی نہیں لا سکتی' اس لیے اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہوں۔'' بات کرتے ہوئے زارا پھر سے رونے لگی تھی۔

''ایسا سوچنا بھی مت۔ خودکشی کی اجازت ہمارا مذہب دیتا ہے اور نہ سماج' اور پھر تم کیا سمجھتی ہو' تمہارے خودکشی کر لینے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟''

''میں کروں تو کیا کروں۔ اگر اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ لوگ مجھے اس قدر بدنام کر ڈالیں گے کہ میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو جائے گا اور جینا دوبھر' لوگ مجھے طعنے دے دے کر ہی مار ڈالیں گے۔ میرے لیے تو دونوں صورتوں میں ہی موت ہے۔''

''تم ہمت سے کام لو۔ میں بھی سوچتی ہوں اور تم بھی سوچو کہ اس مشکل سے کیسے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے' لیکن مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تم اس قدر بیوقوف نکلی...... محض ایک لڑکے کو اپنانے کی غرض سے' تم کتنی آسانی سے اپنی عزت داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہوگئی۔'' فریال نے زارا کو سمجھانے کی غرض سے قدرے تلخ لہجے میں بات کی تھی' زارا' فریال کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی تھی' مگر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

فریال کے حوصلہ دینے اور ہمت بڑھانے سے' نہ صرف زارا کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تھا بلکہ ایک ہمدرد دوست کی گود میں سر رکھ کر رو لینے سے اس کی طبیعت بھی کچھ بحال ہوگئی تھی' لیکن زارا کی باتوں نے فریال کو تڑپا کر رکھ دیا تھا' وہ گھر پہنچی تو پریشان تھی' زارا کی پریشانی کا سوچ کر اس سے رات کا کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا تھا' وہ عام دنوں کی نسبت بیڈ پر بھی جلدی ہی جا لیٹی تھی' وہ رات بھر زارا کے معاملے پر غور کرتی رہی' اسی لیے ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔

وہ آفس پہنچی تو ابھی زارا نہیں آئی تھی' وہ کچھ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی' وہ جانتی تھی کہ زارا آفس سے چھٹی کم ہی کرتی تھی اور اگر کسی وجہ سے اسے چھٹی کرنا ہوتی تھی تو وہ فریال کو ضرور بتا دیا کرتی تھی' جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' فریال کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی' اپنی پریشانی کم کرنے کے لیے اس نے اپنے موبائل سے زارا کا نمبر ملایا تھا' مگر اس کا موبائل آف جا رہا تھا' تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس نے کئی بار زارا کا نمبر ملانے کی کوشش کی تھی مگر بار بار موبائل آف کا پیغام سننے کو مل رہا تھا۔

زارا کے آفس نہ آنے اور موبائل آف ہونے پر فریال کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے تھے' اس کے دل سے جو سب سے پہلا سوال اٹھا تھا' وہ یہی تھا کہ کہیں اس نے اپنی سوچوں کو عملی جامہ تو نہیں پہنا دیا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً سے پہلے زارا کے ہاں جا کر اصل حالات معلوم کرے' تاکہ اس کی بے چینی کو قرار آ جائے' مگر وہ ایسا کر کے ان کے گھر والوں کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی' اس لیے اب اسے فریال کی طرف سے کسی پیغام کا بے صبری سے انتظار تھا' وہ آفس کے کسی بھی فون کی گھنٹی بجنے پر چونک اٹھتی تھی اور اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں' اسی کیفیت میں صبح سے شام ہوگئی تھی مگر زارا کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

فریال جانتی تھی کہ اگر وہ زارا کے متعلق صحیح صورت حال جانے بغیر گھر چلی گئی تو رات بھر بے چین رہے گی' بے چینی سے بچنے کا واحد حل یہی تھا کہ زارا کے گھر جایا جائے' وہ اس سے قبل بھی کئی بار اس کے گھر جا چکی تھی' اس لیے اسے گھر ڈھونڈنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا' آفس سے نکل کر وہ باآسانی زارا کے ہاں جا پہنچی تھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا' تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا تھا' دروازہ زارا کی ماں نے کھولا تھا' اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''السلامُ علیکم آنٹی!'' فریال نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اندر آنے کو کہا۔

''آنٹی! زارا کہاں ہے؟'' فریال نے دھڑکتے دل کے ساتھ زارا کے بارے میں دریافت کیا اور سوچنے لگی کہ نہ جانے اگلے ہی لمحے اسے زارا کے متعلق کیا سننے کو مل جائے۔

''وہ اپنے کمرے میں ہے' نہ جانے اس نے اپنے دل میں کون سے روگ پال لیے ہیں' ہر وقت چپ چپ رہنے لگی ہے۔ ہمیں تو کچھ بتاتی نہیں' تم اس کی دوست ہو' تم پوچھ کر دیکھ لو' شاید وہ تمہیں کچھ بتا دے۔'' زارا کی ماں نے فریال کو بتایا تھا' بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں' مگر فریال کو یہ جان کر قدرے اطمینان نصیب ہوا تھا کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا' جس کے بارے میں سوچ کر ہی وہ پریشان ہو گئی تھی۔

فریال' زارا کے کمرے میں پہنچی تو وہ چار پائی پر اوندھے منہ لیٹی تھی' قدموں کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا' اس کی نظر فریال پر پڑی تو وہ اٹھ بیٹھی تھی' رونے سے کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی' ایسا

دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ برسوں کی مریض ہو۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟" فریال نے زارا کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بات کی تھی۔

"کیوں کیا ہوا ہے مجھے؟" "اچھی بھلی تو ہوں۔" زارا نے فریال کی تسلی کے لیے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجا کر کہا تھا۔

"وہ تو تمہاری شکل سے ہی لگ رہا ہے کہ تم کتنی زیادہ اچھی ہو اسی لیے تو آنٹی بھی اس قدر پریشان ہیں کہ ان کی آنکھوں میں تمہاری وجہ سے آنسو بھرے ہوئے ہیں۔"

"تمہاری قسم! مجھے کچھ نہیں ہوا بس ہلکا سا بخار تھا اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح وقت پر آنکھ نہ کھلی اس لیے آفس نہ آسکی اور میرے آفس نہ آنے پر تم پریشان ہوگئی ہوگی۔"

"شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا ورنہ تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

"فریال! کچھ فیصلے کتنے مشکل ہوتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اچھا چھوڑو تم ان باتوں کو میں تمہیں وہ تصویریں دکھاتی ہوں جن کی وجہ سے میری زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے اور میں ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہوں۔" زارا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بات کی تھی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر الماری سے ایک لفافہ لا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

فریال ایک ایک کر کے وہ تصویریں دیکھنے لگی تھی جیسے جیسے وہ تصویریں دیکھتی جاتی تھی ویسے ویسے خوف سے اس کی آنکھیں پھیلتی جاتی تھیں تصویریں دیکھ کر فریال غصے سے کانپنے لگی تھی اور اس نے سبھی تصویریں پھاڑ ڈالیں۔

"ان تصویروں پر غصہ نکالنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ان جیسی نہ جانے کتنی ہی تصویریں ان کے پاس موجود ہیں میں کسی روز تمہیں اس شخص کی تصویر بھی دکھاؤں گی جو میری تباہی کا باعث بنا۔"

"وہ بھی...... ابھی دکھا دو۔" فریال نے بات تو کر دی تھی مگر وہ چاہتی نہیں تھی کہ زارا وہ تصویر اسے دکھائے کیونکہ اس کے دل میں کچھ خوف پلنے لگے تھے۔

"میں دکھا تو دیتی مگر وہ تصویر میں نے امی کے کمرے میں چھپا رکھی ہے ابھی وہاں سے نکالنے گئی تو انہیں شک ہو جائے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر کسی دن سہی اب میں چلتی ہوں دانش انتظار کر رہے ہوں گے۔" فریال نے بات کی اور اٹھ کھڑی ہوئی اس کے اٹھتے ہی زارا نے بھی چارپائی چھوڑ دی تھی اور فریال کو گلے لگا کر رو پڑی تھی فریال کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے تھے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے گلے لگیں کافی دیر تک اسی حالت میں کھڑی رہیں پھر آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل دل کے ساتھ فریال وہاں سے نکل گئی۔

فریال اور زارا کی دوستی اس وقت سے تھی جب انہوں نے جوانی میں قدم بھی نہیں رکھے تھے کالج اور یونیورسٹی میں بھی وہ دونوں ایک ساتھ تھیں فریال کے والدین نے یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا اور وہ دو بچوں کی ماں بھی بن چکی تھی جبکہ زارا کی ابھی تک کہیں منگنی بھی طے نہیں پائی تھی جو دوستی اسکول سے شروع ہوئی تھی وہ اب بھی ویسے ہی تھی اسی لیے زارا کی حالت دیکھ کر فریال گھر پہنچ کر تکیے میں منہ دے کر بہت روئی تھی اور اس نے نماز کے بعد زارا کے لیے رو رو کر خدا کے حضور دعائیں کی تھیں۔

اگلے روز زارا پھر سے آفس نہیں آئی تھی مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کی موت کی خبر آگئی تھی وہ اپنے کمرے کے پنکھے سے جھول گئی تھی خبر ملتے ہی فریال کی چیخیں نکل گئی تھیں اور وہ پاگلوں کی طرح روتی ہوئی زارا کے ہاں جا پہنچی تھی۔

......☆☆☆......

زارا نے رسوائی کے خوف سے موت کو گلے لگا کر اپنی دانست میں انتہائی درست فیصلہ کیا تھا لیکن وہ اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئی تھی جن کا جواب اس کے والدین کے پاس بھی نہیں تھا کسی بھی محلے دار عزیز یا رشتے دار کا سوال سن کر شرمندگی سے ان کی گردن جھک جاتی تھی مگر سوائے خاموشی کے وہ کچھ کہہ نہیں پاتے تھے فریال کو اس بات کا احساس تو زارا کا جنازہ اٹھنے سے بھی بہت پہلے ہو گیا تھا کہ زارا کے متعلق بہت سی باتیں کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کانوں میں پڑ چکی تھیں مگر وہ پھر بھی کریدنے میں لگے ہوئے تھے۔

جان سے بھی پیاری دوست کی موت نے فریال کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا زارا کی خودکشی سے اس کا لوگوں سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا وہ اپنے اور کاشف کے تعلق کو بھی اسی پلڑے میں تولنے لگی تھی وہ سوچنے لگتی کہ کہیں کاشف بھی اس کے ساتھ وہی کھیل تو نہیں کھیلنے والا جو جنید نے زارا کے ساتھ کھیلا تھا اس کے ایسا سوچنے پر دل کے کسی کونے سے آواز اٹھتی تھی "کاشف ایسا نہیں ہو سکتا۔"

زارا کی موت کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا باس نے اس دوران کئی لڑکیوں کے انٹرویو لیے تھے مگر باس کو ان میں سے کوئی کام کی لڑکی نہیں ملی تھی فریال دیوانوں کی طرح دن میں کئی بار اس خالی سیٹ کو دیر تک دیکھتی رہتی جس پر اس کی دوست بیٹھا کرتی تھی اور ان دونوں میں دور سے ہی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا اب جب بھی اس کی نگاہ اس طرف اٹھتی تو خالی کرسی دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگتی اور درد کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں وہ دونوں مل کر لنچ کیا کرتی تھیں مگر جس روز سے زارا اسے چھوڑ کر گئی تھی اس روز سے اس نے گھر سے لنچ لانا ہی چھوڑ دیا تھا اور اگر کسی روز لے بھی آتی تو اس کا کھانے کو دل نہیں کرتا تھا اور لنچ بکس ایسے کا ایسے ہی گھر واپس آجاتا تھا۔

اس روز زارا کی جدائی نے اسے بہت رلایا تھا فریال جانتی تھی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی پھر بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اچانک کسی سمت سے آنکلے اور اسے گلے لگالے مگر ایسا کہاں ممکن رہا تھا لیکن اس کی اس خواہش نے شدت اختیار کر لی تھی کہ کوئی ایسا ہو جس سے وہ زارا کی باتیں کرے اس کے ساتھ بتائے ہوئے خوشگوار لمحوں کے متعلق گفتگو ہو مگر ایسا کون تھا۔

اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ اپنی بے قراریوں کا قرار ڈھونڈنے زارا کے گھر کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی تھی مگر دروازے پر لگا تالا دیکھ کر الجھ کر رہ گئی تھی وہ کچھ دیر تک وہیں ساکت کھڑی تالے کو دیکھتی رہی پھر کچھ سوچ کر اس نے ساتھ والے ہمسایوں کے گھر کی ڈور بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا دروازہ کسی خاتون نے کھولا تھا جس نے زارا کے اہل خانہ کے بارے میں دریافت کرنے پر جو جواب دیا تھا وہ اسے رلانے کے لیے کافی تھا اس خاتون نے انتہائی رازداری کے انداز میں بتایا تھا۔

"دلوں کے بھید تو اوپر والا ہی جانتا ہے کسی کے چہرے پر تھوڑے ہی لکھا ہوتا ہے مرنے والی بھی دیکھنے میں انتہائی سمجھدار اور بھولی بھالی دکھائی دیتی تھی وہ تو اس کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کے

کتنے مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے' لیکن ایسی باتیں زیادہ دیر تک کہاں چھپی رہتی ہیں' ہر زبان پر اسی کے چرچے تھے' وہ خود تو مرگئی مگر اس کے والدین کی زندگی تماشہ بن کر رہ گئی تھی' وہ کہنے کو زندہ تھے' مگر چلتی پھرتی لاشیں دکھائی دینے لگے تھے' وہ لوگوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کا جواب کب تک دیتے' اس لیے مجبوراً خاموشی سے یہ گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔''

فریال اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے زارا کے والدین سے ملنے گئی تھی' مگر خاتون کی باتوں نے اس کے دل کو اور بھی زخمی کر ڈالا تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہیں کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو دے' مگر وہ ایسا نہیں کر پائی تھی اور کچھ دیر وہیں چپ چاپ کھڑی سوچتی رہنے کے بعد گھر کی طرف چل پڑی تھی۔

......☆☆☆......

وہ حسن کے معاملے میں اس قدر مالا مال تھی کہ اس کا حسن پچھلے چھ سال سے خرچ ہو رہا تھا مگر اس کی خوب صورتی میں ذرا سی بھی کمی نہیں آئی تھی' اب بھی اس کی ستارہ آنکھوں کی چمک ویسی کی ویسی تھی' اس کے دودھیا رنگ رخساروں میں گلابوں کی سی سرخی اب بھی

ویسی ہی تھی' مسکراتے ہوئے اس کے موتیوں جیسے دانت اب بھی دل موہ لیتے تھے' وہ دو بچوں کی ماں تھی مگر اب بھی کسی شادی بیاہ کے فنکشن میں سج سنور کر جاتی تو بہت سے نوجوان نہ صرف اپنا دل تھام کر رہ جاتے تھے' بلکہ اس سے شادی کے بارے میں سوچنے لگتے تھے' کئی ایسی خواتین جو اسے پہلی بار دیکھتی تھیں' وہ اپنے بیٹوں کے لیے اسے پسند کرلیتیں اور اس کا رشتہ مانگنے کے لیے بے چین ہو کر اشاروں ہی اشاروں میں معلومات حاصل کرنے لگتی تھیں۔

وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی' اسے اپنے خاوند اور بچوں سے دلی محبت تھی اور خاوند کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتی تھی' خاندان میں اس کا ذکر ایک مثالی بیوی کی حیثیت سے کیا جاتا تھا' دانش بھی اسے دیکھ کر جیتا تھا اور اس کی ایک ایک ادا پر قربان جاتا تھا' لیکن نہ جانے کب شک نے فریال کے دل میں گھر کرلیا تھا' یہی شک ہی تھا' جس سے ان میں آئے روز چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہونے لگے تھے' انہی اختلافات نے ان کے درمیان دیوار کھڑی کر ڈالی تھی' پھر آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا ہوتے چلے گئے کہ وہ خاوند سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

......☆☆☆......

شاہد آتے جاتے کئی بار فریال کو ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے دیکھ چکا تھا' دانش کے ساتھ اس کی دوستی بہت پرانی تھی' اس کے دانش کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے اور وہ کئی بار اپنی فیملی کے ہمراہ دانش کے ہاں جا چکا تھا' وہ دانش کے سبھی عزیز رشتے داروں کو اچھی طرح جانتا تھا' جس نوجوان کو اس نے فریال کے ساتھ کئی بار دیکھا تھا' وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا' اس نے ایک عرصے تک خود کو اس بارے میں دانش سے بات کرنے سے روکے رکھا تھا' مگر ایسا نہ کرکے اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی' وہ کسی نہ کسی طرح دانش سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا' لیکن دانش کی ناراضگی کے ڈر سے ایسا نہیں کر پاتا تھا' مگر جب اس کی بے چینی مزید بڑھی تو اس نے دانش سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کا موبائل نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''کیسے ہو؟'' فون اٹینڈ کرنے پر شاہد نے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں' تم اپنی سناؤ' آج میری یاد کیسے آگئی؟'' دانش نے شاہد کی بات سن کر دریافت

''جب سے تم نے بیوی نما شوہر بن کر گھر داری سنبھالی ہے' تم بھی تو گھر کے ہی ہو کر رہ گئے ہو۔''

''یہ سب تمہارا ہی دیا ہوا تحفہ ہے۔''

''اچھا ان باتوں کو چھوڑو' کوئی ملاقات کا پروگرام بناؤ۔''

''خیر تو ہے' میرے بغیر اداس ہو گئے ہو کیا؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''تو پھر کسی بھی روز مل لیتے ہیں۔''

''بیوی گھر سے نکلنے دے گی تو پھر ہے ناں۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے' تم جب چاہو مل سکتے ہیں' بلکہ میں تو کہتا ہوں تم میری طرف ہی آجاؤ' میں تمہیں اپنے ہاتھ کا پکا ہوا زبردست قسم کا کھانا بھی کھلاؤں گا۔''

''نہیں بابا نہیں' اس معاملے میں تو تم مجھے معاف ہی رکھو' یہ بھابی کی ہی ہمت ہے' جو تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا بدذائقہ کھانا بغیر کسی احتجاج کے کھالیتی ہیں۔''

''یہ میری بے عزتی کر رہے ہو کیا؟''

''ماشاء اللہ کافی سمجھدار ہو۔''

''اچھا یار' تم ہی بتاؤ کہاں ملیں؟''

''کل اتوار ہے اور بھابی گھر پر ہی ہوں گی اس لیے تمہیں گھر سے نکلنے میں زیادہ دشواری بھی نہیں ہوگی' تم میری طرف آجانا' دوپہر کا کھانا بھی ایک ساتھ کھائیں گے اور گپ شپ بھی ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔''

''او کے پھر اللہ حافظ۔'' شاہد نے بات کی اور موبائل ایک طرف رکھ کر سوچنے لگا کہ فریال اور اس نوجوان کے بارے میں بات کرکے کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہا تھا' وہ جس قدر سوچتا جاتا تھا اسی قدر اس کا ذہن الجھتا جاتا تھا' اس لیے اس نے اپنے اندر سے اٹھنے والے سوالوں کو جھٹک دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

دن بھر اس نے پھر سے اس بارے میں اپنے ذہن کو الجھنے نہیں دیا تھا' مگر جیسے ہی وہ بستر پر لیٹا' ایک بار پھر انہی سوچوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا تھا' یہ بات اس قدر کانٹا بن کر اس کے دل میں چبھی تھی کہ جس کے درد کی شدت نے رات بھر کسی بھی پل اسے سکون سے آنکھیں بند نہیں کرنے دی تھیں۔

اگلے روز دانش وعدے کے مطابق دوپہر کو شاہد کے ہاں پہنچ گیا تھا' دونوں نے ایک ساتھ لنچ کیا' لنچ کے دوران ان دونوں کے درمیان ہونے والی زیادہ تر گفتگو آفس کے بارے میں ہی تھی' اب وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھے تھے' تب تک شاہد بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

''بھابی کی جاب کیسی جارہی ہے؟'' شاہد نے مطلب کی بات کی طرف آنے کے لیے سوال کیا تھا۔

''ٹھیک ہے' بس گھر چل رہا ہے۔''

''لیکن اس طرح کب تک چلے گا؟''

''ہاں' کبھی کبھی میں بھی ایسا ہی سوچنے لگتا ہوں' مگر سچ پوچھو تو وقت کے ساتھ ساتھ میں نے بھی سمجھوتہ کرنا شروع کردیا ہے کیونکہ اگر میں کچھ بولوں گا تو وہ اسے میری شکست سمجھے گی اور کسی عورت سے ہار ماننے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔''

''دانش! بہت دنوں سے ایک سوال مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔''

''ہاں پوچھو۔''

''دیکھو مجھے غلط مت سمجھنا' تم مجھے بہت عزیز ہو خدا کرے کہ جس طرح کے سوالات میرے ذہن

میں پیدا ہو رہے ہیں' وہ سب جھوٹ ہوں' مگر مجھے اس بات کا بھی خوف ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا' جیسا میں سوچ رہا ہوں' تو کہیں ہماری دوستی میں ہی دراڑ نہ پڑ جائے۔''

''جو کچھ بھی کہنا ہے' کہہ ڈالو اور اس بات کا یقین رکھو کہ کسی بھی بات سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' دانش نے شاہد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بات کی تھی۔

دانش کی بات سن کر شاہد نے ایک لمبی سانس لے کر چھوڑی اور آہستہ سے بولا ''وہ بلیک کلر کی ٹیوٹا کرولا کس کی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' شاہد کا سوال سن کر دانش کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا تھا اور اس نے حیران ہو کر وضاحت طلب کی تھی۔

''ہو سکتا ہے' یہ میری غلط فہمی ہو لیکن میں نے بھابی کو ایک نوجوان کے ساتھ اس گاڑی میں آتے جاتے کئی بار دیکھا ہے۔ میں اپنی تسلی کے لیے یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ نوجوان تمہارا کوئی قریبی رشتہ دار ہے ......یا؟''

''میں اس طرح کے کسی گاڑی والے کے بارے میں تو نہیں جانتا' لیکن مجھے فریال پر پورا اعتماد ہے۔ وہ کبھی بھولے سے بھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی' جس سے میری عزت میں کوئی کمی آئے یا کسی کی انگلی میری طرف اٹھے۔''

''دیکھو' میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں' بیوی پر اعتماد ہونا اچھی بات ہے مگر اندھا اعتماد نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تم اسے کچھ بھی سمجھو لیکن میں آنکھیں بند کر کے فریال پر اعتماد کر سکتا ہوں۔''

''خدا گواہ ہے' میں بھی کبھی بھابی کے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچ سکتا' اسی لیے تمہارے ساتھ بات کرنے سے پہلے میں نے ایک بار نہیں' سو بار سوچا ہے لیکن ذرا سوچو تو سہی' اگر تم بھی اس نوجوان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو بھابی سے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔''

''بس' بہت ہو گئی۔ اب اس بات کو یہیں ختم کر دو نہ تم مزید کچھ سوچو اور نہ مجھے ہی اس بارے میں سوچنے پر مجبور کرو' ہم میاں بیوی کے درمیان جو اعتماد کا رشتہ ہے اسے اسی طرح بحال رہنے دو۔'' دانش نے قدرے تلخ لہجے میں بات کی تھی اور ساتھ ہی شاہد کا جواب سنے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

شاہد نے بھی اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا' اس لیے خاموش رہا تھا' گو کہ اسے اپنے دل سے اٹھنے والے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں ملا تھا' مگر پھر بھی وہ مطمئن تھا کہ اس نے اپنے ذہن میں پلنے والے خدشات دانش تک پہنچا دیے تھے۔

......☆☆☆......

دانش اور فریال کی محبت کے سبھی معترف تھے' ان کی اب تک کی شادی شدہ چھ سالہ زندگی انتہائی پر سکون گزری تھی' دانش نے ایک بار بھی کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ حالات ایسا رخ بھی اختیار کر لیں گے' جب اسے فریال کے کردار کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہو گا' اسی لیے اس نے شاہد کی بات پر کسی فوری رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا' وہ گھر پہنچا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے' فریال صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی' اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ دانش کے چہرے سے پریشانی کیوں جھلک رہی تھی' حالانکہ اس سے قبل جب کبھی بھی اسے دانش کے چہرے سے کسی

پریشانی کا ذرا سا بھی شائبہ ہوا تھا' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

فریال کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر دانش کے دل پر چوٹ لگی تھی' اس لیے وہ خاموشی سے تنہا بیڈ پر جا لیٹا تھا' وہ بیڈ پر آ لیٹا تھا مگر پھر بھی اسے امید تھی کہ فریال ابھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئے گی' مگر ایسا نہیں ہوا تھا' ذرا سی تنہائی میسر آتے ہی وہ شاہد کی باتوں پر غور کرنے لگا تھا' وہ جس قدر بلیک کلر کی گاڑی والے نوجوان کے متعلق سوچتا جاتا تھا' اسی قدر الجھتا جاتا تھا' مگر اس کے باوجود اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ فریال کسی بھی صورت اسے کبھی دھوکا دے سکتی ہے۔

......☆☆☆......

زارا نے فریال کو بتایا تھا کہ وہ جنید کی کچھ تصاویر اسے دکھائے گی' مگر موت نے اسے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی' گو کہ زارا کی موت کے بعد وہ انتہائی محتاط ہو گئی تھی' مگر کاشف کی محبت نے اسے اس قدر اندھا کر ڈالا تھا کہ اسے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا' وہ کاشف کو پانے کے لیے سبھی رشتوں کو ٹھوکر مارنے کے لیے تیار تھی' وہ بچے جو اس کی جان اور دل کی دھڑکن تھے' جن کی سانسوں سے اس کی زندگی کی ڈور جڑی ہوئی تھی' وہی بچے نہ صرف اس کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے بلکہ دشمن دکھائی دینے لگے تھے اور اپنی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ لگنے لگے تھے' اسے رہ رہ کر یہ احساس رلا ڈالتا تھا کہ کاش کچھ سال قبل کاشف سے اس کی ملاقات ہو گئی ہوتی' یا پھر اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی اور اگر شادی ہو گئی تھی تو بچے پیدا نہ ہوئے ہوتے' اب اس کے لیے خاوند اور بچے راستے کے وہ پتھر تھے' جنہیں وہ کہیں بہت دور پھینک دینا چاہتی تھی' اب وہ اس موقعہ کی تلاش میں تھی' جب کسی بات سے چڑ کر وہ دانش سے طلاق کا مطالبہ کر سکے۔

وہ کاشف کے ساتھ بوفے ڈنر کے بعد کافی لیٹ گھر پہنچی تھی' دونوں بچے سو چکے تھے' مگر دانش ابھی تک اس کے انتظار میں صوفے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں' اتنی رات گئے کہاں سے آ رہی ہو؟'' فریال کے گھر میں داخل ہوتے ہی دانش پھٹ پڑا تھا۔

''تمہیں فون پر اپنے لیٹ آنے کا بتا تو دیا تھا پھر اس قدر خفا کیوں ہو رہے ہو؟'' فریال نے اپنے لیٹ آنے پر معذرت کرنے کی بجائے تلخی سے بات کی تھی۔

''یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟''

''کیوں کیا ہوا ہے وقت کو؟''

''شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں رات گئے تک بلاوجہ گھروں سے باہر نہیں رہا کرتیں۔''

''زیادہ چیخو مت' یہ کام مجھے بھی آتا ہے۔''

''ویسے تمہیں بھولا تو نہیں ہو گا۔ میرے تھوڑا سا لیٹ آنے پر بھی تم مجھے کیسی کھری کھری باتیں سنایا کرتی تھی اور خود عورت ہو کر بھی رات گئے گھر آنے کو اپنا حق سمجھنے لگی ہو۔''

''دیکھو' میں تم سے کہہ رہی ہوں' مجھ سے الجھو مت......ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''واہ! چوری اوپر سے سینہ زوری' اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کی بجائے الٹا مجھ پر ہی رعب ڈال رہی ہو۔''

''میں غلطی پر ہوتی تو کبھی تمہاری کسی بات کا برا نہ مناتی۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جب چاہو' جہاں سے چاہو' جس کے ساتھ چاہو گھوم پھر کر آ جاؤ۔ میں تم سے پوچھوں بھی ناں؟''

''ایسا ہی سمجھ لو' لیکن میں گھر میں قید ہو کر نہیں بیٹھ

سکتی' اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو چھوڑ دو مجھے۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"وہی' جو تم نے سنا۔"

"اس کا مطلب جانتی ہو تم؟"

"بچی نہیں ہوں میں' کیا اچھا ہے' کیا برا' سب سمجھتی ہوں' ہاں اگر تم نہیں سمجھے تو میں سمجھا دیتی ہوں' مجھے طلاق دے دو کیونکہ جب میں تمہارے معیار پر ہی پوری نہیں اتروں گی تو پھر آج نہیں تو کل یہ ہونا ہی ہے پھر ابھی کیوں نہیں؟"

فریال نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ دی تھی کہ دانش کو اپنی قوت سماعت پر شک ہونے لگا تھا اور وہ حیران کن نظروں سے فریال کو دیکھے جا رہا تھا' فریال نے دانش کی بگڑتی ہوئی حالت کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور اسے وہیں چھوڑ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی' جبکہ دانش وہیں صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا' وہ وہیں صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھا اپنی شادی شدہ زندگی کے بارے میں غور کرنے لگا تھا' اس رات نیند اس سے روٹھ گئی تھی' اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم میں جا لیٹتا' اس لیے وہیں صوفے پر لیٹا رہا' فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں' جب نیند نے بالآخر اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

وہ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح معمول کے مطابق اٹھ نہیں سکا تھا' اس کی آنکھ کھلی تو عمر اسکول جا چکا تھا اور فریال بھی گھر پر نہیں تھی' جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی اپنے آفس جا چکی تھی' درد سے اس کا سر بری طرح پھٹا جا رہا تھا' منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے اپنے لیے چائے تیار کی اور ہاتھ میں چائے کا کپ لیے واپس صوفے پر آ بیٹھا۔

ایک بار پھر فریال کی کہی ہوئی باتیں دانش کے کانوں میں گونجنے لگی تھیں' اس کی ایک ایک بات ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر برس رہی تھی' اس نے اپنا سر صوفے کی پشت گاہ پر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں' وہ جیسے جیسے فریال کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرتا تھا' اسی قدر اس کی اندرونی کیفیت بگڑتی جاتی تھی۔

رات کو میاں بیوی کے درمیان جس قدر تلخ لہجے میں بات ہوئی تھی' اس کا دانش نے بہت گہرا اثر لیا تھا اور وہ تب سے ایک پل کے لیے بھی سکون سے بیٹھ نہیں پایا تھا' ایک ہی دن میں اس کی حالت اس مریض کی سی ہو گئی تھی' جو برسوں سے کسی موذی مرض میں مبتلا ہو' جبکہ دوسری طرف فریال یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ اسے باآسانی اپنی وہ بات دانش تک پہنچانے کا موقعہ میسر آ گیا تھا' جس کے لیے وہ پچھلے کئی روز سے منصوبہ بندی کر رہی تھی۔

"میں نے کچھ مانگا تھا تم سے۔" آفس سے واپسی پر فریال ایک بار پھر وہی قصہ لے کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا مانگا تھا تم نے؟" دانش نے فریال کے منہ سے رات والی بات دوبارہ سننے کے لیے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بات کی۔

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو' تم اچھی طرح جانتے ہو' میں تم سے طلاق کی بات کر رہی ہوں۔"

"طلاق کوئی تحفہ نہیں' کہ تم مانگو اور میں خوشی سے دے ڈالوں۔"

"میرے لیے تو یہ تمہاری طرف سے تحفہ ہی ہوگا۔"

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو خوامخواہ طول نہیں دیا کرتے۔ معاملات کو الجھانے کی بجائے' انہیں سلجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

"بات تو سیدھی سی ہے' مگر تم اسے خود ہی الجھا رہے ہو۔"

"جانتی ہو' طلاق سے بچے بھی ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں اور اس ایک فیصلے سے کئی خاندانوں کی جڑیں تک ہل کر رہ جاتی ہیں۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں سننا۔ مجھے بچوں کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارے بچے' تمہی کو مبارک ہوں۔ میں تمہیں صرف چار دن کی مہلت دے رہی ہوں' مگر یہ خیال رکھنا اگر تم طلاق نہیں دو گے' تو میں یہ کام عدالت کے ذریعے کر لوں گی۔"

فریال نے اپنے دل کی بات دانش تک پہنچا دی تھی اور وہاں سے اٹھ کر واش روم میں جا گھسی تھی' جبکہ دانش دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

......☆☆☆......

وہ بظاہر آفس میں اپنے ٹیبل پر بیٹھی کام میں مگن تھی' مگر ذہن کاشف کے خیالوں میں الجھا ہوا تھا' آفس بوائے نے اسے باس کا پیغام دیا تھا اور وہ اپنی نوٹ بک اور بال پوائنٹ ہاتھ میں لیے باس کے کمرے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

"جی سر؟" فریال نے کمرے میں داخل ہوتے ہی باس سے کہا تھا۔

"مس فریال! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔" باس نے فریال کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"حکم کریں سر۔"

"بیٹھیں پلیز۔" فریال کو کھڑے دیکھ کر باس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات کی تھی۔

"تھینک یو سر۔" فریال نے باس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"مس زارا کی موت ہم سب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے' اس ادارے کے لیے ان کی جو خدمات ہیں' وہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا' ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے' اسے شاید ہم کبھی بھی پورا نہ کر پائیں۔"

"جی سر۔" باس کے منہ سے زارا کا ذکر سن کر فریال کی آنکھیں بھر آئی تھیں' اس نے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی جھولی میں آ گرے تھے۔

فریال کو روتے دیکھ کر باس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی' فریال نے خود کو سنبھالتے ہوئے ٹشو سے اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کیں اور ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولی "سوری سر' زارا کی باتیں سن کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔"

"ہوتا ہے' ایسا ہوتا ہے۔ خیر میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے کہ ہم آفس کے لیے کسی نئی لڑکی کی تلاش میں ہیں اور اس سلسلے میں کئی لڑکیوں کے انٹرویو بھی لیے ہیں' امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی مناسب لڑکی مل جائے گی' فی الحال آپ اپنے کام کے ساتھ زارا کا کام بھی دیکھ لیا کریں۔ جو نئی لڑکی اپوائنٹ ہو گی' وہ آپ کی سیٹ سنبھال لے گی۔"

"ٹھیک ہے سر! میں کر لوں گی۔" بات کرتے ہی فریال اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ کہاں چل دیں؟" فریال کو اٹھتے دیکھ کر باس نے دریافت کیا تھا۔

"سوری سر! میں سمجھی شاید آپ نے جس بات کے لیے مجھے بلایا تھا' وہ پوری ہو گئی۔" فریال نے دوبارہ بیٹھنے کی بجائے کھڑے کھڑے بات کی تھی۔

"جس بات کے لیے میں نے آپ کو بلایا تھا' وہ بات تو میں نے ابھی تک کی ہی نہیں۔"

"فرمائیں سر۔"

"ہم نے آپ کی کارکردگی اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے' آپ کی تنخواہ میں دس ہزار روپے اضافے کا

فیصلہ کیا ہے۔“
”آپ کا بہت شکریہ سر! کیا اب میں جاسکتی ہوں؟“ چہرے پر مسکراہٹ سجائے فریال نے بات کی تھی۔
”ہاں......اب آپ جاسکتی ہیں۔“
باس سے اجازت ملتے ہی فریال واپس اپنی سیٹ پر آبیٹھی تھی‘ اس کے لیے تنخواہ میں دس ہزار روپے کا اضافہ کوئی معمولی نہیں تھا‘ وہ اس قدر خوش تھی کہ اس سے خوشی سنبھالی نہیں جارہی تھی‘ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے سب کو یہ خوشخبری سناڈالے‘ ایسے میں اسے اپنی دوست زارا کا خیال آنا یقینی تھا‘ وہ سوچنے لگی کہ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو یقیناً خوشی سے جھومنے لگتی‘ زارا کا خیال دل میں آتے ہی اس کی آنکھیں پھر سے بھر آئی تھیں اور وہ اس کے متعلق سوچنے لگی تھی۔
فریال کے لیے یہ دن زندگی کا انتہائی یادگار دن تھا‘ اچانک اس کی آمدن میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا‘ وہ اندر ہی اندر خوشی سے جھوم رہی تھی‘ مگر اچانک اس کے بدن میں کپکپی سی پھیل گئی تھی‘ وہ بری طرح کانپ اٹھی تھی اور سر چکرانے لگا تھا‘ اسے آفس کی ہر چیز گھومتی دکھائی دینے لگی تھی‘ اس نے اپنی کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا‘ اس کی اس کیفیت کی وجہ زارا کی آواز تھی‘ اس نے تیزی سے گردن گھما کر اپنے چاروں طرف دیکھا تھا‘ اسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا‘ مگر اسے پورا یقین تھا کہ وہ زارا کی ہی آواز تھی‘ جو اس کے کانوں میں چپکے سے کہہ گئی تھی ”سنبھل سکتی ہو تو سنبھل جاؤ‘ بچ سکتی ہو تو بچ جاؤ‘ شکاریوں نے تمہارے گرد جال پھیلانا شروع کردیے ہیں۔“
زارا کی آواز نے اس کے اندر ہلچل مچادی تھی‘ اس کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی‘ کیونکہ زارا کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگے تھے‘ جو اس نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہے تھے ”اسی کے کہنے پر میری تنخواہ میں اضافہ کیا گیا تھا‘ میں اس روز بہت خوش تھی‘ مگر اس وقت یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ مجھے شکار کرنے کے لیے تنخواہ میں اضافے کا دانہ پھینکا گیا ہے‘ جسے میں نے بخوشی چگ بھی لیا تھا۔“
وہ دن بھر خود سے لڑتے ہوئے آفس سے گھر پہنچی تھی‘ دانش کچن میں گھسا ہوا تھا‘ عمر اور علی دونوں صوفے پر بیٹھے اپنے پسندیدہ کارٹون ’ڈورے مون‘ دیکھ رہے تھے‘ انہیں اِدھر اُدھر کا کوئی ہوش نہیں تھا‘ انہوں نے کئی روز بعد ماں کو دیکھا تھا‘ ماں کو دیکھتے ہی عمر کارٹون چھوڑ کر پیار سے اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا‘ بھائی کو ماں کی ٹانگوں سے لپٹتے دیکھ کر علی نے بھی جلدی سے آگے بڑھ کر ماں کی ٹانگوں کے گرد اپنی چھوٹی چھوٹی سی بانہیں ڈال دی تھیں۔
”یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ فریال نے بچوں کو پیار کرنے کی بجائے اپنی ٹانگوں کو جھٹکتے ہوئے ڈانٹ دیا تھا۔
ماں کی ڈانٹ سن کر دونوں بھائی سہم کر ایک طرف ہوگئے تھے‘ فریال نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور وہاں رکے بغیر بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی‘ دانش‘ فریال کی آواز سنتے ہی کچن سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آیا تھا‘ جہاں عمر اور علی آنکھوں میں آنسو لیے خاموش کھڑے تھے‘ جبکہ فریال وہاں موجود نہیں تھی۔
”کیا ہوا تم دونوں کو یوں پریشان کیوں بیٹھے ہو؟“ دانش نے بچوں کو پچکارتے ہوئے دریافت کیا۔
”ماما گندی ہیں‘ میں نہیں ان کے ساتھ بولتا۔“ باپ کے پوچھنے پر علی نے بات کی تھی۔

”ایسے نہیں کہتے بیٹا‘ ماما تو بہت اچھی ہیں۔“ دانش نے علی کو پیار سے سمجھایا۔
”نہیں‘ ماما بہت گندی ہیں‘ انہوں نے مجھے پیار نہیں کیا ایسے کر کے دھکا دے دیا۔“ علی نے ہاتھ کے اشارے سے ماں کے دھکا دینے کے بارے میں باقاعدہ سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔
”ماما تھکی ہوئی ہوں گی بیٹا! اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہوگا۔“ دانش نے پیار سے علی اور عمر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا ”ابھی آپ دونوں کارٹون دیکھو۔ میں کھانا لگاتا ہوں‘ پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔“ بات کرتے ہی دانش کچن میں گھس گیا تھا اور دونوں بھائی پھر سے کارٹون دیکھنے لگے تھے۔
بیڈ پر لیٹتے ہی ایک بار پھر اسے انہی سوچوں نے آگھیرا تھا‘ جن سے وہ دن بھر الجھتی رہی تھی‘ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو اٹھی تھی کہ کہیں اس کے ساتھ بھی وہی کچھ تو ہونے نہیں جارہا تھا‘ جو زارا کے ساتھ ہوا تھا‘ وہ دیر تک جنید اور کاشف کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر تولتی رہی‘ بار بار اس کا دماغ اسے یہی سمجھاتا تھا کہ جنید اور کاشف میں کہیں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا‘ گو کہ وہ زارا کی موت کے بعد انتہائی محتاط ہوگئی تھی‘ مگر اس کے اندر کہیں کوئی چور چھپا بیٹھا تھا‘ اسی لیے دل بار بار کاشف کے حق میں فیصلہ سنا ڈالتا تھا‘ کاشف کو پانے کی آرزو اس کی رگ رگ میں دوڑ رہی تھی‘ وہ کسی بھی حال میں کاشف کو کھونا نہیں چاہتی تھی‘ اس لیے اس نے خود کو ہر طرح سے سمجھا بجھا کر مطمئن کرلیا تھا۔
ایک طرف فریال جاگ رہی تھی‘ دوسری طرف فریال کی طرف سے پیدا ہونے والی بدگمانیاں دانش کو جگائے ہوئے تھیں‘ اس نے کئی بار بلیک کلر کی گاڑی والے نوجوان کے بارے میں فریال سے بات کرنے کی کوشش کی تھی‘ مگر ہر بار بات زبان پر آتے آتے رہ گئی تھی‘ لیکن یہ بات مچھلی کے کانٹے کی طرح اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی‘ جسے اگر حلق سے اتارنا مشکل تھا تو باہر نکالنا اس سے بھی کہیں زیادہ دشوار تھا۔

......☆☆☆......

فریال کے ساتھ اب تک پیش آنے والے واقعات کی تمام کڑیاں جنید سے جاملتی تھیں‘ مگر فریال کسی بھی طرح کاشف کو جنید جیسا سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی‘ کاشف نے آفس سے نکلنے کے بعد ہائی ٹی کا پروگرام بنایا تھا‘ اس لیے وہ ان لمحوں کو کسی اور سوچ میں الجھ کر ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی‘ پروگرام کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ہی کاشف نے گاڑی کا رخ اس ریسٹوران کی طرف موڑ دیا تھا‘ جہاں انہیں ہائی ٹی کے لیے جانا تھا‘ پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہال میں اندر داخل ہونے لگے تو ایک باوردی گیٹ کیپر نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا تھا‘ اس وقت اندر زیادہ لوگ نہیں تھے‘ اس لیے انہوں نے اپنی پسند سے کونے میں ایک ٹیبل کا انتخاب کیا اور آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔
ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا تھا کہ جب بھی وہ دونوں کسی ہوٹل یا ریسٹوران میں گئے تھے‘ کاشف بہت چہک رہا ہوتا تھا‘ مگر فریال نے یہ بات محسوس کی تھی کہ جب سے وہ اور کاشف ایک ساتھ تھے‘ مسکرانا تو ایک طرف کاشف نے ڈھنگ سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی‘ اگر اس نے کوئی بات کی تھی تو اس کے جواب میں کاشف ہوں‘ ہاں سے زیادہ کچھ نہیں بولا تھا‘ وہ کھانے کے لیے اپنی اپنی پسند سے کچھ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر واپس ٹیبل پر آبیٹھے تھے‘ مگر اب

تک کاشف نے خاموشی کو نہیں توڑا تھا۔

''کیا بات ہے' آج کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' خاموشی کو توڑنے کے لیے فریال نے بات کی تھی۔

''نہیں تو ایسی کوئی بات نہیں'' کاشف نے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''تمہیں تو صحیح طرح سے جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔''

''ہاں..... شاید ایسا ہی ہے۔''

''اگر کوئی بات ہے' تو مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو؟''

''میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہ رہا' لیکن تمہیں بتانے کی بھی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

''ایسی کیا بات ہے' جو تم مجھ سے چھپانا بھی نہیں چاہ رہے اور بتانا بھی مشکل ہو رہا ہے؟''

''بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں' جنہیں ہونٹوں تک لانا انتہائی دشوار ہوتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھائل کیے جاتی ہیں۔''

''کاشف! جو کہنا ہے پلیز کہہ ڈالو' ورنہ تمہاری خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔''

فریال کی بات سن کر کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اپنی آنکھیں فریال کے چہرے پر گاڑ دی تھیں' مگر لب خاموش تھے' اس کے انداز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ کوئی بہت بڑی بات کہنا چاہتا تھا مگر زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی' کچھ دیر تک ان دونوں میں گہری خاموشی چھائی رہی' پھر کاشف نے ایک لمبی سانس لے کر چھوڑی اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر فریال کی طرف بڑھا دیا' فریال نے لفافہ ہاتھ میں لیے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں کے اشارے سے اس لفافے کے بارے میں دریافت کیا تھا' مگر منہ سے جواب دینے کی بجائے کاشف نے بھی اشارے سے اسے کہا تھا کہ وہ لفافہ کھول کر خود ہی دیکھ لے۔

لفافہ ہاتھ میں آتے ہی فریال کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں اور کچھ سوچ کر اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے' اس نے ذہن میں اٹھنے والے خیالات کو جھٹکتے ہوئے خود کو مضبوط کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھول لیا' لفافہ کھلتے ہی قابل اعتراض حالت میں کھینچی گئی اس کی بہت سی تصاویر اس کے سامنے میز پر بکھر گئی تھیں' ان تصاویر پر نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں کپکپی پھیل گئی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟''؟ فریال نے ایک جھرجھری لے کر جلدی سے تصاویر سمیٹ کر واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

''یہی تصویریں ہیں' جو میری پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ یقین کرو ان تصویروں کی وجہ سے میں رات بھر ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پایا ہوں۔''

''جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں یہ تصویریں ٹرائی روم میں ڈریسز ٹرائی کرتے ہوئے اتاری گئی ہیں۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن وہ لوگ ان تصویروں کی وجہ سے ہمیں بلیک میل کرنے پر اتر آئے ہیں۔''

فریال کے سپنوں کا محل ایک ہی جھٹکے سے زمین بوس ہو گیا تھا' وہ اب تک جسے محبت سمجھتی رہی' وہ دھوکے اور فریب کے سوا کچھ بھی نہ تھا' وہ چند لمحوں میں ہی جان گئی تھی کہ اس کے ساتھ بھی زارا والی کہانی دہرائی جا رہی تھی' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے' لیکن وہ ایسا کر کے خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی' مگر اسے ظاہر یہی کرنا تھا کہ وہ ان تصویروں کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئی ہے۔

''اب کیا ہوگا؟'' فریال نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کاشف کے خیالات جاننے کے لیے دریافت کیا تھا۔

''ان تصویروں کے بدلے میں ان لوگوں نے جو مطالبات کیے ہیں' میں تو ان کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ اٹھتا ہوں۔''

''ایسا کیا کہتے ہیں وہ؟'' فریال پہلے سے جانتی تھی کہ اس کے اس سوال پر کاشف کا کیا جواب ہوگا' مگر پھر بھی وہ ایک بار اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

''میں وہ بات زبان پر کیسے لاؤں؟''

''تم کہہ ڈالو' میں سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''وہ...... وہ لوگ۔''

''ہاں ہاں...... وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔''

''وہ لوگ ان تصویروں کے بدلے' تمہارے کچھ پل اپنے نام کرنا چاہتے ہیں۔''

''تم کیا کہتے ہو؟''

''اب میں اپنی زبان سے کیسے کہوں' مگر سوچتا ہوں' اگر ان کی بات نہ مانی تو وہ لوگ تمہیں بدنام کر دیں گے۔ تمہاری یہ تصویریں تمہارے محلے کے ہر گھر میں پہنچا دیں گے' اس لیے ان کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔''

''لیکن؟''

''تم میری طرف سے پریشان مت ہونا' میرے دل میں جو تمہاری جگہ ہے' اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

''ٹھیک ہے اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو تمہاری خاطر یہ بھی سہی۔''

فریال کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے کاشف کے چہرے پر جو ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی تھی' اسے صرف فریال ہی محسوس کر سکتی تھی' مگر کاشف نے انتہائی چالاکی سے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے پھر سے چہرے پر اداسی اور پریشانی سجالی تھی تاکہ کہیں فریال اس کے اندر کی کیفیت کو بھانپ نہ لے' جبکہ فریال' کاشف کے اندر ہونے والی دھمال سے پوری طرح آگاہ تھی' وہ جانتی تھی کہ اس وقت کاشف اپنی کامیابی پر اندر ہی اندر کس طرح خوش ہو رہا ہوگا۔

وہ بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھی' مگر اسے ایک ایک لفظ خوب سوچ سمجھ کر ادا کرنا تھا' ہر قدم اٹھانے سے قبل اسے سو بار سوچنا تھا' اس لیے یہ مناسب وقت نہیں تھا کہ اس بارے میں مزید کوئی بات کی جاتی' یوں بھی کہنے اور سننے کے لیے باقی رہ ہی کیا گیا تھا' وہ ریسٹوران میں آنے سے قبل انتہائی خوش تھی اور بہت چہک رہی تھی' مگر چند لمحوں میں ہی وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی کہ اس کی پسندیدہ کھانے کی اشیاء سے بھری پلیٹ سامنے پڑی تھی مگر کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' جبکہ کاشف مسلسل کھانے میں لگا ہوا تھا' کچھ دیر اسی طرح گزر گئی تھی' پھر وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

گھر پہنچنے تک فریال کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہیں' مگر اس نے نہ صرف انہیں بہنے سے روکے رکھا تھا بلکہ کاشف پر بھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا' اس سے پہلے کہ دانش اس کی کیفیت کو بھانپ لیتا' وہ گھر پہنچتے ہی واش روم میں گھس گئی تھی' جس طوفان کو کسی نہ کسی طرح' وہ اب تک روکے ہوئے تھی' اس نے سارے بند توڑ ڈالے تھے اور وہ بلک پڑی تھی' وہ دیر تک واش روم میں کھڑی آنسو بہاتی رہی' طوفان کے تھم جانے کے بعد اس نے اپنی آنکھوں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی تھی۔

وہ چاروں کھانے کی میز پر کھانے کے لیے بیٹھے

تھے، مگر وہ بمشکل ایک دو نوالے ہی حلق سے نیچے اتار پائی تھی، فریال کے کھانا نہ کھانے کی وجہ دانش یہی سمجھ پایا تھا کہ شاید اسے کھانا پسند نہیں آیا تھا، اس لیے اس نے شوق سے کھانا نہیں کھایا تھا، اس روز وہ کھانا کھانے کے بعد سب کے ساتھ مل کر ٹیلی وژن دیکھنے کی بجائے خاموشی سے اٹھ کر بیڈ پر جا لیٹی تھی، بیڈ پر لیٹتے ہی ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، وہ سوچنے لگی تھی کہ بلا سوچے سمجھے وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا ہنستا بستا گھر تباہ کرنے جا رہی تھی۔

دیر تک وہ خود کو ہی لعنت ملامت کرتی رہی، اس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، اسے رہ رہ کر یہ خیال تڑپا رہا تھا کہ وہ دل و جان سے پیار کرنے والے شوہر پر ایک ایسے شخص کو کیوں ترجیح دینے لگی تھی، جو پیار کے مفہوم سے ہی نا آشنا تھا، جسے اس سے زیادہ اس کے خوب صورت جسم میں دلچسپی تھی اور وہ اس کی عزت کو کسی کے ہاتھ بھی نیلام کر ڈالنے کو تیار تھا۔

......☆☆☆......

رات خود کو کوستے اور بار بار خدا سے اپنی راہ سے بھٹکنے پر معافی مانگتے ہوئے کٹ گئی تھی، فجر کی اذان کی آواز اس کے کان میں پڑی تو اس نے بیڈ چھوڑ دیا اور واش روم میں گھس گئی، رات بھر جاگتے اور روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں، اس نے وضو کیا اور خاموشی سے جائے نماز اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی، جہاں اس نے فجر کی نماز ادا کی، نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگتے ہوئے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی اور روتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی، اس کے ہاتھ خدا کے حضور اٹھے ہوئے تھے اور لبوں پر دعا تھی ''اے خدا میرا گناہ قابل معافی تو نہیں، مگر تو ہمارا رب ہے اور دلوں کے بھید صرف تو ہی جانتا ہے، میرا گناہ کتنا ہی بڑا سہی مگر تو پھر بھی معاف کر دینے والا ہے اور مجھ جیسے گنہگاروں کے عیبوں پر پردے بھی تو ہی ڈالتا ہے، یا اللہ مجھے معاف کر دے اور بدنام ہونے سے بچا لے، تو غفور الرحیم ہے اور اپنے بندوں کو معاف کر دینے والا ہے، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے وقت پر میری آنکھیں کھول دیں اور اپنے فضل و کرم کے ساتھ میری عزت کو ہر طرح سے محفوظ رکھا، یا اللہ مجھے اس قدر ہمت عطا فرما کہ میں برائی کے سامنے کمزور نہ پڑ جاؤں اور اپنے حبیب کے صدقے میری رہنمائی فرما۔'' خدا کے حضور دعا مانگنے اور آنسو بہانے سے اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تھا، اس نے جائے نماز تہہ لگا کر ایک طرف رکھا اور پھر سے بیڈ پر جا لیٹی۔

دانش کی آنکھ کھلی تو فریال سو رہی تھی، ورنہ ہمیشہ وہ اس سے پہلے اٹھ جایا کرتی تھی، اور کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ آفس جانے کے لیے اسے فریال کو جگانا پڑا ہو، دانش نے ان تینوں کو سونے دیا اور خود واش روم سے فارغ ہو کر کچن میں چلا گیا، وہ ناشتہ تیار کر چکا تھا مگر فریال ابھی تک سو رہی تھی، اس نے عمر کو اٹھایا اور اسے ناشتہ کروا کر اسکول روانہ کر دیا، عمر کے جانے کے بعد دانش واپس بیڈ روم میں آیا تو فریال تب تک بھی نہیں اٹھی تھی۔

''آج آفس جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' دانش نے فریال کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے سوال کیا تھا، مگر فریال اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ دانش کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔

''فریال اٹھنا نہیں ہے کیا؟'' فریال کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ایک بار پھر دانش نے دریافت کیا تھا۔

اس بار دانش کی آواز فریال کے کانوں میں پڑ گئی تھی اور اس نے آنکھیں کھول دی تھیں، مگر لب اب بھی خاموش تھے، فریال بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی اور کچھ کہنے کی بجائے دانش کو دیکھے جا رہی تھی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' فریال کو خاموش دیکھ کر ایک بار پھر دانش نے پوچھا تھا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس بار فریال بول پڑی تھی۔

''تو آفس نہیں جانا؟''

''نہیں، آج آفس جانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''تو ٹھیک ہے چھٹی کر لو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔''

''تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں...... لگتا ہے رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائی ہو؟'' دانش نے فریال کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بات کی تھی۔

''میں نے کہا ناں مجھے کچھ نہیں ہوا، میں بالکل ٹھیک ہوں، تم خوامخواہ کیوں پریشان ہو رہے ہو۔''

''اچھا ایسا کرتے ہیں ناشتہ تیار ہے دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں پھر جب تک جی چاہے آرام سے سوئی رہنا۔''

فریال نے دانش کی بات کا جواب دینے کی بجائے محض گردن ہلا کر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا، فریال کا اشارہ پاتے ہی دانش وہاں سے اٹھ گیا تھا، جب تک اس نے میز پر ناشتہ لا کر رکھا، تب تک فریال بھی منہ ہاتھ دھو کر وہاں آ بیٹھی تھی، ایک مدت بعد وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، دانش کو فریال پر پیار آ رہا تھا، جبکہ فریال اس سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ایک بار پھر فریال بیڈ پر آ لیٹی تھی، لیٹتے ہی کاشف کی سوچوں نے اسے آ گھیرا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے، وہ اپنے آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنے لگی تھی، کاشف کی اصلیت کھل کر اس کے سامنے آ چکی تھی، اس پر کسی بھی قسم کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی بھی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ خود کو ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے ہر پل تیار رکھا جائے، رونے دھونے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا، اس کے لیے ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی، یہ خیال آتے ہی اس نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا تھا اور اگلے ہی لمحے بیڈ بھی چھوڑ دیا تھا۔

وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل دانش کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی، مگر ایسا کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی، وہ ایک بار پھر الجھ کر رہ گئی تھی، اگر اس کے لیے بات چھپانا مشکل تھا تو بتانا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا، مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ یہ بات دانش سے کب تک چھپا سکتی تھی، آج نہیں تو کل یہ بات کسی نہ کسی ذریعے دانش کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی، مگر تب اس کے لیے اپنی پوزیشن واضح کرنا انتہائی مشکل ہو سکتا تھا۔

دانش صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا، اس نے ٹی وی کی آواز بہت کم کی ہوئی تھی تا کہ فریال ڈسٹرب نہ ہو اور سکون سے سوئی رہے، فریال اس کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

''تم سوئی نہیں؟'' فریال پر نظر پڑتے ہی دانش نے حیران ہو کر دریافت کیا تھا۔

''گئی تو سونے ہی تھی، مگر نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے اٹھ کر تمہارے پاس چلی آئی۔''

''آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔'' دانش نے اپنے پاس ہی فریال کے لیے صوفے پر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

دانش کے کہنے پر فریال خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور دانش پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا تھا' فریال کچھ دیر اسی کیفیت میں خاموش بیٹھی رہی تھی' پھر ہمت کر کے بولی۔ ''میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔'' دانش نے ٹی وی بند کر کے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں جو بات کہنے جارہی ہوں' اسے سننے کے لیے بہت حوصلے کی ضرورت ہے۔''

''تم جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو' کہہ ڈالو...... میں سننے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔''

بات کرنے سے پہلے فریال نے ایک لمبی سانس لے کر چھوڑی تھی' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔

''بات کرنے سے قبل تم سے میری یہ درخواست ہے کہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے میرے متعلق کوئی بھی رائے قائم نہ کرلینا۔''

''میں حیران ہوں کہ تمہیں ایسا کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہورہی ہے پھر بھی تم اس یقین کے ساتھ اپنی بات مکمل کرو کہ مجھے تم پر جو اعتماد اور بھروسہ ہے' اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔''

دانش کی بات نے فریال کو حوصلہ دیا تھا اور وہ اپنے اور کاشف کے بارے میں شروع سے آخر تک ہر وہ بات بتانے لگی تھی' جو اس سے قبل کبھی بھولے سے بھی اس کے لبوں پر نہیں آئی تھی' کاشف نے وعدے کے مطابق انتہائی حوصلے سے فریال کی پوری بات سنی تھی' فریال اپنی بات مکمل کرچکی تو ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی تھی' یوں محسوس ہورہا تھا' جیسے کسی نے ان دونوں سے قوت گویائی ہی چھین لی تھی' دانش سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور ہونٹوں سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کرپایا تھا' وہ کچھ دیر تک اسی حالت میں وہیں بیٹھا رہا' پھر کوئی بھی بات کیے بغیر خاموشی سے وہاں سے اٹھ گیا تھا جبکہ فریال وہیں بیٹھی آنسو بہانے لگی تھی۔

فریال کی باتوں نے دانش کو بری طرح ہلا ڈالا تھا' اس کی اندرونی کیفیت کسی بھونچال کی سی تھی' قریب تھا کہ اسے خود پر قابو نہ رہتا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے' مگر وہ فریال کے سامنے رو کر اس کی نظروں میں خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے وہاں سے اٹھ کر وہ واش روم میں جا گھسا تھا اور خوب جی بھر کر رویا تھا' رو لینے سے جب اس کے اندر کا طوفان قدرے تھم گیا تو وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

کچھ دیر فریال بھی اپنی جگہ پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی' پھر دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور بیڈ روم میں آگئی' جہاں دانش بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا' وہ اس کے پاس ہی جا بیٹھی تھی' مگر دانش نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی' فریال کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے تھے' اس کا خیال تھا کہ شاید دانش اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر اس سے کوئی بات کرے' مگر دانش نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟'' فریال نے روتے ہوئے دانش سے دریافت کیا تھا' مگر دانش نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا' اس لیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی' لیکن دانش اب بھی خاموش تھا۔

''خدا کے لیے دانش کچھ تو کہو۔'' فریال نے ایک بار پھر دانش سے بات کرنے کو کہا تھا۔

''اب کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔'' دانش نے فریال ں طرف دیکھتے ہوئے بات کی تھی۔

''میں مانتی ہوں مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی' م مجھے اس کی جو بھی سزا دینا چاہو دے سکتے ہو' میں اف تک نہیں کروں گی' مگر تمہاری خاموشی مجھ سے اشت نہیں ہو پائے گی۔'' فریال ایک بار پھر سک پڑی تھی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں' تمہیں ایسا کرنے کی ورت کیوں محسوس ہوئی؟ ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے' تمہیں میرے بارے میں نہیں تو کم کم اپنے معصوم بچوں کے بارے میں ہی سوچ لینا چاہیے تھا؟''

''مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری سوچ غلط تھی لیکن سچ پوچھو تو مجھے خود بھی پتہ نہیں چلا کہ میں ان کے بچھائے ہوئے جال میں کس طرح پھنستی چلی گئی۔''

''کہیں یہ وہی تو نہیں جس کے لیے تم۔'' دانش نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بات کی تھی' مگر اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی نامکمل بات کو بھی وہ پوری طرح سمجھ گئی ہوگی۔

''ہاں' مگر تب بات اور تھی' لیکن اب اس کی اصلیت کھل کر میرے سامنے آچکی ہے اور میری آنکھوں میں سجے خواب بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوچکے ہیں۔''

''لیکن' اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ دولت کی چمک اور دلفریب خواب دیکھ کر میں بھٹک گئی تھی مگر خدا کے لیے میری پاکیزگی پر کبھی کوئی شک نہ کرنا۔ خدا گواہ ہے' میں نے تمہاری امانت میں کبھی خیانت نہیں کی۔''

......☆☆☆......

انتہائی سوچ بچار کے بعد فریال نے کاشف سے ملاقات کا پروگرام بنایا تھا اور جیسے تیسے دانش کو بھی اپنے ساتھ جانے کے لیے راضی کرلیا تھا' کاشف سے ملاقات کے لیے جانے سے قبل اس نے تحفوں سے بھرے وہ تمام شاپر احتیاط سے اپنے ساتھ لے لیے تھے' جو کاشف نے مختلف مواقع پر کسی نہ کسی بہانے اسے دیے تھے' جنہیں فریال نے اب تک جوں کا توں سنبھال رکھا تھا' اس نے خود کو ہر طرح سے مضبوط کرلیا تھا' وہ آنے والے خطرے کی ہر گھڑی کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرچکی تھی' مگر پھر بھی احتیاط انتہائی ضروری تھی' اسی لیے اس نے اپنے ساتھ دانش کو بھی جانے کے لیے تیار کیا تھا' تاکہ وہ کسی بھی مرحلے پر کمزور نہ پڑ جائے۔

کاشف کو فریال کے آنے کی خبر مل چکی تھی' فریال نے ہی ملاقات کے لیے کسی ہوٹل یا ریسٹوران کی بجائے میڈم نازیہ کے گھر کا انتخاب کیا تھا' جہاں وہ بے صبری سے اس کا منتظر تھا' فریال' میڈم نازیہ کے ہاں پہنچی تو کاشف کرسی پر بیٹھا کسی سے موبائل پر بات کرنے میں مصروف تھا' اس لیے اس کی نظر فریال پر نہیں پڑی تھی' فریال' دانش کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے خود کاشف کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''جنید۔'' فریال نے جان بوجھ کر کاشف کی بجائے جنید کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

فریال کی زبان سے جنید کا نام سن کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور حیران نظروں سے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا؟'' پھر فریال کا جواب سننے کی بجائے جلدی سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے خود ہی بول پڑا ''یہ...... جنید کون ہے؟''

''برائی کو کوئی بھی نام دے لو' وہ برائی ہی رہتی

ہے، تم خود کو جنید کہو یا کاشف، تمہارے اندر کی غلاظت ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔"

"یہ آج تم کس طرح کی باتیں کررہی ہو؟"

"انجان تو ایسے بن رہے ہو، جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔"

"تمہیں ضرور کسی نے میرے خلاف بہکایا ہے۔"

"کسی بھول میں مت رہنا مسٹر جنید یا کاشف، جو بھی ہو تم کیونکہ میں جانتی ہوں، کسی کو تم نے جنید بن کر برباد کیا اور کسی کی زندگی میں کاشف بن کر انگارے بھر دیے۔"

"ابھی تم میرے بارے میں جانتی ہی کیا ہو اگر وہ سب بتادوں تو تمہاری روح تک کانپ اٹھے۔"

مجھے جاننے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔" فریال نے تلخ لہجے میں بات کی اور پھر کاشف کے دیے ہوئے تحفوں سے بھرے شاپر اس کی طرف اچھالتے ہوئے چیخی۔ "سنبھالو اپنی دی ہوئی وہ قیمتی اشیاء، جنہیں تم تحفے کا رنگ دے کر مجھے خریدنے چلے تھے مگر یہ بھول گئے تھے کہ سبھی لڑکیاں بکاؤ مال نہیں ہوتیں کچھ تمہاری چکنی چپڑی باتوں کو پیار جان کر تمہارے بہلاوے میں ضرور آجاتی ہوں گی، جس طرح میں تمہاری مکاری اور عیاری کو سمجھ نہ پائی اور راہ سے بھٹک گئی تھی۔"

"بس، بہت ہوگیا ڈرامہ۔" کاشف نے غصے سے کہا تھا۔

"ڈرامہ تو اب تک تم کرتے رہے ہو، کیا میں پوچھ سکتی ہوں، تمہاری نظر میں یہی محبت ہے؟"

"محبت؟" کاشف چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بات کررہا تھا "کس محبت کی بات کر رہی ہو تم، یہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ سب اپنے اپنے داؤ میں لگے ہوئے ہیں اگر تم میری باتوں کو محبت کا نام دے بیٹھی ہو تو یہ تمہاری اپنی سوچ ہے، اس میں میرا کوئی گناہ نہیں۔"

"بند کردو یہ سب کچھ، آخر کب تک معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلتے رہو گے، میری ایک بات یاد رکھنا، اگر تم اپنے ان کرتوتوں سے باز نہ آئے، تو میں آنٹی نازیہ کے سامنے تمہارے چہرے سے نقاب اتار پھینکوں گی۔"

"آنٹی......نازیہ۔" کاشف نے آنٹی نازیہ کے نام پر زور دیتے ہوئے کہا اور بولا "یہ شوق بھی پورا کرلو مگر کسی بھول میں نہ رہنا، تمہاری آنٹی نازیہ کے ہی مہرے ہیں ہم سب اور جو بھی کرتے ہیں، انہی کے حکم اور خواہش کے مطابق کرتے ہیں۔"

"کچھ تو شرم کرو، کیوں اس فرشتہ صفت خاتون پر کیچڑ اچھال رہے ہو؟"

"سو شیطان اکٹھے ہو جائیں تو ایک میڈم نازیہ بنتی ہے، جسے تم فرشتے کا درجہ دے رہی ہو، وہی تو ہے جو نوخیز کلیوں کا انتخاب کرتی ہے مگر میں حیران ہوں کہ تمہارے معاملے میں اس سے بھی کیسے بھول ہوگئی لیکن پھر سوچتا ہوں، اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں، تم حسن کے معاملے میں مالا مال ہی اس قدر ہو کہ کوئی جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ تم شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہو یقین کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔"

میڈم نازیہ کے بارے میں کاشف کے انکشافات نے فریال کو بری طرح ہلا ڈالا تھا، اس کے بدن میں کپکپی پھیل گئی تھی، قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی، اس لیے دانش نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں تھام لیا تھا اور یوں وہ گرنے سے بچ گئی تھی۔ کاشف کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ وہاں آتے ہوئے اپنے شوہر کو بھی ساتھ لائی ہوگی، مگر اسے اچانک اپنے سامنے پاکر بات بڑھ جانے کے خوف سے وہاں مزید رکے بغیر جلدی سے وہاں سے کھسک گیا تھا، دانش، فریال اور کاشف کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر جان چکا تھا کہ ان کا وہاں ٹھہرے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لیے وہ بھی فریال کو لیے وہاں سے نکل آیا تھا۔

......☆☆☆......

فریال نے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگالی تھی اور مسکرانا بھول گئی تھی، اسے کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، وہ دانش کے بار بار اصرار پر کھانے کے کچھ نوالے زہر مار کرنے کے بعد کسی سے کوئی بات کیے بغیر بیڈ پر جالیٹی تھی، عمر اور علی اس کے دائیں بائیں لیٹے تھے۔ وہ انہیں پیار سے گلے لگانے کی بجائے چھت کو گھورتی رہتی تھی، دانش سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، وہ اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، مگر کسی بھی طرح اس کی خاموشی کو توڑ نہیں پاتا تھا۔

بدنامی کا خوف فریال کے دل میں اس قدر گھر کر چکا تھا کہ وہ ہر وقت ڈری سہمی رہنے لگی تھی، ہر پل اسے اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں میڈم نازیہ، کاشف یا ان کے کارندے اسے یا اس کے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچادیں، وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے، مگر ان لوگوں کے ڈر کی وجہ سے کب تک گھر میں بیٹھا جاسکتا تھا، ایک راستہ یہ بھی تھا کہ ان کی طرف سے کوئی قدم اٹھائے جانے کا انتظار کرنے کی بجائے ان کے خلاف کوئی قانونی کاروائی کی جائے، اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ اس نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور اس سلسلے میں دانش سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"دانش میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔" فریال نے دانش کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر بات کی تھی۔

"ہاں بولو۔" دانش نے اپنی پوری توجہ فریال کی طرف لگاتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں پولیس کو رپورٹ لکھوانی چاہئے۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔"

"اس سلسلے میں مجھے تمہارا ساتھ چاہئے۔"

"مجھے تم ہر قدم پر اپنے ساتھ ساتھ پاؤ گی...... لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"میں سوچ رہا تھا شاہد کو بھی اس سلسلے میں اعتماد میں لے لیتے ہیں، اس کے بہت سے جاننے والے پولیس میں ہیں۔"

"دیکھ لو اگر تم سمجھتے ہو کہ ایسا کرنا مناسب رہے گا تو اس سے بھی بات کرلو لیکن میری خواہش ہے کہ ان بد کردار لوگوں کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے عدالت لے جاؤں۔"

"تم فکر نہ کرو، میں ابھی شاہد سے بات کرتا ہوں۔" دانش نے فریال کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

فریال نے دانش کی بات کا جواب دینے کی بجائے گردن ہلا دی تھی اور صوفے سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

دانش نے شاہد کو آفس سے چھٹی کے بعد اپنے ہاں آنے کو کہا تھا، اس لیے وہ آفس سے گھر جانے کی بجائے سیدھا دانش کے ہاں پہنچ گیا تھا، دانش نے فون پر شاہد سے کوئی تفصیلی بات نہیں کی تھی، اس لیے وہ ابھی تک اسی شش و پنج میں تھا کہ اسے کون سی ضروری بات کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر دانش اور شاہد ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرنے لگے تھے جبکہ پاس ہی فریال گردن جھکا

ئے خاموش بیٹھی تھی۔

"یقیناً تم سوچ رہے ہو گے کہ میں تم سے ایسی کون سی بات کرنا چاہتا ہوں' جس کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔" دانش نے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا تھا۔

"سچ پوچھو تو جب سے تم نے فون پر بات کی ہے' تب سے میں اسی الجھن میں گرفتار ہوں کہ ایسی کون سی بات ہے' جو تم مجھے فون پر بتا نہیں پائے۔"

"یاد ہے تم نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ میرے کئی جاننے والے پولیس میں ہیں۔"

"ہاں بتایا تو تھا مگر تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"کچھ لوگ ایک عورت کی سربراہی میں معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر کسی نہ کسی طرح ان کی تصاویر بنا لیتے ہیں اور پھر انہیں بلیک میل کرتے ہوئے ان کے جسموں کا سودا کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ان سے تمہارا کیا لینا دینا؟"

شاہد کے سوال پر فریال کے دل پر ایک بجلی سی گری تھی اور وہ بری طرح کانپنے لگی تھی' وہ جانتی تھی کہ اب اس کے سوال کے جواب میں دانش جو بات کرے گا' اس کی وجہ سے شاید وہ زندگی بھر کبھی شاہد سے تو کیا کسی اور سے بھی نظریں ملا نہیں پائے گی۔

"یہ سارا کچھ۔" دانش نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر فریال کی طرف دیکھا تھا' جس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا' دانش نے اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر ایک لمبی سانس چھوڑی اور پھر سے بات کرنے لگا تھا۔

"یہ سارا کچھ...... فریال کی دوست اور کولیگ زارا کے ساتھ بھی ہو چکا ہے...... جس نے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی' وہ فریال کی بچپن کی دوست تھی' اس لیے اٹھتے بیٹھتے اس کے لبوں پر اسی کا ذکر رہتا ہے' ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کروا دیں' تا کہ وہ گرفتار ہوں اور کسی اور معصوم کی زندگی ان کے ہاتھوں برباد نہ ہو۔"

دانش کی بات سن کر فریال نے سر اٹھا کر اس کا بھرم رکھنے پر شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا' مگر لب پھر بھی خاموش تھے۔

شاہد نے دانش کی بات پوری توجہ سے سنی تھی' اس کے دل سے بھی یہی آواز اٹھی تھی کہ ایسے سنگ دل لوگوں کے کرتوت کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کیے رکھنا گناہ عظیم تھا۔ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے اگر وہ کسی کام آ سکتا تھا' تو اس میں حرج ہی کیا تھا۔

"جس علاقے کی تم بات کر رہے ہو' اسی علاقے کے تھانے میں میرا دوست سب انسپکٹر ہے' ہم کل ہی اس سے مل لیتے ہیں' آج رات میں اس سے فون پر بھی بات کر لوں گا۔ امید ہے وہ ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرے گا۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد شاہد نے بات کی تھی۔

"سچ پوچھو تو یہ بہت بڑی نیکی ہو گی۔"

"بس تم بے فکر رہو...... خدا نے چاہا تو نیکی کا یہ کام ہمارے ہی ہاتھوں ہو گا۔" شاہد نے دانش کو تسلی دیتے ہوئے کہا' پھر فریال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ بھی بے فکر ہو جائیں بھابی...... آپ کی دوست کے ساتھ زیادتی کرنے والے لوگ اب زیادہ دن تک قانون کی گرفت سے بچ نہیں پائیں گے۔"

فریال نے شاہد کی بات کے جواب میں محض گردن ہلا دی تھی' کیونکہ اگر وہ کوئی بات کرتی تو اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو چھلک پڑتے' اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا' اس لیے وہ

وہاں سے اٹھ کر بیڈ پر جا لیٹی تھی اور اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا' فریال کے وہاں سے اٹھ جانے کے بعد بھی دانش اور شاہد کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔

"ایک سوال کافی دیر سے مجھے پریشان کر رہا ہے...... اگر کہو تو پوچھوں؟" شاہد نے باتوں کے درمیان ذرا سا وقفہ پاتے ہی انتہائی محتاط انداز میں بات کی تھی۔

"جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو' اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"وہ...... وہ اس روز...... جو میں نے گاڑی والے نوجوان کی بات کی تھی...... کیا تم نے اس سلسلے میں بھابی سے پوچھا تھا؟" شاہد نے ڈرتے ڈرتے رک رک کر سوال کیا تھا۔

شاہد کے سوال پر دانش کے پسینے چھوٹ گئے تھے' مگر اس نے کمال ہوشیاری سے اپنی حالت شاہد پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی اور فوری طور پر خود کو نارمل کرتے ہوئے بولا تھا۔ "وہ تو فریال کے آفس کی ہی گاڑی تھی اور وہ نوجوان بھی اس کا کولیگ تھا...... ان کے باس نے ہی دو چار بار انہیں کسی سلسلے میں آفس سے باہر بھیجا تھا۔"

دانش کی بات سن کر شاہد نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا اور کچھ دیر بعد وہاں سے نکل گیا تھا۔

پروگرام کے مطابق انسپکٹر سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلتے ہوئے فریال نے بھی ساتھ جانے کو کہا تھا' لیکن دانش کو فریال کا ساتھ جانا کچھ مناسب نہیں لگتا تھا' اس لیے اس کے کہنے پر فریال نے جانے کے لیے زیادہ ضد نہیں کی تھی' دانش اور شاہد' انسپکٹر کے سامنے جا بیٹھے تھے اور پھر انسپکٹر کے دریافت کرنے پر میڈم نازیہ اور اس کے طریقہ واردات کے بارے میں تمام تر تفصیل بیان کر ڈالی تھی' مگر اس نے اپنی باتوں میں کہیں بھی فریال کا نام نہیں لیا تھا۔

"ذاتی طور پر تو مجھے آپ کی باتوں کی سچائی سے کوئی انکار نہیں' لیکن قانون ہر معاملے میں ثبوت مانگتا ہے' یہ بات آپ کے علم میں بھی یقیناً ہو گی کہ میڈم نازیہ اس علاقے کی ان چند خواتین میں سے ایک ہیں' جن کا نام سوشل حوالوں سے انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے' اگر ہم محض سنی سنائی باتوں کو بنیاد بنا کر ان پر ہاتھ ڈالیں گے تو ایک ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا' جسے سنبھالنا ہمارے لیے انتہائی مشکل ہو جائے گا' ویسے بھی اس کے تعلقات جس لیول تک ہیں' کوئی بھی ان کے خلاف کسی قسم کا بھی ایکشن لینے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔" دانش کی بات بغور سننے کے بعد انسپکٹر نے جواب دیا تھا۔

"میں یہ کیسے مان لوں کہ جس علاقے میں ایک منظم گروہ' نوجوان اور بھولی بھالی لڑکیوں کو بلیک میل کر کے ان سے جسم فروشی کا کام لیتا ہو اور علاقے کی انتظامیہ اس سے بے خبر ہو۔" دانش نے قدرے تلخی سے بات کی تھی۔

"میرا تو خیال تھا کہ آپ تعلیم یافتہ اور سمجھدار شخص ہیں' میری باتوں کی گہرائی تک پہنچ گئے ہوں گے' لیکن آپ پھر بھی اپنی بات پر بضد ہیں مگر اس سلسلے میں مجھے جو کہنا تھا' وہ میں نے کہہ دیا' آپ چاہیں تو اپنی تسلی کے لیے ایس پی یا ایس ایس پی صاحب سے مل کر دیکھ لیں۔" بات کرتے ہوئے انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ٹیبل سے اپنی کیپ اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے کسی ملزم کی گرفتاری کے لیے جانا ہے' اس لیے اجازت چاہوں گا۔"

انسپکٹر کے اٹھتے ہی ان دونوں نے بھی اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ دی تھیں اور تھانے سے باہر نکل آئے

تھے۔

"تم تو کہتے تھے انسپکٹر میرا بہت اچھا دوست ہے' مگر اس نے تو ہماری بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔" دانش نے تھانے سے نکلتے ہی شاہد سے شکوہ کیا۔

"جو بات آج اس نے تمہارے سامنے کی ہے' وہی بات اس نے مجھے رات کو فون پر بھی کہہ دی تھی' مگر تمہاری تسلی کے لیے' میں وہ باتیں تمہیں اس کے منہ سے سنوانا چاہتا تھا اسی لیے میں نے انسپکٹر کے انکار کے باوجود تمہیں اس کے سامنے لا بٹھایا تھا جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو' انسپکٹر نے مجھے رات کو ہی اس معاملے میں خاموش رہنے کو کہا تھا...... اس کا کہنا تھا کہ میڈم نازیہ کی مٹھی میں ایسے ایسے بااثر افراد کی جان قید ہے کہ اگر کسی نے بھولے سے بھی اس کی طرف ہاتھ اٹھایا تو وہ اسے تباہ و برباد کر ڈالے گی۔"

شاہد کی بات نے دانش کو مزید مایوس کر ڈالا تھا' اس لیے وہ کوئی بات کرنے کی بجائے خاموشی سے گردن جھکائے کھڑا تھا' مگر اگلے ہی لمحے اس کی خاموشی کو زبان مل گئی تھی اور وہ ہمت کر کے بولا تھا

"کیوں ناں' ہم ایس پی صاحب سے بات کر کے دیکھ لیں؟"

"ہاں...... حرج تو کوئی نہیں...... مگر۔"

"بس اب کوئی اگر مگر نہیں' یہاں سے ہم سیدھے ایس پی صاحب کے آفس جائیں گے۔" دانش نے دوٹوک لہجے میں بات کی تھی۔

شاہد کو دانش کی بات سے اتفاق نہیں تھا مگر اس نے کسی بحث میں الجھے بغیر اپنا رُخ ایس پی آفس کی طرف موڑ لیا تھا۔

ایس پی صاحب سے ملنا آسان کام نہیں تھا' مگر یہاں بھی شاہد کے تعلقات کام آئے اور ایس پی صاحب سے ملاقات کا وقت مل گیا تھا' دانش نے ان کے سامنے بھی وہ تمام باتیں دہرائی تھیں' جو وہ اس سے قبل انسپکٹر کو بتا چکا تھا۔

"ویسے آج تک ہمیں میڈم نازیہ کے بارے میں کسی نے بھی کبھی کوئی ایسی شکایت نہیں لکھوائی اور نہ ہی ہمیں کوئی ایسی رپورٹ ہی ملی ہے لیکن آپ اطمینان رکھیں' اگر ایسا کچھ ہوا' جیسا آپ کہہ رہے ہیں' تو ان کے تعلقات جتنے بھی اوپر تک ہوں' قانون کی گرفت سے نہیں بچ پائیں گی۔" ایس پی صاحب نے تمام باتیں بغور سننے کے بعد یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا تھا۔

ایس پی صاحب کی باتوں نے دانش کو ذہنی طور پر مطمئن کر ڈالا تھا' اس لیے اس نے ان سے زیادہ بحث نہیں کی تھی اور دونوں دوست وہاں سے نکل آئے تھے اور پھر باہر آ کر اپنے اپنے گھروں کی جانب چل پڑے تھے۔

دانش گھر پہنچا تو فریال اس کے انتظار میں بیٹھی تھی' فریال چاہتی تھی کہ وہ ایک ہی سانس میں وہ تمام باتیں بتا ڈالے جو وہ انسپکٹر سے کر کے آیا تھا' جبکہ دانش تھکا ہارا گھر لوٹا تھا اور کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا' مگر اس سے فریال کی بے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی' اس لیے اس نے انسپکٹر اور ایس پی سے ہونے والی تمام تر گفتگو فریال کو سنا ڈالی تھی گو کہ دانش ایس پی صاحب کی باتیں سن کر انتہائی مطمئن ہو کر گھر لوٹا تھا مگر فریال جان گئی تھی کہ پولیس میڈم نازیہ کے خلاف کسی قسم کا کوئی بھی ایکشن نہیں لے گی' مگر اس نے اپنے اندر کی بات زبان پر نہیں آنے دی تھی اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وقت نے فریال کے ساتھ عجیب سنگین مذاق کیا تھا' وہ جانتی تھی کہ میڈم نازیہ اتنی آسانی سے خاموش نہیں بیٹھے گی' کسی بھی دن بدنامی کا داغ اس کے ماتھے پر اس طرح لگ جائے گا جو کسی طرح دھل نہیں پائے گا' پولیس کی طرف سے مایوس ہونے پر اس نے میڈم نازیہ کو بے نقاب کرنے کی مکمل منصوبہ بندی کر لی تھی' انتہائی بھاگ دوڑ اور تلاش کے بعد بمشکل وہ کچھ ایسی لڑکیوں تک پہنچ پائی تھی' جو میڈم نازیہ کی مکارانہ چالبازیوں کا نشانہ بنی تھیں' وہ انہیں ساتھ لے کر کسی اعلیٰ عہدے دار کے پاس جانا چاہتی تھی' مگر مزید بدنامی کے خوف سے ان میں سے کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوئی تھی۔

وہ میڈم نازیہ کا شکار ہونے والی لڑکیوں کی تلاش میں جہاں بھی گئی' وہیں اسے دل ہلا دینے والی ایک نئی داستان سننے کو ملی تھی' ان میں سے کسی کی منگنی ٹوٹ گئی تھی' کسی کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا تھا' کسی نے موت کو گلے لگا لیا تھا اور کسی کے والدین نے خودکشی کر لی تھی' کئی لڑکیاں لوگوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کا سامنا کرنے سے بچنے کی غرض سے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھیں' کچھ ایسی بھی تھیں' جنہوں نے اسی پیشے کو اپنا لیا تھا اور اپنے جسم کو فروخت کرنے سے ہونے والی آمدن سے اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے لگی تھیں' گھر والوں کی ضروریات با آسانی پوری ہو رہی تھیں' اس لیے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور کبھی بھولے سے بھی اپنی بیٹی سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ رقم کہاں سے آتی تھی۔

ہاتھ میں آیا ہوا شکار چھوٹ جانے پر میڈم نازیہ خاموش بیٹھنے والی کہاں تھی' اس نے وہی کچھ کیا تھا' جس کے لیے اسے پہلے سے ڈرایا دھمکایا جاتا رہا تھا' دانش گھر کے لیے کچھ ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے باہر نکلا تھا' مگر وہ جہاں سے گزرتا تھا' لوگ عجیب نظروں سے اسے دیکھ کر اشارے کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے' لوگوں کے رویے نے اسے پریشان کر ڈالا تھا' اسے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی' وہ جان گیا تھا کہ کچھ تو ایسا ضرور ہوا ہے' جو لوگ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے' وہ راہ چلتے ہوئے کسی سے بھی نظریں ملا نہیں پا رہا تھا' اس کی نگاہیں اس خوف سے زمین میں گڑی ہوئی تھیں کہ راہ چلتے کہیں کوئی جان پہچان والا اسے روک کر کوئی سوال نہ کر ڈالے' اس کے پاؤں منوں بھاری ہو گئے تھے' مگر پھر بھی وہ جیسے تیسے قدم اٹھاتا ہوا آہستہ آہستہ بازار کی طرف بڑھ رہا تھا' پھر اچانک ایک آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی تھی۔ "دیکھنے میں تو بہت شریف لگتا تھا' مگر آج پتہ چلا کہ گھر بیٹھ کر بیوی کے جسم کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔" جیسے ہی اس کے کانوں میں اس قسم کی آوازیں پڑیں تو اس کے پاؤں مزید بوجھل ہوتے چلے گئے اور اس کے لیے ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہو گیا تھا' آگے بڑھنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا' اس لیے اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا اور جیسے تیسے گھر لوٹ آیا۔

"تم تو بازار سے کچھ سامان لینے گئے تھے' پھر خالی ہاتھ کیوں لوٹ آئے؟" فریال نے دانش کے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

"پھر کبھی لے آؤں گا۔" دانش نے فریال کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں؟" دانش کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر فریال نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

"تم تو خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"کسی اور سے تو شاید تم خود کو چھپا بھی لو' مگر تم خود کو مجھ سے نہیں چھپا سکتے۔ سچ سچ بتاؤ' ہوا کیا ہے۔"

دانش' فریال کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا کہ جب تک وہ اس سے بات اگلوا نہیں لے گی' تب تک چین سے نہیں بیٹھے گی' اس لیے اسے وہ

سب کچھ بتانا پڑا‘ جسے چھپانے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا‘ دانش کی بات سن کر فریال کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ صوفے پر ڈھیر ہوگئی تھی‘ اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

”کاش ......میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مرگئی ہوتی۔“ فریال نے روتے ہوئے کہا تھا۔

”اس طرح رونے دھونے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں‘ تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں‘ تو پھر پریشانی کیسی؟“ دانش نے فریال کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بات کی تھی‘ ورنہ وہ بھی پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔

”پھر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”کیسا وعدہ؟“

”ہماری زندگی میں کیسا بھی طوفان آجائے‘ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔“

”اچھا ساتھی وہ نہیں ہوتا‘ جو زندگی کی کشتی کامیابی سے رواں دواں ہو تو ساتھ ہو‘ مگر جیسے ہی کشتی کسی طوفان میں گھرتی ہوئی دکھائی دینے لگے تو وہ ساتھ چھوڑ جائے۔ جب تم اچھے برے وقت میں میرا ساتھ نبھاتی آئی ہو‘ تو میں بھلا تمہارے برے وقت میں تمہیں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

”میں میڈم نازیہ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”اب ہمیں ان سے مل کر کیا کرنا......وہ جو کر سکتے تھے‘ انہوں نے کرلیا......تم کہو تو تمہاری خاطر میں یہ گھر‘ یہ محلہ‘ یہ شہر بھی چھوڑ سکتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں‘ وہ لوگ بہت پہنچ والے ہیں‘ لیکن معصوم اور بھولی بھالی لڑکیاں کب تک ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنتی رہیں گی‘ کسی کو تو آگے آنا ہوگا‘ کسی کو تو اس برائی کو روکنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ہوگا‘ ورنہ جانے کب تک فرار کی کوئی راہ نہ پاکر مجبور و بے بس نوجوان لڑکیاں موت کو گلے لگاتی رہیں گی۔“

”تم برائی کے خلاف پہلا قدم اٹھاؤ‘ کوئی اور ساتھ ہو نہ ہو‘ میں ہر قدم پر سائے کی طرح تمہارے ساتھ ہوں گا۔“

دانش کی باتوں نے فریال کو حوصلہ دیا تھا‘ اس کے آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی تھی‘ اس لیے وہ دانش کی بات کا کوئی جواب دے نہیں پائی تھی۔

......☆☆☆......

دل کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ نے فریال کو رات بھر ایک پل کے لیے بھی سونے نہیں دیا تھا‘ میڈم نازیہ کے جس وار سے اب تک وہ خوف زدہ تھی‘ وہ وار چل چکا تھا‘ اس لیے اب وہ باآسانی میڈم نازیہ کا سامنا کر سکتی تھی‘ اس نے کسی نہ کسی طرح میڈم نازیہ کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں‘ میڈم نازیہ سے ملاقات کے لیے اس نے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا‘ جب وہ بلا روک ٹوک جب تک چاہے اس سے بات کر سکتی تھی‘ وہ گھر کے اندر میڈم نازیہ کے پاس تنہا گئی تھی اور جان بوجھ کر دانش کو گھر سے کچھ فاصلے پر انتظار کرنے کو کہا تھا۔

فریال کو دیکھتے ہی میڈم نازیہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ ”میں جانتی تھی‘ تم میرے ایک چھوٹے سے وار کو بھی برداشت نہیں کر پاؤ گی۔“ میڈم نازیہ نے فریال کو سامنے پاکر اپنی کامیابی پر جھومتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ تمہاری بھول ہے‘ اس بھول کو اپنے دل سے نکال دو کہ میں تمہارے کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے یہاں آئی ہوں گی۔ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ذرا دیکھوں تو سہی‘ ایک عورت دوسری عورت کے لیے ذلت اور رسوائی کا سامان پیدا کرکے کس قدر ...ں محسوس کرتی ہے۔“ فریال نے بلاخوف میڈم نازیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حوصلے سے بات کی تھی۔

”یہ تو تم جان ہی گئی ہوگی کہ یہ میرا بزنس ہے اور بزنس میں کامیاب وہی ہوتا ہے‘ جو مارکیٹ کی ڈیمانڈ کو دیکھتے ہوئے ایسی جنس کا کاروبار کرے‘ جو ہاتھوں ہاتھ بک جائے اپنے اس کاروبار کی کامیابی کے لیے مجھے جو بھی قدم اٹھانا پڑا‘ میں نے اٹھایا جو بھی گر آزمانا پڑا‘ میں نے آزمایا‘ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہر کے نام نہاد شرفاء‘ میڈم نازیہ کی دہلیز پر اپنا ماتھا رگڑتے ہیں۔“

”تم عورت ہو کر عورت کی تذلیل کا سامان پیدا کرتی ہو؟“

”میں عورت بن کر نہیں‘ ایک بزنس ویمن بن کر سوچتی ہوں اور ہمیشہ وہی کرتی ہوں‘ جس میں میرا فائدہ ہو اور میرا کاروبار ترقی کرے‘ میں پہلے انویسٹمنٹ کرتی ہوں اور جس قدر ضرورت پڑے رقم خرچ کرتی ہوں‘ تب کہیں جاکر مجھے ریٹرن ملنے لگتا ہے۔“

”میں حیران ہوں‘ دوسروں کی بیٹیوں کے جسموں کا سودا کرتے ہوئے‘ تمہارا دل کیوں نہیں کانپتا‘ تمہارا جگر ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہیں ہوجاتا۔“

”زبان کو لگام دو لڑکی......کیا تھانوں کے چکر لگانے کے بعد بھی تمہیں میری طاقت اور پہنچ کا اندازہ نہیں ہوا؟“

”واہ! کیا انداز گفتگو ہے‘ میں تو تمہاری قلابازیوں کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں‘ کل تک تو میں بیٹی تھی اور آج اچانک بیٹی کے مرتبے سے گر کر عام سی لڑکی بن گئی ہوں۔“

”اس سے پہلے کہ میں کچھ کر بیٹھوں‘ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ یہاں سے نکل جاؤ مگر جاتے جاتے یہ سنتی جانا کہ تمہارے لیے اب دو ہی راستے ہیں‘ جن میں سے ایک راستہ قبرستان کی طرف جاتا ہے اور دوسرا تمہیں مجھ تک پہنچا سکتا ہے اب فیصلہ تم نے کرنا ہے‘ زندگی چاہیے یا موت۔“ میڈم نازیہ نے اپنی بات مکمل کی اور فریال کا جواب سنے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

فریال نے میڈم نازیہ کا اصل چہرہ دیکھ لیا تھا اور یہ سوچ کر کسی گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی تھی کہ انسانوں نے اپنے چہروں پر کیسے کیسے نقاب چڑھا رکھے تھے‘ کوئی ان کا اصلی چہرہ بمشکل ہی دیکھ پاتا تھا‘ وہ اس قدر خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کب ایک شخص ہاتھ میں پمپ ایکشن پکڑے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا‘ اسلحہ بردار شخص کو دیکھ کر فریال کے پورے بدن میں سنسنی پھیل گئی تھی اور وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”بی بی یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میڈم ہم سے ناراض ہوں گی۔“ اسلحہ بردار شخص نے رعب دار آواز میں فریال کو حکم دیا تھا۔

فریال وہاں رک کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی‘ اس لیے کسی احتجاج کے بغیر وہاں سے چل پڑی تھی۔

”اور بی بی‘ جاتے جاتے ایک بات اور سنتی جاؤ۔“

اسلحہ بردار شخص کی آواز فریال کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چلتے چلتے رک گئی تھی۔

”میڈم کا کہنا ہے کہ آج تو تم یہاں سے زندہ واپس جارہی ہو‘ لیکن آج کے بعد پھر کبھی اس گھر کے آس پاس بھی دکھائی دو تو تمہیں گولی ماردی جائے۔“ اسلحہ بردار شخص نے اپنی سرخ اور گول گول آنکھوں کو گھماتے ہوئے خبردار کیا تھا۔

فریال اس شخص کی بات مکمل ہوتے ہی وہاں سے نکل کر تیزی سے باہر آ گئی تھی، جہاں دانش پریشانی کے عالم میں بے چینی سے اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

......☆☆☆......

فریال جس بے قراری کی سی کیفیت سے گزر رہی تھی، اسے کسی بھی طرح قرار نہیں آ رہا تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے خیالوں میں گم رہنے لگی تھی، اس کا موبائل اس کے پاس ہی بیڈ پر پڑا تھا، کتنی ہی دیر سے موبائل پر بیل ہو رہی تھی، مگر اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا، فون کرنے والا بیل ختم ہونے پر پھر سے نمبر ملاتا اور یوں ایک بار پھر موبائل بج اٹھتا تھا، کافی دیر کے بعد فریال کو احساس ہوا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بج رہی تھی، احساس ہونے پر اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو کسی انجانے نمبر سے کال آ رہی تھی، ابھی وہ اسی سوچ میں الجھی ہوئی تھی کہ فون اٹینڈ کرے یا نہ کرے کہ فون بند ہو گیا تھا، اس نے موبائل پر دیکھا تو پانچ مس کالز آئی ہوئی تھیں۔

ابھی وہ کال کرنے والے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک بار پھر موبائل پر بیل ہونے لگی تھی، اس بار فریال نے بیل ہوتے ہی فون اٹینڈ کر کے کان کو لگا لیا تھا، مگر زبان سے کچھ نہیں بولی تھی۔

''اگر آپ میڈم نازیہ سے ملنا چاہتی ہیں تو کسی بھی روز نیشنل اسپتال میں مل سکتی ہیں، وہ ہر روز شام پانچ بجے وہیں ہوتی ہیں۔'' نسوانی آواز میں اسے پیغام دیا گیا تھا، اور اس کی طرف سے کوئی بھی سوال اٹھانے سے پہلے ہی فون کاٹ دیا گیا تھا۔

موبائل پر ملنے والے پیغام نے فریال کو الجھا کر رکھ دیا تھا، وہ سوچنے لگی تھی کہ آخر اس کا ایسا کونسا ہمدرد تھا، جس نے میڈم نازیہ کے بارے میں اسے اطلاع دی تھی، وہ اس پہلو پر بھی غور کرنے لگی تھی کہ کہیں یہ میڈم نازیہ کی کوئی چال ہی نہ ہو، جس نمبر سے فون کیا گیا تھا، اپنی تسلی کے لیے اس نے اس نمبر پر کال بیک کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کسی کال سنٹر کا نمبر تھا۔

فریال نے انتہائی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ وہ ایک بار اپنی تسلی کے لیے بتائے ہوئے وقت پر نیشنل اسپتال ضرور جائے گی، مگر وقت مقررہ سے قبل وہ ایک بار وہاں جا کر اسپتال کے اردگرد کا جائزہ لے لینا چاہتی تھی، تھوڑی ہی دیر میں وہ جان گئی تھی کہ اسپتال زیادہ بڑا نہیں تھا، اسپتال کے اندر جانے اور باہر آنے کا ایک ہی راستہ تھا، پانچ بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا جب وہ مکمل جائزہ لینے کے بعد فارغ ہو کر اسپتال کے مین گیٹ سے تھوڑا سا ہٹ کر ایک ایسی جگہ پر آ بیٹھی تھی جہاں سے وہ اسپتال کے اندر آنے جانے والوں پر با آسانی نظر رکھ سکتی تھی، جیسے جیسے گھڑی کی سوئی پانچ بجے کی طرف بڑھ رہی تھی، اسی قدر اس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

ادھر گھڑی نے پانچ بجائے ادھر ایک گاڑی پارکنگ ایریا میں آ کر رکی تھی، فریال کی نظر اس گاڑی پر جا ٹھہری تھی، جس میں ڈرائیونگ سیٹ پر میڈم نازیہ بیٹھی تھی، پیغام رساں کا پیغام سچ ثابت ہوا تھا، لیکن وہ سوچنے لگی تھی کہ آخر میڈم نازیہ اس اسپتال میں ہر شام کیا کرنے آتی تھی، وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ میڈم نازیہ گاڑی سے نکل کر اسپتال کے اندر چلی گئی تھی، وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئی تھی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور میڈم نازیہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی، اس نے اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی، اس لیے مایوس ہو کر کچھ دیر بعد ہی گھر لوٹ آئی تھی۔

اگلے روز شام کے پانچ بجنے کا انتظار اس نے انتہائی شدت سے کیا تھا، اسی لیے وہ چوبیس گھنٹے سولی پر لٹکنے جیسی کیفیت میں گزرے تھے، اب کی بار اس نے باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کی بجائے اسپتال کے اندر داخل ہو کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا، جہاں سے وہ میڈم نازیہ کو دیکھ کر با آسانی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اس کی منزل تک با آسانی جا سکتی تھی، حیران کن بات تھی کہ اس روز بھی اسپتال میں کام کرنے والے کسی وقت کے پابند ملازم کی طرح ٹھیک پانچ بجے میڈم گیٹ سے داخل ہو رہی تھی، وہ جیسے ہی تھوڑا سا آگے بڑھی، فریال بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

میڈم نازیہ راہ داری سے گزرتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، راہ داری کے دونوں طرف کمرے تھے، جن کے دروازوں پر ان کے نمبر تحریر تھے، وہ ایک کمرے کے دروازے پر جا کر رک گئی تھی، پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی تھی، فریال نے آگے بڑھ کر دیکھا تو دروازے پر مریضہ کا نام امبر لکھا ہوا تھا، فریال کے لیے کمرے کے اندر جانا ممکن نہیں تھا، اس لیے وہ وہیں کھڑی اس گتھی کو سلجھانے میں لگ گئی تھی کہ کمرے میں وہ کون تھا، جس کے لیے میڈم نازیہ باقاعدگی سے اسپتال آتی تھی، فریال سوچتے سوچتے بے خیالی میں اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی، جس میں کچھ دیر قبل میڈم نازیہ گئی تھی، اس نے کھڑکی کا پردہ سرکنے کی آواز سنی تھی، اس لیے پھرتی سے کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

وہ کچھ دیر تک وہیں دیوار سے لگی کھڑی رہی تھی، پھر کمرے کا جائزہ لینے کے لیے اس نے محتاط انداز سے کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا تھا، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ وہاں بیڈ پر ایک معصوم سی شکل و صورت کی نوجوان لڑکی لیٹی تھی، اس کے پاس ہی میڈم نازیہ کرسی پر بیٹھی تھی، اس نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور ادھر ادھر سے بے خبر اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی، وہ کچھ دیر تک وہیں کھڑی اندر کا منظر دیکھ کر کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی، مگر جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہاں سے واپس آ گئی۔

......☆☆☆......

دانش کے سمجھانے کے باوجود بھی کچھ روز تک فریال آفس جانے کے لیے رضامند نہیں ہوئی تھی، لیکن جب بلاوجہ روز روز گھر سے نکلنا مشکل ہوا تو وہ بے دلی سے سہی مگر باقاعدگی سے آفس جانے لگی تھی، اس نے اپنی عادت بنا لی تھی کہ آفس سے نکل کر اسپتال پہنچ جاتی اور کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑی کمرے کے اندر کے ماحول کا جائزہ لیتی رہتی تھی، اس نے جب بھی دیکھا تھا، میڈم نازیہ کو امبر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے آنسو بہاتے دیکھا تھا، وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی آنسو بہائے جاتی تھی، پھر جب رو رو کر تھک جاتی تو خاموشی سے اٹھتی اور امبر کا ماتھا چوم کر کمرے سے باہر نکل جاتی تھی، پریشان کن بات یہ تھی کہ فریال نے ان دونوں کو آپس میں کبھی بھی بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

فریال الجھ کر رہ گئی تھی، لگاتار کئی روز تک وہاں آنے کے باوجود وہ میڈم نازیہ اور اس خوب صورت دوشیزہ کے تعلق کو سمجھ نہیں پائی تھی، اس لیے اس نے کسی نہ کسی بہانے کسی نرس یا ڈاکٹر کے ذریعے میڈم نازیہ اور امبر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! اگر میں غلطی پر نہیں تو کمرہ

نمبر 108 میں میڈم نازیہ ہی کسی مریضہ سے ملنے آتی ہیں ناں؟'' موقعہ پاکر معلومات حاصل کرنے کی غرض سے فریال نے بات کی تھی۔

''آپ میڈم نازیہ کو جانتی ہیں؟'' ڈاکٹر نے فریال کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اسے سوال کرڈالا تھا۔

''انہیں کون نہیں جانتا۔'' فریال نے جان بوجھ کر گول مول بات کی تھی۔

''کمرہ نمبر 108 میں جو امبر نام کی مریضہ ہے' وہ میڈم نازیہ کی بیٹی ہے۔''

''بیٹی؟''

''جی ہاں !ان کی اپنی بیٹی' وہ پچھلے دوسال سے یہاں زیر علاج ہے اس کی آنکھیں تو حرکت کرتی ہیں مگر لب خاموش ہیں۔ وہ مجبوری و بے بسی کی زندہ مثال ہے' وہ نہ بول سکتی ہے' نہ کچھ کھاپی سکتی ہے اور نہ ہی اٹھ کر چل پھر سکتی ہے۔ وہ ایک ایسی زندہ لاش ہے' جس کی سانسیں چل رہی ہیں۔''

''کیا وہ پیدائش سے ہی اس حال میں ہے؟''

''نہیں' امبر کی یہ حالت اس حادثے کے بعد ہوئی تھی' جس میں میڈم نازیہ کا شوہر اور بیٹا اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔''

امبر کے بارے میں جان کر فریال کو دلی دکھ ہوا تھا' اس لیے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی' مگر وہ یہ سوچ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی کہ وہ عورت جو زمانے کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچانے کے دعوے کرتی ہے' بیٹی کے معاملے میں کس قدر بے بس تھی۔

''بہت دکھ ہوتا ہے ناں بیٹی کو دیکھ کر؟'' میڈم نازیہ کو بیٹی کے کمرے سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھ کر فریال نے اس کے قریب ہوتے ہوئے بات کی تھی۔

''تم؟'' فریال کی آواز کان میں پڑتے ہی میڈم نازیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے حیران ہوکر کہا تھا۔

''ہاں میں۔''

''مگر تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' میڈم نازیہ کی حیرانی ابھی تک برقرار تھی۔

''قدرت کا کھیل دیکھ رہی ہوں۔''

''میرے غضب سے ڈرو لڑکی۔''

''خود تو تم خدا کے غضب سے بھی نہیں ڈرتی اور مجھے اپنے غضب سے ڈرا رہی ہو۔''

''میری مجبوری کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ فریال میں اسپتال کے ماحول کی وجہ سے خاموش ہوں' ورنہ تمہارے منہ سے نکلنے والے ہر ہر لفظ پر تمہیں ایسی عبرت ناک سزا دیتی کہ تم آئندہ کبھی میرے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی بھی جرات نہ کرتی۔''

''جس طرح تم اپنی بیٹی کی زندہ لاش دیکھ کر تڑپتی ہو' اسی طرح تمہارے خوب صورت جال میں پھنسنے والی معصوم لڑکیاں بھی زندہ لاش بن کر ہی رہ جاتی ہیں' جنہیں بیچ کر تم دولت سمیٹتی ہو' تم لاشوں کی سوداگر ہو' اسی لیے تمہاری بیٹی بھی ایک زندہ لاش کی طرح تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہارے گناہوں کی سزا تمہاری بے گناہ بیٹی بھگت رہی ہے۔''

''اپنی زبان کو لگام دو فریال۔''

''میں نے تو سنا ہے تمہارا شوہر اور بیٹا جس ایکسیڈنٹ میں مارے گئے' کیا وہ بھی تمہاری سوچی سمجھی اسکیم تھی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''یہ میں نہیں کہہ رہی' لوگ کہتے ہیں کیونکہ وہ تمہارے کالے کرتوتوں کی راہ میں سب سے بڑی

ہاٹ تھے۔''

''انہی کے دم قدم سے تو میری زندگی میں بہار تھی' وہی تو تھے' جن کے ہونے سے میں خود کو مکمل سمجھتی تھی پھر بھلا میں اپنے ہی ہاتھوں بہار کی بجائے خزاں کو کیسے گلے لگا سکتی تھی۔'' بات کرتے ہوئے میڈم نازیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ تیزی سے وہاں سے نکل گئی تھی۔

میڈم نازیہ کی آنکھوں میں آنسو اس کی باتوں کی صداقت کی تصدیق کررہے تھے' لیکن فریال جان بوجھ کر اسے ٹارچر کرتے ہوئے تڑپانا چاہتی تھی۔

میڈم نازیہ کی کل کائنات اس کی بیٹی امبر تھی' اس کا شوہر اور بیٹا کار ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے' بلکہ بیٹی ایک لاش بن کر رہ گئی تھی' وہ بھری دنیا میں بھی تنہا تھی' پھر بھی خود کو کامیاب انسان سمجھتی تھی' خدا نے اس کے اعمال کی سزا دنیا میں ہی دے ڈالی تھی' مگر اس کے باوجود اس نے معصوم لڑکیوں کو گناہوں کی دلدل میں دھکیلنے سے توبہ نہیں کی تھی۔

......☆☆☆......

اس کے باوجود کہ میڈم نازیہ ہی وہ عورت تھی' جس کی وجہ سے فریال کی زندگی میں اتنا بڑا بھونچال آیا تھا' مگر اس کے باوجود ایک انسان ہونے کے ناتے اسے امبر کے بارے میں جان کر دلی دکھ ہوا تھا اور وہ کسی بھی طرح زمین پر اتری ہوئی اس حور کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے اور ہنستے کھیلتے دیکھنا چاہتی تھی' پھر رات بھر جاگتے اور سوچتے رہنے کے بعد اس نے اپنے طور پر امبر کے لیے کچھ کرنے کا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔

وہ میڈم نازیہ کے اسپتال آنے سے کچھ دیر پہلے ہی اسپتال پہنچ گئی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کے آنے سے قبل وہ ڈاکٹر سے بات کرلے۔

''ڈاکٹر صاحب! میں امبر کے بارے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتی تھی۔'' موقعہ ملنے پر ڈاکٹر کو اپنے کمرے میں فارغ بیٹھے دیکھ کر فریال نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''جی بولیں۔'' ڈاکٹر نے فریال کی بات پوری توجہ سے سنتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں اس بات پر حیران ہوں کہ اتنے عرصے سے یہاں امبر کا علاج ہورہا ہے' لیکن وہ ٹھیک کیوں نہیں ہورہی؟

''جس حادثے کی وجہ سے امبر کی یہ حالت ہوئی' اس میں امبر کا زندہ بچ جانا بھی معجزہ ہے۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی ہے' دوائیں' انجکشن' ڈرپس اور فزیوتھراپی' کیا کچھ نہیں کیا ہم نے' بہت سے ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹروں کا بورڈ بھی امبر کے معاملے میں کئی بار آپس میں مشورہ کرچکا ہے' لیکن اس کی حالت جوں کی توں ہے میڈم نازیہ بھی بیٹی کے بارے میں بہت پریشان رہتی ہیں مگر وہ بھی ہماری طرح مایوس نہیں۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ وہ ٹھیک ہو سکتی ہے......تو......آپ کیا کہیں گے؟'' فریال نے رک رک کر بات کی تھی۔

''وہ کیسے؟'' فریال کی بات سن کر ڈاکٹر نے اپنی کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں نے امبر کے معاملے میں بہت سنجیدگی سے غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کیوں نہ ہم اسے آب زم زم پلا کر دیکھیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر ہم اسے اس یقین کے ساتھ آب زم زم پلائیں کہ اس میں شفاء ہے' تو امبر کیوں ٹھیک نہیں ہوگی۔''

''میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں......لیکن اس کا مہنگے سے مہنگا علاج ہورہا ہے' پھر بھی کوئی فرق

نہیں پڑ رہا۔“
”آپ اتنے عرصے سے جو علاج کر رہے ہیں‘ جب اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا‘ تو ایک بار میرے کہنے پر آب زم زم سے بھی کوشش کر کے دیکھ لیں۔“ فریال نے انتہائی سنجیدگی سے بات کی تھی۔
”شاید اس کے لیے میڈم تیار نہ ہوں کیونکہ ہم نے ان سے جب کبھی امبر کو علاج کے لیے امریکہ لے جانے کے بھی لیے کہا ہے‘ تو وہ راضی نہیں ہوئیں۔“
”یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں‘ میں کسی بھی طرح انہیں منالوں گی۔“
”ٹھیک ہے‘ میڈم مان جائیں تو ہمیں بتا دیجئے گا پھر دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔“
ڈاکٹر کی بات سن کر فریال خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور ایک طرف بیٹھ کر بے چینی سے میڈم نازیہ کا انتظار کرنے لگی تھی‘ اسے نہیں معلوم تھا کہ میڈم نازیہ اس کی بات سننے کے لیے بھی تیار ہو گی یا نہیں اور اگر کسی طرح اس نے بات سن لی تو اس کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گی یا نہیں۔
کچھ ہی دیر بعد اسے میڈم نازیہ آتی ہوئی دکھائی دی تھی‘ وہ آگے بڑھ کر اسے روک سکتی تھی‘ لیکن اس نے اسے بیٹی کے پاس جانے دیا تھا‘ روز کی طرح بیٹھنے سے قبل اس نے پیار سے بیٹی کا ماتھا چوما تھا اور آنکھوں پر پیار کیا تھا‘ پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئی تھی‘ فریال دروازہ کھول کر کمرے میں جا سکتی تھی‘ لیکن ایسا کرنے سے اسے بات بگڑنے کا ڈر تھا‘ اس لیے اسے میڈم نازیہ کے باہر آنے تک انتظار کرنا تھا‘ تب تک وہ میڈم نازیہ سے بات کرنے کے لیے پوری طرح تیاری کر سکتی تھی۔
وہ امبر کے کمرے کے باہر ہی ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی تھی‘ میڈم نازیہ کسی کام کے سلسلے میں کمرے سے باہر آئی تھی‘ جیسے ہی وہ کمرے سے نکلی تو فریال لپک کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔
”اس گستاخی کا کیا مطلب ہے؟“ میڈم نے فریال کو اچانک اپنے سامنے راستہ روکے کھڑے دیکھ کر تلخی سے بات کی تھی۔
”میں امبر کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“
”تمہیں اس سے کیا لینا دینا؟“
”وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔“
فریال کی بات سن کر میڈم نازیہ کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا اور اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا‘ وہ کچھ دیر تک بے یقینی کی سی کیفیت میں فریال کو دیکھتی رہی پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“
”یقین کامل ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔“
”تم ایک بار اپنے منہ سے تو کہو...... بیٹی کی زندگی کے لیے تو میں اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہوں۔“
”اپنی بیٹی اتنی عزیز ہے اور دوسروں کی بیٹیوں کو نیلام کرتی پھرتی ہو۔“
”ایک بار میری بیٹی ٹھیک ہو جائے...... پھر میں وہ سب کچھ کروں گی جو تم چاہتی ہو۔“
”لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ جیسا تم کہہ رہی ہو‘ ویسا کرو گی بھی کیونکہ جس منہ کو حرام لگ جائے‘ وہ آسانی سے چھوٹا نہیں کرتا۔“
”اپنی بیٹی کی زندگی کے لیے مجھے دنیا بھی چھوڑنی پڑ جائے تو میں بخوشی چھوڑ دوں گی‘ گناہ آلود زندگی سے توبہ کرنا تو کوئی بات ہی نہیں۔“
”ٹھیک ہے مگر اپنی بات کرنے سے پہلے میں قرآن پاک کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرنا چاہتی ہوں۔“
”سناؤ۔“
”جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کے قریب پیاس کی وجہ سے بلک رہے تھے‘ ان کی والدہ حضرت بی بی حاجرہ سے بیٹے کا تڑپنا دیکھا نہیں جاتا تھا اس لیے وہ انہیں زمین پر لٹا کر پریشانی کے عالم میں پانی کی تلاش میں کبھی صفا کی طرف دوڑتی ہوئی جاتی تھیں اور کبھی صفا سے مروہ کی طرف‘ مگر دور دور تک کہیں پانی دکھائی نہیں دے رہا تھا‘ ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام پیاس کی وجہ سے روتے ہوئے زمین پر اپنی ایڑھیاں رگڑ رہے تھے‘ پھر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا اور جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑھیاں رگڑ رہے تھے‘ وہاں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا‘ حضرت بی بی حاجرہ جب دوڑتی ہوئی وہاں آئیں تو یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئیں‘ پانی پھیلتا ہی جا رہا تھا‘ انہوں نے ایسا ہوتے دیکھ کر فوراً فرمایا ”زم زم۔“ یعنی ٹھہر جا‘ رک جا‘ اور پانی وہیں ٹھہر گیا‘ اسی لیے اسے آب زم زم کہا جاتا ہے‘ ہزاروں سال گزر گئے‘ تب سے آب زم زم کا چشمہ اسی طرح جاری ہے‘ پوری دنیا سے حج و عمرہ کی غرض سے جانے والے کروڑوں مسلمان وہاں سے آتے ہوئے اپنے ساتھ آب زم زم لاتے ہیں اور لوگ محبت و عقیدت کے ساتھ آب زم زم پیتے ہیں۔ انتہائی ریسرچ کے بعد غیر مسلم سائنسدان بھی اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ آب زم زم کسی بھی صاف اور شفاف پانی سے کہیں زیادہ کرشمات کا حامل ہے۔“
”مگر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“
”میں چاہتی ہوں‘ جہاں تم نے اس کا ہر طرح سے علاج کر کے دیکھ لیا‘ وہیں اگر میرے کہنے پر اسے آب زم زم پلایا جائے تو مجھے پورا یقین ہے کہ امبر بھی ضرور شفایاب ہو گی۔“
”مگر اس کے منہ سے تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گزر پاتا۔ آب زم زم وہ کس طرح پی پائے گی۔“ فریال کی بات سن کر میڈم نازیہ نے پریشان کن لہجے میں بات کی تھی۔
میڈم نازیہ کی بات سن کر فریال خاموش ہو گئی تھی‘ کیونکہ اس بارے میں تو اس کی معلومات بھی کچھ زیادہ نہیں تھیں‘ وہ ہمیشہ سے سنتی چلی آئی تھی کہ آب زم زم کسی معجزے سے کم نہیں اور اس میں شفاء ہے۔ یہی سوچ کر اس نے میڈم نازیہ سے بات کی تھی‘ اس سے آگے پیش آنے والے مسائل کے بارے میں تو اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔
”لگتا ہے آپ نے میڈم کو راضی کر لیا ہے۔“ فریال اور میڈم کو ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر نے فریال کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی۔
”جی‘ میڈم تو تیار ہیں مگر کچھ مشکلات ہیں‘ جن کا حل صرف آپ ہی بتا سکتے ہیں۔“ فریال نے ڈاکٹر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بات کی تھی‘ جبکہ اس کے ساتھ والی کرسی پر میڈم نازیہ بیٹھ گئی تھی‘ مگر وہ ابھی تک خاموش تھی۔
”میڈم! اور باتوں سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جیسا مس فریال چاہ رہی ہیں‘ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟“
”ڈاکٹر صاحب مجھے تو اپنی بیٹی کی صحت چاہیے‘ وہ دواؤں سے ملے۔“ یا دعاؤں سے‘ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“
”آپ شاید کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں؟“ اس بار

ڈاکٹر نے فریال سے سوال کیا تھا۔
''جی ڈاکٹر صاحب! میں نے آب زم زم کے بارے میں میڈم سے بات کی تھی نگران کا کہنا ہے کہ اس کے حلق سے تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں اترتا' ایسے میں وہ آب زم زم کیسے پی پائے گی۔''
''یہ تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں اگر وہ پی نہیں سکتی تو کیا ہوا انجکشن کے ذریعے امبر کی رگوں میں با آسانی آب زم زم شامل کیا جاسکتا ہے۔''
''اگر ایسا ممکن ہے تو پلیز مزید دیر نہ کریں۔'' فریال نے بے چین ہو کر بات کی تھی۔
''میں آپ کے جزبات کی قدر کرتا ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے اپنے کچھ سینئر ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ ہوگا اور امبر جیسی مریضہ کے لیے اس طرح کا کوئی بھی فیصلہ کرنا میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔''
''ٹھیک ہے آپ مشورہ کرلیں مگر پلیز کسی بھی طرح اس کا فیصلہ کل ہی کرلیں۔''
''آپ اطمینان رکھیں' میں کل شام تک آپ کو اس سلسلے میں آگاہ کردوں گا۔''
''تھینک یو ڈاکٹر۔'' فریال نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی' اسے اٹھتے دیکھ کر میڈم نازیہ نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی۔
ڈاکٹر سے بات کرنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے نکل کر امبر کے کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں' ڈاکٹر کے پاس بیٹھے ہوئے بھی میڈم نازیہ نے کوئی زیادہ بات نہیں کی تھی اور کمرے سے باہر آنے کے بعد بھی اس کے ہونٹوں پر خاموشی تھی۔
''آپ پریشان نہ ہوں خدا نے چاہا تو امبر جلد ٹھیک ہوجائے گی' بس آپ اس کے لیے دعا کرتی رہا کریں۔'' امبر نے میڈم کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔
''اگر تم میری بیٹی سے ملنے کمرے میں آؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔'' میڈم نازیہ نے افسردہ لہجے میں بات کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔
میڈم نازیہ کے دروازہ کھولنے پر فریال خاموشی سے کمرے میں داخل ہوگئی تھی' اس کے ساتھ ہی میڈم نازیہ بھی اندر آگئی تھیں' اندر آتے ہی انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کردیا تھا' کمرہ وہاں رکھے ہوئے گلدستوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا' امبر حسن کا خوب صورت شاہکار بنی بیڈ پر خاموش لیٹی تھی' اس کے دودھیا ہاتھوں پر کنولا لگا ہوا تھا' اس کے لب خاموش تھے مگر فریال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے کئی سوال اٹھ رہے تھے' قدرت نے اسے بنانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی' مگر کار حادثے نے اسے مجبور ولاچار کر ڈالا تھا' فریال نے پہلی بار امبر کو اس قدر قریب سے دیکھا تھا' اسے اس کی معصومیت دیکھ کر اس پر بہت پیار آرہا تھا' اس نے آگے بڑھ کر امبر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے اور پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا' ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے' قریب تھا کہ وہ رو پڑتی' اس لیے وہ جلدی سے اس کے بیڈ سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی' میڈم نازیہ کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو فریال سے چھپ نہیں پائے تھے' مگر وہ فریال سے اپنے آنسو چھپانے کی غرض سے فوراً واش روم میں گھس گئی تھیں' لیکن واش روم سے آنے والی اس کی سسکیاں فریال کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔
فریال نے کمرے میں بیٹھے ہوئے محسوس کرلیا تھا کہ میڈم نازیہ واش روم میں کھڑی مسلسل آنسو بہا رہی ہے' مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی' وہ دیر تک

واش روم میں کھڑی آنسو بہاتی رہی پھر منہ ہاتھ دھوکر واش روم سے نکل کر کمرے میں فریال کے پاس ہی کرسی پر آبیٹھی تھی' کمرے میں تین خواتین موجود تھیں مگر حیران کن بات یہ تھی کہ وہاں پھر بھی مکمل خاموشی تھی' فریال مسلسل محسوس کررہی تھی کہ میڈم نازیہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پارہی تھی' وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی' پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔'' فریال کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر میڈم نازیہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا تھا۔
میڈم نازیہ کی آواز سن کر فریال کے قدم رک گئے تھے اور وہ بولی۔ ''جی پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔''
''کیا تم مجھے...... وضو کرنا سکھادو گی؟''
''وضو......؟'' میڈم کا سوال سن کر فریال کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا' اس لیے اس نے حیران ہوکر لفظ وضو پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا تھا۔
''ہاں' کیونکہ مجھے وضو کرنا نہیں آتا۔''
''سکھا تو میں دوں گی لیکن حیرانی اس بات پر ہو رہی ہے کہ ایک مسلمان ہوکر اب تک آپ کو وضو بھی نہیں کرنا آتا۔''
''مسلمان تو میں اس لیے ہوں کہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی' ورنہ مجھے نہیں یاد کہ میں نے زندگی میں کبھی بھولے سے ایک بار بھی نماز پڑھی ہو۔''
''آئیں میں آپ کو وضو کرواتی ہوں۔'' میڈم کی بات سن کر فریال کو انتہائی عجیب لگا تھا' لیکن وہ کسی بحث میں الجھنے یا میڈم کو شرمندہ کرنے کی بجائے بات کرتے ہوئے میڈم کو ساتھ لیے واش روم کی طرف چل پڑی تھی۔
میڈم نازیہ وضو کرچکی تو وہ دونوں واش روم سے باہر نکل آئیں' کمرے میں آتے ہی میڈم نے الماری میں پڑا ہوا مصلیٰ نکال لیا تھا' اسی دوران فریال خاموشی سے وہاں سے نکل آئی تھی' کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے فریال نے بے ارادہ کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تھا' میڈم نازیہ نے دوپٹے سے اپنے سر اور بالوں کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا اور وہ بیڈ کے پاس ہی جائے نماز پر خدا کے حضور سجدہ ریز تھی' فریال وہاں رکے بغیر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی مگر کچھ دیر اور کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے کی خواہش نے اسے روک رکھا تھا' میڈم نازیہ خدا کے سامنے سر جھکانے کی لذت سے ناآشنا تھی' مگر جب سر جھکایا تو اٹھانا بھول گئی تھی' سجدہ طویل ہوتا جارہا تھا' فریال کا بلا وجہ وہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا' اس لیے وہ وہاں سے چل پڑی تھی۔

......☆☆☆......

فریال پچھلے کئی روز سے مسلسل لیٹ گھر پہنچ رہی تھی' اسے دیکھ کر دانش کی آنکھوں میں بہت سے سوال ہوتے تھے' لیکن کبھی ایک بار بھی اس نے فریال سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی تھی' فریال کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا' اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ اس سے قبل کہ دانش کسی روز اس کے لیٹ آنے پر کوئی سوال اٹھائے' وہ خود ہی اسے اس سلسلے میں آگاہ کردے۔
''میں جانتی ہوں' تمہیں میرا آفس سے لیٹ گھر آنا اچھا نہیں لگتا ہوگا۔'' فریال نے دانش کے پاس بیٹھ کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے بات کا آغاز کیا تھا۔
''نہیں' ایسا تو کچھ بھی نہیں۔''
''میں یہ کیسے مان لوں جبکہ ایک بیوی ہوتے

ہوئے مجھے تمہارے کبھی کبھار دیر سے گھر آنے پر بھی غصہ آتا تھا پھر بھلا تمہیں ایک شوہر ہوتے ہوئے اپنی بیوی کے روز روز لیٹ آنے پر غصہ کیوں نہیں آتا ہوگا۔''

''وہ تمہاری سوچ تھی اور یہ میرا ظرف ہے' مجھے تم پر ہمیشہ سے بھروسہ رہا ہے' مگر تم نے میری ہر حرکت کو شک کی نظروں سے دیکھا۔''

''ہاں' آج بھی مجھے اپنی ان باتوں کے بارے میں سوچ کر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔''

''تم شرمندہ کیوں ہوتی ہو جو وقت گزر گیا' اسے بھلا دینا ہی اچھا ہے ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''میں تم سے یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ جب ہمیں پولیس اور حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں کی طرف سے مایوسی ہوئی تو میں اپنے طور پر میڈم نازیہ کی کھوج میں لگ گئی تھی' کیونکہ میرے جینے کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا اور وہ تھا میڈم نازیہ کو بے نقاب کرنا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ اب کسی اور کی بہن یا بیٹی' اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے پھر جانتے ہو کیا ہوا؟'' بات کرتے ہوئے فریال نے اپنی بات روک کر دانش کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

''ہاں ہاں بولو' میں سن رہا ہوں۔''

''پھر ایک روز میڈم نازیہ کا پیچھا کرتے ہوئے میں ایک ایسے اسپتال جا پہنچی' جہاں اس کی جوان بیٹی اپنی ماں کے کیے کی سزا بھگت رہی تھی...... میڈم کی بیٹی امبر کی زندہ لاش کو دیکھ کر میں بھی تڑپ اٹھی تھی' اس کی یہ حالت ایک کار ایکسیڈنٹ کے بعد ہوئی تھی' ڈاکٹر اسے نارمل حالت میں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں مگر اب تک اس زندہ لاش میں کوئی حرکت نہیں ہوئی' میں نے اسے اس یقین کے ساتھ آب زم زم پلانے کو کہا تھا کہ جب آب زم زم میں شفاء ہے تو امبر بھی ضرور ٹھیک ہو جائے گی...... میری بات سن کر میڈم نازیہ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اس کی بیٹی صحت یاب ہو کر پہلے کی طرح اپنے پاؤں پر چلنے لگی تو وہ نہ صرف خود کو بلکہ اس گناہ میں شریک ہر فرد کو قانون کے حوالے کر دے گی۔''

فریال نے آفس کے لیے نکلنے سے قبل آب زم زم کی وہ بوتل اپنے بیگ میں رکھ لی تھی' جسے اس نے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے سنبھال کر رکھا تھا اور کبھی کبھی نہ صرف اپنے بچوں اور خاوند کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا پلا دیا کرتی تھی' بلکہ خود بھی پی لیا کرتی تھی' وہ دن بھر آفس میں اپنے ٹیبل پر بیٹھی کام نمٹاتی رہی' لیکن اس کا ذہن بری طرح الجھا رہا۔

وہ وقت سے کچھ دیر پہلے ہی آفس سے شارٹ لیو لے کر اسپتال پہنچ گئی تھی' لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ میڈم نازیہ پہلے سے وہاں موجود تھی اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے امبر کے کمرے کے باہر بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھی اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

فریال کی خواہش پر آب زم زم کے ذریعے امبر کے مردہ جسم کو سیراب کیا جانے لگا تھا' اس نے جس یقین کے ساتھ ضد کر کے ڈاکٹر کو اس کام کے لیے راضی کیا تھا' اس سے میڈم نازیہ بھی پر امید تھی' ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے تھے' فریال نے آب زم زم سے بھری دو بوتلیں اور لا دی تھیں' جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے' امبر کی صحت کے لیے مانگی جانے والی دعاؤں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا' لیکن امبر کی حالت جوں کی توں تھی' جیسے جیسے ڈاکٹروں کی طرف سے دیے گئے دن ختم ہوتے جا رہے تھے' اسی

ا ر مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ آخری رات تھی' اگلی صبح اسے کوئی بھی خبر مل سکتی ی' مگر وہ اب بھی پر امید تھی' امبر کے صحت یاب ونے میں بہت سے لوگوں کا بھلا تھا' اس لیے وہ ہائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی تھی اور لبوں پر دعا تھی ''اے ُدا میرا یہ ایمان ہے کہ تو ہی ہے جو بیماروں کو شفاء دیتا ے' تیرے لیے ایک مریض کو صحت عطا کرنا کچھ ُکل نہیں' تو اس معصوم کو بھی بیماری سے نجات دے تا کہ حق کی فتح ہو۔''

فریال جانتی تھی کہ آج میڈم نازیہ بیٹی کے پاس پتال میں ہی ہو گی' اس لیے اس نے آفس سے ُٹی کر لی تھی اور امبر کے بارے میں جاننے کے لیے اسپتال جا پہنچی تھی' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ آہستہ سے امبر کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا' یڈم نازیہ بیٹی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی جھولی میں گر رہے تھے' فریال کو دیکھ کر میڈم کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی' امبر ہمیشہ کی طرح بت بنی بیڈ پر لیٹی تھی' میڈم کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کر ہی وہ سب کچھ جان گئی تھی' اس لیے اس نے اس بارے میں میڈم سے کوئی سوال یں کیا تھا اور خاموشی سے وہاں سے نکل کر ڈاکٹر کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہمیں کچھ دن کی اور مہلت نہیں مل سکتی؟''

یال نے جاتے ہی بلا تمہید ڈاکٹر سے سوال کیا تھا۔

''سوری مس' میں اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کر کتا۔'' ڈاکٹر نے کورے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے واب دیا تھا۔

''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ دس دن تک اس کی رگوں میں آب زم زم شامل کرتے رہنے سے ذرہ بھر بھی فرق نہیں پڑا۔''

''فرق تو اب تک آپ کی دواؤں سے بھی نہیں پڑا مگر دوائیں پھر بھی جاری ہیں' وہ کیوں بند نہیں کر دیں۔''

ڈاکٹر کو فریال کے اس جارحانہ رویے کی امید نہیں تھی' اس لیے وہ حیران کن نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے' میں آپ کو پانچ دن اور دے رہا ہوں' لیکن اس کے لیے ایک شرط ہو گی۔''

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔''

''شرط صرف اتنی سی ہے کہ آپ اس کے بعد کسی بھی حالت میں مجھے مزید وقت کے لیے ہرگز نہیں کہیں گی۔''

وہ جانتی تھی کہ منت سماجت سے مانگے ہوئے گنتی کے پانچ دن اس قدر تیزی سے گزر جائیں گے کہ ان کے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلے گا' میڈم نازیہ کا برائی کے راستے کو چھوڑنا امبر کے صحت یاب ہونے سے مشروط تھا' یہ بات وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ امبر کے صحت یاب نہ ہونے پر میڈم کو برائی کی راہ سے روکنا اس جیسی کمزور لڑکی کے بس کا کام نہیں تھا' اس لیے ہر دم اٹھتے بیٹھتے اس کے دل سے امبر کی صحت یابی کے لیے دعا نکلتی تھی۔

چھٹی کا دن تھا' اسے آفس اور عمر کی اسکول سے چھٹی تھی' اس لیے اس نے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے ساتھ دانش کے علاوہ علی اور عمر کو بھی بٹھا لیا تھا' فریال اور دانش نے قرآن پاک کی تلاوت کے بعد اپنے دونوں بچوں کے ننھے ننھے ہاتھ پکڑ کر انہیں خدا سے دعا مانگنے کو کہا تھا' فریال جیسے جیسے دعا مانگتی تھی' دونوں بھائی بھی وہی الفاظ دہراتے جاتے تھے۔

''یااللہ امبر بہنا کوٹھیک کردے' یااللہ امبر بہنا کو ٹھیک کردے' یااللہ امبر بہنا کے لیے آب زم زم کو شفاء کا ذریعہ بنادے۔'' وہ چاروں دیر تک اسی طرح دعائیں کرتے رہے تھے۔

گو کہ مایوسی کے سائے بہت گہرے ہوتے جارہے تھے' لیکن پھر بھی ایک آس تھی' جو اسپتال پہنچتے ہی امبر کو ہمیشہ کی طرح بت بنے لیٹے دیکھ کر ٹوٹ گئی تھی' امبر کو دیکھ کر فریال کے دل کو چوٹ لگی تھی' جس نے اسے رلا ڈالا تھا' اسے روتے دیکھ کر میڈم نازیہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میری بیٹی آج بھی پہلے کی طرح بے جان پڑی ہے' مگر یہ حقیقت ہے کہ تم نے ایک کافر کو مسلمان بناڈالا ہے۔'' میڈم نے بھرائی ہوئی آواز میں بات کی تھی۔

روتے ہوئے' میڈم کی بات فریال کے کانوں میں پڑی تھی' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا' کچھ پل کے لیے وہ بے یقینی کی کیفیت میں کھڑی میڈم کے چہرے پر نگاہ جمائے کھڑی رہی' پھر فوراً سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''اس میں میرا کوئی کمال نہیں' یہ سب اوپر والے کے کام ہیں' وہ جب چاہے کسی کو نیکی کی ہدایت دے کر اس کا رخ کعبے کی طرف پھیر دے اور اس کا دل اپنے نور سے منور کر ڈالے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی...... جس قدر پیار آپ نے دنیا داری اور دولت سے کیا' اس سے آدھا پیار بھی میرے آقا علیہ وسلم ﷺ سے کیا ہوتا' تو شاید آپ کو یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔''

''میں نے تم سے اپنی بیٹی کی صحت یابی کی صورت میں برائی کی راہ چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا۔ میری بیٹی تو صحت یاب نہیں ہوئی مگر میں پھر بھی اپنا وعدہ پورا کردوں گی۔''

''آپ ایسا کر کے بہت سے لوگوں کی دعائیں لیں گی۔''

میڈم کی بات سن کر فریال پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور منہ سے کچھ بول نہیں پائی تھی۔

''تمہیں تو اپنی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے مگر تم رو رہی ہو؟'' میڈم نازیہ نے فریال کو روتے دیکھ کر کہا تھا۔

''میری آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو خدا کے حضور شکرانے کے لیے بہہ رہے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے' میں آج جی بھر کر روؤں۔'' بات کرتے ہوئے فریال کے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی اور وہ روتی ہوئی باہر کی طرف چل پڑی تھی۔

چلتے چلتے فریال کی نگاہ بیڈ کی طرف اٹھ گئی تھی اور اچانک اس کے باہر کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے' اس نے بیڈ پر پڑے بے جان بت میں حرکت محسوس کی تھی' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''آپ نے دیکھا؟'' امبر کے جسم میں حرکت ہوئی تھی۔'' فریال نے جذبات سے بے قابو ہو کر میڈم نازیہ کی توجہ امبر کی طرف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

فریال کی بات سن کر میڈم ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی' اس نے امبر کے پورے جسم کو بغور دیکھا تھا' مگر اسے اس میں کوئی بھی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی اور وہ پہلے کی طرح مجسم بت بنی لیٹی تھی۔

''تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' بیٹی کا مکمل جائزہ لینے کے بعد میڈم نے آہستہ سے کہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا' میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔''

''یہ تمہارا وہم بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''آپ میرا یقین کیوں نہیں کر رہیں؟'' آج پہلے میں نے کبھی ایسا کیوں نہیں کہا۔ میں نے ...ے جسم میں حرکت ہوتے ہوئے دیکھی ہے تو ...رہی ہوں ناں۔'' فریال نے قدرے چیختے ...ے بات کی تھی۔

...یڈم' فریال کی ضد کی وجہ سے خاموش ہوگئی تھی' ...چھ سوچ کر بولی۔ ''کیوں ناں' ہم اس بارے میں ...سے بات کر کے دیکھ لیں؟''

''آپ امبر کے پاس بیٹھیں' ڈاکٹر سے میں خود ...کر کے آتی ہوں۔'' فریال بات کرتے ہی میڈم ...واب سنے بغیر کمرے سے نکل گئی تھی' جبکہ میڈم ...یں خاموش کھڑی رہ گئی تھی۔

''مس فریال! آپ ہمیں کیوں الجھا رہی ہیں؟'' ...کچھ ہی دیر پہلے میں خود امبر کو دیکھ کر آیا ہوں' تب ...اس کی حالت جوں کی توں تھی' اس لیے میں آپ ...بات کا کیسے یقین کرلوں۔'' ڈاکٹر نے فریال کی ...کی بات سننے کے بعد قدرے تلخی سے بات کی تھی۔

''آپ کا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں

...اس سے پہلے کہ ڈاکٹر' فریال کی بات کا کوئی ...ب دیتا' میڈم نازیہ قدرے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ...ے میں داخل ہوئی تھی۔

''وہ...... وہ...... وہ ڈاکٹر صاحب...... وہ امبر۔'' ...ولی ہوئی سانسوں کی وجہ سے میڈم نازیہ پوری ...بات نہیں کر پا رہی تھی۔

''کیا ہوا اسے؟''

''میں نے اس کے جسم کو حرکت کرتے ہوئے ...لما ہے۔''

...ڈاکٹر اب تک فریال کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا' لیکن جب وہی بات میڈم نازیہ نے بھی آ کر بتائی تو اس نے فوراً اپنی کرسی چھوڑ دی اور جلدی سے امبر کے کمرے کی طرف چل پڑا تھا' فریال اور میڈم نازیہ بھی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ہولی تھیں' وہاں بیٹھی نرس بھی ان کی باتیں سن کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی' وہ چاروں امبر کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے' امبر کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ کچھ کہہ رہی تھی' ان سب نے ایک عرصے بعد امبر کے لبوں کو ہلتے دیکھا تھا اور اس کے کہے ہوئے الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے' امبر کچھ کہہ رہی تھی مگر اس کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی' اس لیے وہ بے بسی سے باری باری ان چاروں کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے یہ پانی مانگ رہی ہے۔'' فریال نے امبر کے ہونٹوں کی جنبش سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے بھی فریال کی ہاں میں ہاں ملادی تھی۔

''میں اپنی بیٹی کے لبوں کو آب زم زم سے ہی تر کروں گی اور اس کے حلق سے بھی سب سے پہلے آب زم زم ہی اترے گا' جو اس کے لیے شفاء کا ذریعہ بنا۔'' میڈم نے بھرائی ہوئی آواز میں بات کی تھی اور پھر ڈاکٹر سے اجازت کے لیے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''ہاں' کوئی حرج نہیں' اگر وہ پی لے تو تھوڑا تھوڑا کر کے ایک دو چمچ پلادیں۔''

ڈاکٹر کی اجازت پاتے ہی میڈم نازیہ الماری سے آب زم زم اور چمچ لے آئی تھی' اس دوران نرس نے سرہانے کی طرف سے بیڈ تھوڑا سا اونچا کردیا تھا' میڈم نے خدا کا نام لیا اور چمچ میں آب زم زم ڈال کر امبر کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا' آب زم

زم سے بھرا چمچ دیکھ کر امبر نے اپنا منہ کھول دیا تھا' ایسا لگتا تھا' جیسے وہ برسوں کی پیاسی تھی' وہ ایک ہی گھونٹ میں آب زم زم سے بھرا چمچ پی گئی تھی' میڈم نازیہ کے لیے یہ بات کسی معجزے سے کم نہ تھی' اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے' اس نے روتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے آب زم زم کا ایک اور چمچ بیٹی کو پلا دیا تھا۔

فریال مسلسل روئے جا رہی تھی اور امبر کے ٹھیک ہونے پر اپنی ہر سانس کے ساتھ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی' نرس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے' جبکہ ڈاکٹر کی آنکھیں بھی نم تھیں' مگر وہ حوصلہ کیے کھڑا تھا' میڈم آب زم زم پلانے سے فارغ ہوگئی تو ڈاکٹر امبر کے ہاتھوں اور پاؤں کا معائنہ کرنے لگا' پھر اس نے بازو اور ٹانگیں چیک کیں' ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ امبر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اسے دبانے کو کہا تھا' جس پر اس نے ہلکا سا زور لگانے کی کوشش کی تھی' یہ دیکھ کر ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"مبارک ہو' امید ہے اگلے چند دنوں میں یہ اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو کر چلنے پھرنے لگے گی۔" ڈاکٹر نے میڈم کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔

"انشاءاللہ۔" میڈم نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے خیال میں تو ہمیں ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" فریال نے اداس لہجے میں بات کی تھی۔

ڈاکٹر اور نرس کمرے سے چلے گئے تھے' اب وہاں امبر کے پاس میڈم اور فریال رہ گئی تھیں' میڈم امبر کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی' اس نے بیٹی کے ماتھے اور رخساروں پر پیار کیا' پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چوما' انہیں کبھی ہونٹوں سے لگایا کبھی آنکھوں سے' فریال اس دوران خاموشی سے وہاں سے نکل گئی تھی' میڈم بیٹی کو پیار کرنے میں اس قدر گم تھی کہ اسے فریال کے جانے کا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

......☆☆☆......

"تمہاری آنکھوں سے لگتا ہے' تم روتی رہی ہو مگر تمہارے چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آج تم بہت خوش ہو۔" دانش نے فریال کے گھر پہنچتے ہی اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تم تو اچھے بھلے نجومی بن گئے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ واقعی میں آج بہت خوش ہوں اور اسی خوشی کی وجہ سے روئی بھی بہت ہوں۔"

"آج ایسی کون سی خوشی مل گئی کہ تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے؟"

"جانتے ہو' آب زم زم نے وہ کام کر دکھایا' جو مہنگے سے مہنگے انجکشن نہیں کر پائے تھے۔"

"کیا امبر ٹھیک ہوگئی؟"

"ہاں' آج میں نے اپنی آنکھوں سے خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھ لیا' یہ ٹھیک ہے کہ ہم سب نے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑگڑا کر اسے اس کی خدائی اور کبریائی کا واسطہ دے کر امبر کی صحت یابی کے لیے بہت سی دعائیں بھی مانگی تھیں مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا' جب مایوسی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑی بات ہے۔"

"اسی لیے تو میڈم نازیہ نے بھی معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کرنے میں ملوث' خود سمیت' تمام افراد کی گرفتاری کا وعدہ پورا کرنے کی یقین دہانی کروائی ہے۔"

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ اپنے وعدے پر قائم بھی رہے گی۔"

ایک پل کے لیے دانش کی بات نے فریال کو اداس کر ڈالا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی کہ اگر میڈم' بیٹی کے صحت یاب ہونے پر اپنے وعدے سے پھر گئی' تو وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گی' مگر اگلے ہی لمحے اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔ "ایسی باتیں لکھ کر تو نہیں دی جاتیں' یقین تو کرنا پڑتا ہے۔" فریال نے پراعتماد لہجے میں بات کی تھی۔

ایک مدت بعد دانش نے فریال کو اچھے موڈ میں دیکھا تھا' اس لیے وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' جس سے اسے ٹھیس پہنچتی اور وہ پھر سے مسکرانا بھول جاتی' اس لیے اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا اور چپکے سے کچن میں گھس گیا تھا۔

......☆☆☆......

دن بدن امبر کی حالت بہتر سے بہتر ہونے لگی تھی' ہر نیا دن میڈم کی خوشیوں میں اضافہ کر جاتا تھا' مگر بیٹی کی صحت یابی کی صورت میں ملنے والی خوشی اسے خوش کرنے کی بجائے رلا ڈالتی تھی' وہ ہر گھڑی اداس رہنے لگی تھی' اس کی ویران آنکھیں ہر پل فریال کی منتظر رہتی تھیں' ہر آہٹ پر اسے فریال کے آنے کا گماں ہوتا تھا اور وہ دوڑ کر دروازے پر جا پہنچتی تھی' مگر وہاں فریال کو نہ پا کر اپنی جگہ واپس آ بیٹھتی تھی۔

حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے چہرے سے میک اپ کا نقاب اتر کر جو چہرہ سامنے آیا تھا' وہ چہرہ اس چہرے سے کہیں زیادہ خوب صورت اور پرکشش تھا' جو میک اپ کے ساتھ دکھائی دیا کرتا تھا۔

"میری شدید خواہش تھی کہ آج تمہاری وہ محسن یہاں موجود ہوتی' جس کی کوششوں سے آج تم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو۔" ڈاکٹروں کے وہاں سے جانے کے بعد میڈم نے اداس لہجے میں امبر سے بات کی تھی۔

"جب انہوں نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا' تو آج انہیں یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔" امبر نے ماں کی بات سن کر بات کی تھی۔

"چاہتی تو میں بھی یہی تھی' لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہ سکا۔"

"لیکن کیوں ماما؟"

"کچھ باتوں کے جواب ہمیں معلوم ہوتا ہے بیٹا' مگر پھر بھی ہم جواب دے نہیں پاتے۔"

امبر ماں کی بات کی گہرائی کو سمجھ نہیں پائی تھی' اس لیے خاموش ہوگئی تھی' کچھ دیر بعد میڈم نے کمرے سے اپنا سامان سمیٹا اور بیٹی کو ساتھ لیے بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے نکل گئی تھی۔

ایک مدت بعد امبر اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تھی' اس کے آنے سے گھر کے ویرانے میں رونق سی آ گئی تھی' مگر بیٹی کی صحت یابی پر ایک ماں کو جس قدر خوش ہونا چاہیے تھا' اس کی ہلکی سی جھلک بھی میڈم نازیہ کے چہرے سے دکھائی نہیں دے رہی تھی' مگر اس نے کمال ہوشیاری سے اپنی اس کیفیت کو بیٹی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا' وہ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر امبر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی' اسے اس کے بیڈ روم میں لے آئی تھی' امبر اپنے بیڈ روم میں پہنچنے تک بہت تھک گئی تھی' اس لیے میڈم نازیہ نے اسے بیڈ پر لٹا دیا تھا اور خود اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی' امبر نے تھکاوٹ کی وجہ سے بیڈ پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں' اسے دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ ماننے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اتنی لمبی بیماری کے بعد اسپتال سے واپس آئی تھی' ایسا دکھائی دے رہا تھا' جیسے وہ ابھی ابھی دودھ میں نہا کر

آئی ہو اس کے لب ورخسار پر پھیلی ہوئی سرخی اس کی معصومیت کی گواہی دے رہی تھی۔

دیر تک میڈم نازیہ اپنی جگہ پر بیٹھی اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی‘ پھر اٹھ کر اس کا ماتھا چوما‘ اس کی آنکھوں‘ بالوں‘ رخسار اور ہاتھوں پر جی بھر کے پیار کیا‘ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے‘ قریب تھا کہ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی‘ وہ جلدی سے بیڈروم سے باہر نکل آئی تھی۔

بیڈروم سے نکلتے ہی اس نے گیٹ پر کھڑے گارڈ کو اپنے پاس بلالیا تھا اور اسے اس بات کی سختی سے ہدایت کردی تھی ’’اگر کوئی بھی میرے بارے میں پوچھے یا مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو کہہ دینا کہ میڈم گھر پر نہیں۔‘‘‘ گارڈ کے بعد گھر کے دیگر ملازمین کو بھی بلا کر اس نے ضروری ہدایات جاری کردی تھیں‘ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنے بیڈروم میں آگئی تھی۔

اس نے صبح سے ہی اپنا موبائل آف کر رکھا تھا‘ پھر بھی اپنی تسلی کے لیے اس نے ہینڈ بیگ میں سے موبائل نکال کر اس بات کی تسلی کرلی تھی کہ اس کا موبائل آف ہی تھا۔

بیڈ پر بیٹھتے ہی اس نے اپنا موبائل آن کیا اور نمبر ڈائل کرنے لگی‘ اس کے بعد اس نے باری باری بہت سے لوگوں سے فون پر بات کی تھی‘ اپنے مطلوبہ نمبروں پر کال کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا موبائل آف کردیا تھا‘ پھر اس نے وہیں بیٹھے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے نیند کی گولیوں والی ڈبی اٹھالی تھی‘ جو وہ بوقت ضرورت نیند نہ آنے پر کھالیا کرتی تھی‘ مگر اس وقت اس نے بہت سی گولیاں ایک ساتھ نگل لی تھیں اور سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

......☆☆☆......

وہ ریموٹ ہاتھ میں لیے بے دلی سے ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھی بار بار چینل تبدیل کررہی تھی‘ اس کے برابر میں صوفے پر بیٹھا دانش خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا‘ ایک چینل پر بریکنگ نیوز فلیش ہوئی تھی‘ مگر فریال نے چینل تبدیل کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

’’ذرا پچھلا چینل لگا کر دیکھنا‘ کوئی بریکنگ نیوز آرہی ہیں۔‘‘ دانش نے بار بار چینل گھماتے دیکھ کر فریال کو کہا تھا۔

دانش کی بات سن کر کسی احتجاج کے بغیر فریال نے بے دلی سے دانش کا مطلوبہ چینل لگا کر ریموٹ ایک طرف رکھ دیا تھا۔

’’خبروں کے مطابق‘ میڈم نازیہ کی نشاندہی پر جسم فروشی میں ملوث ایک بڑے گروہ کی گرفتاری عمل میں لائی گئی تھی‘ گرفتار ہونے والوں میں بہت سے قدآور سیاسی اور اعلیٰ حکومتی عہدیداران شامل تھے‘ میڈم نازیہ نے اپنی گرفتاری سے کچھ ہی لمحے قبل‘ اس خوف سے موت کو گلے لگالیا تھا کہ وہ کس منہ سے اس بیٹی کا سامنا کرپائے گی‘ جس کی نظروں میں اس کی ماں انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرنے والی ایک بہت بڑی این جی او چلارہی تھی‘ اگر ماں کا اصل چہرہ بیٹی کے سامنے آجاتا‘ تو وہ کبھی اس سے نظریں نہ ملا پاتی۔‘‘ فریال نے گرفتار کیے جانے والوں کی لسٹ کو بغور پڑھا تھا‘ جہاں کئی نام پڑھ کر وہ چونکی تھی‘ وہیں اسے یہ دیکھ کر دلی سکون ہوا تھا کہ ان ناموں میں کاشف جنید کا نام بھی شامل تھا‘ جس نے اس کی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

’’مبارک ہو۔‘‘ دانش نے ٹیلی وژن پر نشر ہونے والی خبر سن کر فریال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

’’لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا‘ میں تو بس اسے اور اس کے ساتھیوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید دیکھنا چاہتی تھی‘ تاکہ وہ لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائیں مگر شاید اسے اسی طرح مرنا تھا۔‘‘

’’ایسے لوگ جتنی چاہیں قانون کی نظروں میں دھول جھونک دیں‘ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے جس جس کو چاہیں اپنے ساتھ ملالیں‘ مگر پھر بھی خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔‘‘

’’میں نہیں جانتی کہ مجھے میڈم کی موت پر خوش ہونا چاہیے یا افسردہ‘ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آج میری جان سے پیاری دوست‘ زارا کی روح بہت خوش ہوئی ہوگی۔‘‘ فریال نے آنکھوں میں آنسو لیے‘ دکھ بھرے لہجے میں بات کی تھی اور وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ پر جالیٹی تھی۔

فریال نے زارا کے بعد اپنی تنخواہ میں اضافہ کیے جانے پر ہی جان لیا تھا کہ درپردہ اس کا باس بھی میڈم کے گھناؤنے جرائم میں شریک ہے‘ اسی دن سے اسے باس اور آفس کے ماحول سے خوف آنے لگا تھا‘ اسی لیے وہ اپنا ہر قدم انتہائی سوچ سمجھ کر اٹھاتی تھی‘ لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے وہ اب تک آفس جاتی رہی تھی‘ مگر میڈم نازیہ کی خودکشی اور اس کے گناہوں میں شریک سبھی ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد اس نے خود کو گھر میں ہی قید کرلیا تھا‘ ویسے بھی اسے معلوم ہوچکا تھا کہ باس کی گرفتاری کے بعد آفس کو بھی تالے لگا دیے گئے تھے۔

دانش کی آنکھ کھلی تو فریال بیڈ پر موجود نہ تھی‘ عام طور پر وہ فریال اور بچوں سے پہلے اٹھ بیٹھتا تھا‘ اس وقت تک فریال بے سدھ سورہی ہوتی تھی‘ مگر آج وہ خلاف معمول جلدی اٹھ گئی تھی‘ دانش کچھ دیر وہیں لیٹا اس کا انتظار کرتا رہا‘ پھر اٹھ کر واش روم میں گھس گیا تھا‘ اس کے واش روم سے واپسی تک بھی فریال وہاں نہیں آئی تھی‘ دانش کو ناشتہ تیار کرنا تھا‘ اس لیے وہ کمرے سے نکل کر کچن میں آگیا تھا‘ وہاں فریال پہلے سے موجود تھی۔

’’آج صبح صبح تم کچن میں کیا کررہی ہو؟‘‘ فریال کو کچن میں کھڑے دیکھ کر دانش نے دریافت کیا تھا۔

’’بس آج ذرا جلدی آنکھ کھل گئی تھی‘ اس لیے کچن میں آگئی۔‘‘

’’پچھلے دو تین دن سے تم آفس بھی نہیں جارہی ہو۔‘‘

’’اب آفس میں رکھا ہی کیا ہے‘ آفس چلانے والا جیل جا پہنچا اور آفس کو تالے لگ گئے۔‘‘

’’مگر اس طرح کب تک چلے گا؟‘‘

’’وہ بھی دیکھ لیں گے لیکن آج تم کچن میں نہیں آؤ گے۔ آج میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری پسند کے کھانے تیار کروں گی۔‘‘

’’اس مہربانی کی وجہ؟‘‘

’’فی الحال اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں‘ کوئی جواب نہیں‘ تمہارے سب سوالوں کے جواب تمہیں مل جائیں گے‘ ابھی تم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھو میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔‘‘

فریال کی بات سن کر دانش کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا اور وہ کچھ سوچتے ہوئے فریال کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے فوراً بولا ’’میں چاہتا ہوں۔ آج تمہارے گھر والوں کو بھی بلالیا جائے۔‘‘

دانش اپنی بات مکمل کرنے کے بعد فریال کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا تھا‘ فریال کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا تھا‘ اس کی یہ کیفیت دانش سے چھپی نہیں رہ سکی تھی‘ مگر فریال نے فوری طور پر خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا ’’انہیں پھر کبھی بلالیں گے۔‘‘

''پھر کبھی کیوں' میرے خیال میں آج بلانا زیادہ مناسب رہے گا۔''

''ٹھیک ہے' جو تمہاری خوشی۔''

فریال کی بات سن کر دانش خاموشی سے کچن سے نکل گیا تھا' جبکہ فریال ناشتے کے لیے پراٹھے بنانے میں لگ گئی تھی۔

دانش نے عمر کو بھی اٹھا دیا تھا' جب تک وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچا' فریال ناشتہ میز پر رکھ چکی تھی' اسی دوران علی بھی آنکھیں ملتا ہوا وہیں آ گیا تھا' اسے دیکھتے ہی فریال نے پیار سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا تھا' ایک مدت بعد ماں نے بیٹے کو اس قدر پیار سے اپنی گود میں بٹھایا تھا کہ وہ بھی اس سے چمٹ گیا تھا' ایک عرصے کے بعد وہ چاروں ایک ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے' ناشتے سے فارغ ہوتے ہی عمر جلدی سے اپنا بیگ اٹھا کر اسکول کے لیے نکل گیا تھا' دانش اور علی ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے تھے' جبکہ فریال برتن سمیٹنے لگی تھی۔

''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بازار سے لا دوں؟'' یہ جانتے ہوئے بھی کہ گھر میں ضرورت کی ہر چیز پہلے سے موجود تھی' دانش نے پوچھ لینا مناسب سمجھا تھا۔

''ضرورت ہوگی تو میں بتا دوں گی۔'' دانش کے سوال پر فریال نے مختصر جواب دیا تھا' اس کے بعد دوپہر تک وہ کچن میں گھسی رہی تھی' اس لیے ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی' اس دوران فریال' علی کے لیے دودھ کا فیڈر بھی تیار کر کے دے گئی تھی' مگر ان میں کسی قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

''السلام علیکم آنٹی! میں دانش بول رہا ہوں۔'' ساس کے فون اٹھانے پر دانش نے کہا تھا۔

''جیتے رہو بیٹا! گھر میں سب کیسے ہیں؟'' داماد کے سلام کرنے پر فریال کی ماں نے دریافت کیا تھا۔

''آنٹی بس آپ کی دعائیں چاہئیں۔''

''ہماری دعائیں تو تم لوگوں کے لیے ہی ہیں بیٹا۔''

''آنٹی! آج فریال نے انکل اور آپ کو دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔''

''اچھا...... مگر کس خوشی میں؟''

''بس آنٹی! آپ لوگوں سے ملنے کا بہانہ ہے اور تو کچھ نہیں' ویسے بھی آپ کو ہمارے ہاں آئے کتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو' ہم آ جائیں گے۔''

''اچھا آنٹی! اللہ حافظ۔''

''خدا حافظ بیٹا۔''

فون بند ہو گیا تھا اور دانش ایک بار پھر علی کے پاس ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا تھا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی تھی' فریال مسلسل کچن میں کھڑی کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی' کچن سے اٹھنے والی کھانوں کی خوشبو' نہ صرف دانش کو پاگل کر رہی تھی' بلکہ اس کی بھوک بھی بڑھا رہی تھی' عمر بھی وقت پر اسکول سے واپس آ گیا تھا اور اسکول یونیفارم تبدیل کر کے ٹی وی لاؤنج میں ہی باپ اور بھائی کے پاس بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا تھا۔

فریال کے امی اور ابو بھی وقت پر ہی آ گئے تھے' فریال ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلک پڑی تھی' دانش کے منہ سے اچانک انہیں بلانے کے بارے میں سن کر ہی فریال کے دل میں طرح طرح کے سوال جنم لینے لگے تھے' مگر اس نے دانش سے اس

بارے میں کوئی وضاحت طلب نہیں کی تھی' اب انہیں سامنے پا کر اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ دانش نے انہیں بلاوجہ وہاں نہیں بلایا تھا' کھانا تیار ہو چکا تھا' اس لیے فریال ان کے پاس ہی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی۔

''آنٹی سنا ہے آج کل لڑکیاں اپنے خاوند سے طلاق بھی ایسے مانگنے لگی ہیں'...... جیسے وہ اس سے کسی تحفے کی فرمائش کر رہی ہوں۔'' دانش نے بلا تمہید بات کا آغاز کیا تھا اور کن اکھیوں سے فریال کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بھی جائزہ لینے لگا تھا' جس کے چہرے کی رنگت ایک دم زرد پڑ گئی تھی' ایسا دکھائی دینے لگا تھا' جیسے کسی نے اچانک اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔

''بس بیٹا! خدا ہدایت دے ایسی لڑکیوں کو...... جو یہ نہیں سمجھتیں کہ طلاق لڑکی کے ماتھے پر لگا وہ داغ ہوتا ہے' جو زندگی بھر کسی بھی طرح مٹ نہیں پاتا۔'' داماد کے سوال پر ساس نے کہا تھا۔

''لیکن' مجھے انتہائی افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی بیٹی بھی یہی تحفہ مجھ سے مانگ رہی ہے۔''

''یہ میں کیا سن رہا ہوں فریال؟'' دانش کی بات سن کر آنٹی تو کچھ کہہ نہیں پائی تھی' مگر انکل نے دل میں اٹھنے والے درد کی وجہ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فریال سے دریافت کیا تھا۔

''انکل پلیز' آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کے سامنے ہر بات کھول کر رکھ دیتا ہوں اگر آپ مجھے قصوروار پائیں تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں ورنہ آپ کی بیٹی آپ کے سامنے ہے۔''

فریال کو جس بات کا ڈر تھا' وہی ہوا تھا اور وہ آنسو بہانے لگی تھی' اس لیے دانش نے انتہائی محتاط انداز میں بات کی تھی اور پھر شروع سے آخر تک تمام تر تفصیل بیان کرنے لگا تھا۔

......☆☆☆......

کچھ ہی دیر بعد فریال نے میز پر کھانا لگا دیا تھا' فریال نے دانش کی پسند کی چکن بریانی' شامی کباب' رائتہ اور سلاد تیار کیا تھا' ساتھ بھنی ہوئی دال ماش اور روٹی بھی بنائی تھی' اپنی پسند کا کھانا دیکھ کر دانش کی بھوک مزید چمک اٹھی تھی۔

''ہو سکتا ہے آج ہم آخری بار اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہوں' شاید اب زندگی اتنی مہلت نہ دے کہ ہم پھر کبھی ایک ساتھ بیٹھ پائیں۔'' کھانا شروع کرنے سے قبل فریال نے بھرائی ہوئی آواز میں بات کی تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' فریال کی بات سن کر' دانش کا کھانے کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا تھا اور اس نے حیران ہو کر فریال کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''یہ کام تو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا' لیکن میں ان لوگوں کا انجام دیکھنے کے لیے زندہ تھی' جو اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے دوسروں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔''

''مرنا اتنا بھی آسان نہیں' جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔''

''مگر میرے لیے تو جینا' مرنے سے کہیں زیادہ دشوار ہو چکا ہے۔''

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں کبھی ایسا کرنے دوں گا۔ ویسے بھی خودکشی کمزور لوگ کیا کرتے ہیں اور تم تو ایک بہادر لڑکی ہو۔''

''یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود بھی اف تک نہیں کہا' جبکہ میں تمہارے

ذرا سالیٹ آنے پر ہی آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ تم چاہتے تو مجھے اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکتے اور میرے بچوں کو بھی مجھ سے چھین لیتے‘ یہ کیا کم ہے کہ تم نے میری اتنی سنگین غلطیوں کے باوجود بھی اپنا کوئی حق استعمال نہیں کیا۔“ بات کرتے ہوئے فریال بلک پڑی تھی‘ ماں کو روتا دیکھ کر دونوں بچے بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے لپٹ گئے تھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے‘ پاس بیٹھے فریال کے والدین کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

”تم کیا سمجھتی ہو‘ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو کیا ہم زندہ رہ پائیں گے۔ ہماری زندگی تم سے جڑی ہے اور تمہارے نہ ہونے کی صورت میں ہم تو جیتے جی مر جائیں گے...... تم میری بیوی ہی نہیں‘ میرے بچوں کی ماں بھی ہو‘ میں تمہاری خاطر دنیا تو چھوڑ سکتا ہوں مگر تمہیں اپنی زندگی سے نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”میں کیا کروں دانش‘ میں آتے جاتے اپنی طرف اٹھنے والی انگلیوں کا سامنا نہیں کر پاتی اور ہر انگلی کو کاٹ ڈالنا بھی میرے بس میں نہیں۔ یقیناً میری وجہ سے کسی کے سامنے سر اٹھا کر چلنا تو ایک طرف‘ تم کسی سے آنکھ بھی نہیں ملا پاتے ہوگے مرنا تو ایک دن ہے ہی‘ پھر روز روز مرنا اور مر کر جینا کیسا‘ بہتر ہے میں ایک بار ہی موت کو گلے لگا لوں۔“

”کبھی کبھی تو میں بھی لوگوں کی آنکھوں سے اٹھنے والے سوالوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہوں‘ اس وقت جی چاہتا ہے کہ سامنے والے کا گلا گھونٹ ڈالوں یا پھر خود کو ختم کر لوں مگر میں ایسا کچھ بھی نہیں کر پاتا‘ یہ سچ ہے کہ کچھ عرصے سے میں جس کیفیت سے گزر رہا ہوں‘ کئی لمحے ایسے بھی آئے جب میں بھی کمزور پڑ گیا تھا اور تمہیں طلاق دینے کا سوچنے لگا تھا۔ شاید میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا طلاق دے بھی چکا ہوتا لیکن اوپر والے کا کرم ہے کہ اس نے مجھے جذبات میں بہنے سے روکے رکھا۔“

دانش کی باتیں سن کر فریال کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی‘ اس لیے وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی‘ علی اور عمر بھی مسلسل روئے جا رہے تھے۔

اپنے بیوی بچوں کو روتے دیکھ کر دانش کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے‘ اس لیے کچھ دیر کے لیے وہ بھی خاموش رہا تھا‘ پھر ہمت کر کے بولا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جتنی جلدی ممکن ہو سکا‘ یہ گھر چھوڑ کر یہاں سے دور کسی ایسی جگہ جا بسیں گے‘ جہاں ہم پر انگلی اٹھانے والا کوئی نہ ہوگا۔“

......☆☆☆......

کچھ روز بعد رات کی تاریکی میں سامان سے لدا ٹرک اس گھر سے دور ہوتا جا رہا تھا‘ جس گھر سے ان کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں‘ جہاں انہوں نے زندگی کے بہت سے قیمتی پل ایک ساتھ بتائے تھے۔

تمت بالخیر

پختہ کار

راجپوت اقبال احمد

ایک ایسے بوڑھے کا احوال جو قسمت پر یقین رکھتا تھا۔ لوگ اس کے خیالات کا مذاق اڑاتے تھے لیکن ہر روز کا نیا سورج اس کے یقین میں اضافہ کرتا تھا۔ آخر ایک روز اس کی قسمت کو رحم آ ہی گیا۔

باذوق قارئین کے لیے ایک ہلکی پھلکی تحریر

پانی پر ناچتی ہوئی سورج کی تیز کرنیں مینولی کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں۔ ”کہاں؟“ اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس جھیل کے پار‘ جہاں پہاڑی پر چڑھتی ہوئی پگڈنڈی نظر آ رہی ہے۔ نظر آ رہی ہے نا؟“ پھٹے پرانے کپڑے پہنے کسان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”ہاں نظر آ رہی ہے۔“

”وہ ان صنوبر کے درختوں کے عقب میں ایک سفید مکان ہے تنہا‘ ہے نا؟“

”ہاں۔“ مینولی نے آنکھیں سکیڑ کر بغور اس طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ نہ جانے کب سے وہ اس وقت کا منتظر تھا۔ ”کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ انگریز رہتا ہے؟ تمہیں یقین ہے نا اینڈریس‘ کہیں تم ہمیشہ کی طرح مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”مجھے ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا۔“ اینڈریس نے کامل سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اس نے گاؤں کے پادری سے سنا تھا۔“

”تو پھر بہتر ہوگا کہ اب میں چل دوں۔“ مینولی بولا۔ ”ان غیر ملکیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ عقل تو ان میں نام کو نہیں ہوتی۔ بس صرف گوشت پوست کے آدمی ہوتے ہیں‘ بے حس! میں نے اس موقع کے انتظار میں بڑا وقت برباد کیا ہے۔“

”تمہاری بکریوں کا کیا ہوگا؟“

”ان کا؟ وہ انتظار کر سکتی ہیں۔ جب میں اس آدمی کو ڈھونڈ لوں گا اور وہ میرے کاغذ پر اپنی زبان میں لکھ دے گا تو پھر مجھے ان بکریوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے دوست! تم میری ساری بکریاں لے لینا۔ میں ان بکریوں کو امریکہ لے جا کر کیا کروں گا۔“

”تمہاری واپسی تک میں ان کی دیکھ بھال کروں گا مینولی۔“ اینڈریس بولا۔ ”نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے‘ ضروری نہیں کہ جو تم سوچ رہے ہو ویسا ہی ہو‘ میرا مطلب ہے‘ فرض کرو کہ تمہارا کاغذ......“ وہ چپ ہو کر بے چینی سے اپنے دوست کو دیکھنے لگا۔

”تمہیں اعتبار نہیں آ رہا۔“ مینولی بولا۔ ”یہ کاغذ بے حد قیمتی ہے۔ میں نے اسے پانچ سال سے اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”حالانکہ پہلے مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ سمندر میں سے بہتا ہوا ٹھیک اسی جگہ آ گیا تھا۔ جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ میں اس وقت

یہاں بیٹھا تھا اور یہ کسی سانپ کی طرح بہتا ہوا میرے قریب آ گیا تھا۔ مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا 'میں نے اسے پانی سے نکالا اور اس چٹان پر سوکھنے کو ڈال دیا۔ پھر وہ جو آدمی ایتھنز سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ کیا چیز تھی۔''

''کیا بتایا تھا اس نے؟'' اینڈریس نے پوچھا حالانکہ وہ یہ داستان پہلے بھی کئی مرتبہ مینولی کی زبانی سن چکا تھا۔

''اس نے بتایا کہ یہ سب قیمتی کاغذ ہیں۔ اس نے اس قسم کے کاغذات پہلے بھی دیکھے تھے جب وہ انگلینڈ جانے والے ایک اسٹیم شپ پر ملازمت کرتا تھا۔ اس قسم کے کاغذات پر انگریزی میں کچھ مناسب الفاظ لکھنے پڑتے ہیں اور پھر دولت کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ ایتھنز سے آنے والا وہ آدمی میری بہن کے شوہر کا دوسرا بھتیجا تھا۔''

''ٹھیک ہے' کچھ بھی ہو' میں ابھی تمہاری بکریاں قبول نہیں کر سکتا۔'' اینڈریس بولا۔

''کوئی بات نہیں' آؤ کیفے میں چل کر ایک ایک کپ چائے پئیں۔''

مینولی بولا۔''میں تمہیں اپنا کاغذ پھر دکھاتا ہوں۔''

کنارے کے ساتھ ساتھ پہاڑ میں چھوٹے بڑے غار بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک کے اندر کسی آدمی نے میز کرسیاں ڈال رکھی تھیں۔ غار کے باہر کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا جس کے سائے میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ وہاں پانی کی گنگناہٹ اور اونگھتی ہوئی بکریوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رات کے وقت ایک لکڑی کے کھمبے کے ساتھ ایک لیمپ ٹکا دیا جاتا جس کے گرد پروانے اڑتے رہتے۔ لوگ میزوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے اور بکریاں ادھر ادھر گھومتی رہتیں' پھر دو چار مچھیرے بھی آ جاتے۔ اس کے بعد گٹار اور بانسری کی دھن پر رقص شروع ہو جاتا۔ یہ کیفے بڑی اہم جگہ تھی۔ مینولی کو اسی جگہ اس کاغذ کی قیمت کا پتا چلا تھا۔

مینولی جب اپنے دوست کے ساتھ وہاں پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا اور کیفے خالی پڑا تھا۔ پھر بھی اپنی جیب سے اس قیمتی کاغذ کو نکالنے سے پہلے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر مطمئن ہو کر اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ یہ بڑی نفاست سے تہ کیا ہوا ایک گندا سا کاغذ تھا جو بوڑھے مینولی کے پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ باہر سے گھوڑے کے چمڑے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''بڑا گندا ہو گیا ہے؟'' اینڈریس بولا۔

''یہ آدمی کی محنت کا پسینہ ہے جو اس پر لگا ہے۔'' مینولی اسے گھورتا ہوا بولا۔''پسینہ وہ ثمر بار برسات ہے جو آدمی کی محنت کی کھیتی کو سیراب کرتا ہے۔''

اینڈریس نے متاثر ہو کر سر ہلا دیا۔''اور اگر تمہیں یہ رقم مل جائے گی تو تم کیا کرو گے؟ ہم بوڑھے آدمی تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ رقم کیسے خرچ کی جاتی ہے۔ اس رقم کو خرچ کرنے کے لیے تمہیں جوان ہونا چاہیے تھا۔''

''الیکٹرا کو تو بھول گئے تم؟'' مینولی بولا۔

اینڈریس واقعی بوڑھے مینولی کی پوتی الیکٹرا کو بھول ہی گیا تھا۔ الیکٹرا کے بارے میں مینولی کے خیالات سن کر ہر آدمی ہنستا تھا۔ وہ انتہائی حسین لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ کیفے کی کھردری دیواریں اس کی بنائی ہوئی تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔

ان کسانوں یا مچھیروں میں ایک بھی نوجوان ایسا ں تھا جو اس سے شادی کرنے کے قابل ہوتا۔

''میں جانتا ہوں' میں جانتا ہوں۔'' مینولی اپنے ساتھی کے خیالات پڑھتا ہوا بولا۔''ان وگوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ وہ اس کا سجائے۔ اس کے علاوہ وہ پیدائشی مصورہ ہے۔ ں یہ رقم میرے ہاتھ لگ جانے دو' میں اسے لے امریکہ چلا جاؤں گا۔ جہاں تیس سال پہلے ے سارے بھائی جا بسے ہیں' وہ وہیں کے ل ہے۔ یہاں تو دھوپ اور مٹی عورت کو کوئلے ی طرح سیاہ بنا دیتے ہیں اور عورتیں اس وقت ہر سال بچہ جنتی رہتی ہیں جب تک سوکھ کر چمڑا ہو جائیں۔''

اینڈریس اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے سب کچھ کر اس کی تائید کر رہا ہو۔

الیکٹرا رات کے وقت اس کیفے میں آتی تھی گاہکوں کو شراب پیش کیا کرتی تھی۔ جب وہ ان وں کے گرد چکراتی تو لوگ نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہتے۔ شراب سے زیادہ الیکٹرا کا حسن انہیں مدہوش کر دیتا تھا۔ وہ سرد راتوں میں ایک ایسی آگ تھی جو لوگوں کی رگوں میں خون گرما دیا کرتی تھی۔

مینولی نے بڑی احتیاط سے کاغذ کھولا۔ وہ کئی تہوں میں مڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت پر جمے ہوئے میل نے اسے سخت کر دیا تھا۔ پھر مینولی نے اسے میز پر پھیلا دیا۔ یہ کاغذ بہت پرانا تھا۔ یہ منسوخ شدہ تاریخ کا قدیم فٹ بال پول کوپن تھا۔ دونوں افراد بڑی عقیدت سے اس پر لکھے ہوئے غیر ملکی حروف کو دیکھنے لگے۔

''تو یہ ہے۔'' اینڈریس ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

'وہ خاموشی سے شراب پیتے رہے اور ساحلی ہوا یوکلپٹس کے درختوں میں سے گزر کر میدانی ریت کو اڑاتی ہوئی پہاڑیوں کی طرف لے جاتی رہی۔ مینولی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آدمی دعا کرتا رہے' محنت کا پسینہ بہاتا رہے' پھر دیکھیے کہ قسمت

آپ دُنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ آنچل
ماہنامہ نئے اُفق
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
مڈل ایسٹ' ایشیا' افریقہ' یورپ کے لیے 6000 روپے
بیانڈ ڈرافٹ' منی آرڈرز' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز کمرہ نمبر: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
+922-35620771/2 فیکس: +922-5620773 Email:circulationngp@gmail.com

کس طرح بدلتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ رہی تھی۔ نہ جانے امریکہ کیسا ہو؟ حسین و نوخیز الیکٹرا کو کبھی یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ اس کا بوڑھا دادا کس طرح سورج کی تپش اور ریت کے طوفانوں میں سوکھتا رہا اور کس طرح اسے اس جہنم سے نکال کر بہشت ارضی میں لے آیا تھا۔

''اور اب میں چلا۔'' مینولی اچانک بولا۔ اس نے کاغذ سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں سڑک پر ہولیتا ہوں' یہاں تک کہ ٹرک ڈرائیور مل جائے پھر میں اس پر سوار ہو کر اس انگریز کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

☆......☆......☆

یہ پہاڑی پر استادہ سفید مکان سورج کی روشنی میں شکر کے ڈھیر کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا واحد مکین جسے اینڈریس نے انگریز بتایا تھا۔ اپنی کھڑکی کے شیشے سے مینولی کو آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا میں کبھی خود کو یونانی' کبھی فرانسیسی' اور کبھی اطالوی ظاہر کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بکری کی طرح زرد تھیں جن میں بڑی خوفناک چمک تھی۔ شیشے کے عکس کی وجہ سے اس کا جسم کسی چیتے کے جسم کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں پڑے ریوالور کے بٹ پر تھا۔

''کون ہے؟'' وہ انگریزی میں چلایا۔ ''قریب مت آنا۔'' پھر وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ شاید طویل تنہائی نے اسے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔

مینولی بڑی معصومیت سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں فٹ بال کا کوپن تھا اور دوسرے میں ایک چھوٹی سی گھسی ہوئی پینسل۔ اس شخص نے ریوالور واپس ہولسٹر میں ڈالا اور دروازہ کھول کر نکل آیا۔ وہ مینولی کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''تمہارا مکان بڑی خوبصورت جگہ پر ہے انگلش مین۔'' مینولی بولا۔ ''مگر یہاں تک پہنچنے کے لیے آدمی کو بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔'' بوڑھا بہت ساری اونچی نیچی پہاڑیاں طے کر کے یہاں تک آیا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ غرایا اور مینولی حیرت سے اس کی صورت تکنے لگا۔ اسے اس طرح کے استقبال کی توقع نہیں تھی۔

''آپ کا مکان بہت خوبصورت ہے جناب' بہت اچھا۔'' مینولی نے خلیق لہجے میں کہا۔ ''میں جھیل کے اس پار والے جزیرے سے آیا ہوں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''بوڑھے آدمی کے لیے یہ بڑا لمبا سفر ہے مگر آپ جیسے جوانوں کے لیے تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ہاں ایک وقت تھا کہ میں......''

''میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں؟''

''مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔'' مینولی کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟''

''پتا؟ ہر شخص کو پتا ہے کہ یہاں ایک انگریز رہتا ہے۔''

''اچھا! اور میرے خیال میں وہ اس بارے میں باتیں بھی کرتے ہوں گے۔''

''لوگ تو باتیں کرتے ہی ہیں۔'' مینولی سادگی سے بولا۔ ''اسی وجہ سے تو میں یہاں ایک درخواست لے کر آیا ہوں کہ آپ ذرا میری مدد

کردیں۔''

انگریز آدمی خوفناک نظر سے مینولی کو کاغذ کھولتے دیکھتا رہا اور جب اس نے قدیم کوپن دیکھا تو اس کے حلق سے قہقہہ پھوٹ پڑا۔

''آپ اس کاغذ کے بارے میں جانتے ہیں ناں؟''

''تمہارے ہاتھ یہ کہاں سے لگ گیا بوڑھے آدمی؟''

''یہ سمندر میں بہتا ہوا آیا تھا اور میں نے اسے نکال لیا۔ اسی وقت سے میں کسی انگریز کا انتظار کر رہا تھا' اس پر کچھ لکھ دے تا کہ مجھے رقم مل جائے۔''

اس نے انگریز کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا بنتا دیکھا۔

''یہ بڑی آسان سی بات ہے۔'' مینولی نے سمجھایا۔ ''بس چند حروف لکھنے ہیں اور جب مجھے اس کی رقم مل جائے گی تو میں شکریے کے طور آپ کو بھی ضرور کچھ نہ کچھ پیش کروں گا۔''

''کیا یہ اتنی ہی آسان بات ہے؟'' وہ شخص پھر بولا' مگر اس کا انداز بڑا تضحیک آمیز تھا۔ ''تمہیں کس کی توقع ہے میرے بوڑھے دوست اور مجھ سے معجزے سرزد نہیں ہوتے' میرا مشورہ ہے کہ اسے پھاڑ کر پھینک دو اور جس طرف سے آئے اس طرف چلے جاؤ اور میرے بارے میں بھول جاؤ' تم اپنے لوگوں سے بھی کہہ دینا کہ میرا تذکرہ کبھی ان کی زبان پر نہ آئے۔''

مینولی نے ایک نظر اس شخص کے چہرے پر ڈالی پھر اپنے کوپن کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ بڑی احتیاط سے اسے دوبارہ تہ کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انگریز پہلے کس بات سے اتنا محظوظ ہو کر ہنسا تھا اور اب کیوں غصہ ہو رہا تھا۔ اسے سورج کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم دس سال زیادہ بڑا ہو گیا ہو' جب وہ مڑا تو اس کے کندھے اور بھی جھکے ہوئے تھے۔ یہ آدمی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اب نہ جانے پھر اسے کتنے سال اور انتظار کرنا پڑے۔

مینولی سر جھکائے پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ انگریز وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا' پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اسے یہاں کسی کی مخالفت مول لینا نہیں چاہیے' اس طرح اس کی موجودگی اور زیادہ مشتہر ہو جائے گی۔ ''ایک منٹ بوڑھے آدمی۔'' وہ چلایا۔ ''ذرا واپس آنا۔''

مینولی مڑ کر پھر اس کے قریب آگیا۔

''میں معجزے نہیں دکھا سکتا۔'' انگریز بولا اور اس کے ہاتھ سے کوپن لے کر دیکھنے لگا۔ ''اتنے گندے کاغذ پر آخر کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔''

''یہ گندگی نہیں ہے بیٹے' یہ پسینہ ہے۔'' مینولی ناصحانہ انداز میں بولا۔ ''آدمی کو اپنے پسینے سے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ انسان کی مشقت کا تلخ رس ہے۔ یہ ایک ایسی ثمر بار برسات ہے جو پہاڑوں کو بھی گلزار بنا سکتی ہے۔''

''پھر تو شاید معجزہ ہو ہی جائے۔''

''مجھے پورا یقین ہے۔''

انگریز نے اپنی جیب میں سے ایک موٹا سا لفافہ نکالا اور ایک لمحے تک دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ ''یہ کوپن اور پینسل مجھے دو' میں اس پر لکھ دیتا ہوں۔'' اس نے کوپن لفافے پر رکھا۔ ''پسینہ اور یقین' بس اسی سے چپکے رہو' تمہاری صحت بحال

رہے گی دوست! مگر میرا فلسفہ اس سے مختلف ہے۔ میں تیزی اور صفائی سے کام کرنے کا قائل ہوں۔''

وہ کوپن پر الٹے سیدھے حروف لکھنے لگا اور مینولی اسے عقیدت آمیز نگاہ سے دیکھتا رہا۔ انگریز نے پینسل کی نوک کو دیکھا۔

''پسینہ! اور محنت! تم لوگوں کو اس سے محبت ہے نا؟ اسی لیے تمہاری پینسل بھی لوہے کی طرح سخت ہے۔ مجھے اس سے لکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے ہل چلا رہا ہوں۔''

''سخت چیزیں زیادہ دیرپا ہوتی ہیں۔'' مینولی بولا۔

''اب کے تم نے کام کی بات کی ہے۔ سخت چیزیں واقعی بہت دیرپا ہوتی ہیں۔ مگر تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔'' وہ بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟ اور تم کہاں رہتے ہو؟'' اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

مینولی نے اسے بتادیا۔

اس نے کاغذ کو لفافے پر کھسکایا اور اس کا نام اور پتا لکھ دیا یہ لکھ کر اس نے لفافہ جیب میں رکھا' یہ تم میرے پاس چھوڑ جاؤ۔'' اس نے کوپن لہراتے ہوئے کہا۔ ''اب تم گھر جاؤ اور اپنا پسینہ بہاتے رہو لیکن اس طرف کبھی مت آنا' سمجھے اور لوگوں میں یہ بات پھیلا دینا کہ مجھے ملاقاتی پسند نہیں ہیں۔''

مینولی نے کمر سیدھی کی اور کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ پھر اس نے گلا صاف کیا۔ ''جناب!'' وہ بولا۔ ''آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔''

''اب تم یہاں سے چل دو' مجھے اور بھی کام ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جناب! ناراض نہ ہوں۔ آپ کے طریقے ہمارے طریقوں سے بہت مختلف ہیں۔ جب رقم آجائے گی تو میں یہاں پھر آؤں گا اور پھر ہم خوب پئیں گے اور تھوڑا سا رقص کریں گے' میرا ایک دوست ہے جو بڑی اچھی بانسری......''

انگریز مڑا اور مکان میں جاکر دروازہ بند کرلیا۔

کھڑکی میں کھڑے ہوکر وہ مینولی کو پہاڑی سے اترتا دیکھتا رہا۔ جب مینولی بالکل چیونٹی کی طرح دکھائی دینے لگا تو اس نے کوپن کی دو تین تہیں کیں اور اسے پھاڑ کر فرش پر اچھال دیا۔ ''پسینہ اور یقین۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''کرتے رہو زندگی بھر انتظار بوڑھے آدمی! تمہارا پسینہ تمہیں دولت کے ڈھیر کے کبھی اتنا قریب نہیں کرے گا جتنا تم آج آگئے تھے۔'' اس نے اپنی جیب میں موٹے لفافے کی موجودگی محسوس کی جسے اس نے کوپن پر لکھنے کے لیے ایک میز کی طرح استعمال کیا تھا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔

☆......☆......☆

رات ہوتے ہی اس شخص نے کھڑکی کے قریب کرسی کھینچ لی اور اس پر بیٹھ کر وادی میں نیچے تک اترتی سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ یہاں دو ہفتوں سے کسی کار کا منتظر تھا جو یقیناً جلد ہی آنے والی تھی۔ وہ ایک لمحے کے نوٹس پر یہاں سے بھاگنے کے لیے تیار تھا۔ اسے صرف یہ بھورا موٹا لفافہ دینا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جیب تھپتھپا کر لفافے کی موجودگی کا یقین کیا۔ اس کے اندازے میں ذرا بھی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ وہ ایجنٹوں کے عظیم جال کا محض ایک چھوٹا سا پرزہ تھا۔ انہوں نے اسے اس پہاڑی پر انتظار کرنے کی ہدایت کی تھی۔ جب کار آجاتی تو اسے وہ لفافہ ان کے حوالے کرنا تھا اور پھر اس کا کام ختم ہوجاتا۔ اسے اپنے کام کی اجرت مل چکی تھی۔ اس دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی آیا کہ کہیں ان لوگوں کو پولیس نے نہ پکڑ لیا ہو۔ یہ خطرہ تو بہرحال ہر وقت ان کے سر پر منڈلاتا ہی رہتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے کار کو آنے میں اتنا وقت لگ گیا تھا پھر تو...... پھر تو...... اس کا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ یہ لفافہ اس کی اپنی ملکیت بن سکتا تھا۔

برآمدے سے باہر' ہوا سوکھے پتوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کو اڑا رہی تھی۔ وہ متفکر سا انہیں دیکھنے لگا۔

''یقین!'' وہ بڑبڑایا۔ اب بوڑھا آدمی بیٹھا رہے گا' سالوں انتظار کرتا رہے گا' یہاں تک کہ اس کی زندگی کا تار ٹوٹ جائے گا۔ اس نے معجزوں کے منتظر لوگوں کا یہی حشر دیکھا تھا۔ آدمی کو اپنی دنیا آپ بنانی چاہیے۔ قسمت تو صرف ایسے ہی بوڑھوں کے لیے ایک دلکش لفظ تھا جن کے جسموں میں خون کی جگہ پانی دوڑ رہا ہو۔ ''میری قسمت میری بغل کے نیچے ہے۔'' وہ خود سے بولا۔ ''میں اپنے معجزے اپنی انگلیوں کی مدد سے دکھاتا ہوں۔ معجزوں سے بھرا ہوا لفافہ......''

فضا میں تاریکی کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ آسمان پر تاروں کی محفل سجی ہوئی تھی مگر تاریکی دور کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ دور دور تک کسی کار کی ہیڈ لائٹس کے نشان نہیں تھے۔ وہ اٹھ کر اندر کے کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہ کار اسی وقت آئی تھی۔ اس کی روشنیاں درختوں کو چمکارہی تھیں پھر پہاڑی سڑک پر روشنی کی لکیریں تیرنے لگیں۔ وہ شخص اندر ہونے کی وجہ سے انہیں مکان کی طرف بڑھتے نہ دیکھ سکا۔ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ نہ جانے کس وقت آدبوچے۔

جب اس نے مکان میں کسی کے قدموں کی آواز سنی تو اسے بہت دیر ہوچکی تھی۔ کھڑکی میں سے یہ دیکھ کر بھی کہ کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا اور آنے والے یونیفارم میں تھے' اس نے مکان سے باہر چھلانگ لگاتے ہی اپنی پشت میں گرم گرم سیسہ اترتے محسوس کیا۔ اس کے منہ میں نوالہ پھنس کر رہ گیا جسے وہ نہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔ سڑک کی طرف رینگتے ہوئے اسے دوسری گولی لگی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

جب انہوں نے اس کی لاش اٹھائی تو سڑک کے قریب پتھروں پر پڑا ہوا بھورا موٹا لفافہ انہیں نظر نہ آسکا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑے رہے' پھر کار ان کے قریب آ کر رکی۔ انہوں نے لاش اس کی عقبی سیٹ پر رکھی اور روانہ ہوگئے۔ اب پھر وہاں پہلے کی طرح سناٹے کا راج تھا۔ صرف مکان میں ادھ کھائی روٹی اور پتھروں کے درمیان پڑا ہوا لفافہ ہی اس بات کا مظہر تھا کہ یہاں کبھی کوئی آدمی رہتا تھا۔

صبح ایک کسان اپنے گدھے پر سامان لادے اس طرف سے گزرا۔ اگر اس کا گدھا خون کے نشانات سونگھنے وہاں نہ رک جاتا تو کسان کو وہ لفافہ کبھی نظر نہ آتا۔ اس نے لفافہ اٹھا کر غور سے دیکھا۔ اس پر کسی کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ تحریر مدھم تھی مگر آسانی سے پڑھی جاسکتی تھی۔

☆......☆......☆

سمندر کے قریب جہاں سے سڑک گزرتی تھی‘ یوکلپٹس کے درختوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی ہوادار جگہ تھی۔ جو مینولی نے اپنے بیٹھنے کے لیے منتخب کی تھی۔ وہ یہاں ٹرک ڈرائیور کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کے لیے اس کاغذ کے بدلے ضرور انگلینڈ سے رقم لے کر آئے گا۔ وہ یہاں بڑے اطمینان سے بیٹھا مونچھوں کو سہلاتا اور ٹھنڈی ہوا میں اپنے سینے کا پسینہ سکھاتا رہتا تھا۔ اس کی بکریاں اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی آس پاس پھرتی رہتی تھیں۔ اسے اس سایہ دار کنج میں انتظار کرتے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ اینڈریس سڑک کو پار کر کے اس کنج میں آ گیا۔

''تم ابھی تک کاہلی کے مزے لے رہے ہو۔'' وہ آتے ہی بولا۔ وہ اس وقت اپنے کھیت پر محنت کر کے آیا تھا۔ اس کے چہرے اور بالوں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ جب میرا جواب آئے تو میں یہاں موجود رہوں۔'' مینولی سادگی سے بولا۔ ''مجھے اس کیفے والے بڈھے شیطان پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔''

پگڈنڈی پر دھوئیں کا ایک غبار سا اٹھا اور وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔ ٹرک کچے سے پکے پر آیا۔ اور پھر ان کے قریب آ کر رک گیا۔

''مینولی!'' ٹرک ڈرائیور اپنی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلایا۔

''آیا!'' بڈھا کھڑا ہو کر بلند آواز میں بولا۔

ڈرائیور نے گھوم کر اپنے تھیلے میں سے ایک موٹا بھورا لفافہ نکالا جو اسے راستے میں گدھے والے نے دیا تھا۔ لفافہ بڑا موٹا اور بھاری تھا۔

''مینولی! یہ اپنی امانت سنبھالو اور ڈاک کا خرچہ ادا کرو۔ اس پر کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔'' ڈرائیور منہ بنا کر بولا۔ ''تمہارے دوست تمہیں ایک ٹکٹ کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ کیسے دوست ہیں تمہارے؟''

مینولی نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لیا اور اس کی تحریر دیکھنے لگا۔ الفاظ کاربن کاپی کی طرح کے مدھم تھے۔ بھورے بھورے حروف جیسے لکھنے والے نے بہت دباؤ دے کر لکھا ہو۔ اس کے کنارے پر ایک کراس کا نشانہ بنا ہوا تھا جو وہ نہیں دیکھ سکا۔ مینولی نے لفافہ کھول کر اندر جھانکا۔ اس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے ایک طویل سانس نکل گیا۔ اینڈریس نے بھی جھک کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

''تو وہ بات سچ ہی تھی۔'' وہ بڑبڑایا اور مینولی نے جلدی سے سر ہلا دیا۔

''یہ صرف انتظار اور یقین کی بات تھی یقین پختہ ہو تو کوئی چیز مشکل نہیں ہے۔''

''اور پسینہ!'' اینڈریس بولا۔

''اور پسینہ۔'' مینولی گردن تانتے ہوئے بولا۔

''پسینہ وہ برسات ہے اینڈریس جو انسان کی مشقت کے پھولوں کو شادابی بخشتا ہے۔ آدمی کی قسمت اس کے پسینے ہی سے لکھی ہوئی ہے میرے دوست۔''

اینڈریس فرمانبردار شاگرد کی طرح گردن ہلاتا رہا۔

محبت نفرت

اسرار احمد

محبت اور نفرت دو ایسے جذبے ہیں جو حد سے بڑھ جائیں تو انسان کو انسانیت سے دور کر دیتے ہیں‘ محبت اگر جنون کی شکل اختیار کرلے تو رشتے بھی اس سے حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر نفرت خون میں شامل ہو جائے تو شیطان بھی اس کی درندگی دیکھ کر شرمانے لگتا ہے۔

دو محبت کرنے والوں کا قضیہ‘ ان کی محبت کا محور ایک ہی عورت تھی

اٹارنی جان لیمبرٹ نے اس ملاقاتی کارڈ پر نظر ڈالی جو اس کا ایک جونیئر کلرک میز پر رکھ گیا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''یا میرے خدا! یہ تم دیکھ رہے ہو‘ ہیریسن!'' اس نے کارڈ اپنے منیجر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ڈومینی‘ سر ایورارڈ ڈومینی‘ انگلینڈ واپس آ گئے ہیں۔''

ایک طرف سے ہیڈ کلرک کی آواز آئی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ آپ کو ایک پریشان کرنے والے موکل کا سامنا کرنا ہوگا جناب۔''

''یقیناً کرنا ہوگا۔'' جان نے کہا۔ ''جاگیر سے مزید ایک پینی بھی ملنے سے رہی۔ یہ تو تم جانتے ہو‘ پچھلے دو سہ ماہی الاؤنس جو ہم نے افریقہ بھیجے تھے‘ وہ لکڑی فروخت کر کے مہیا کیے تھے‘ وہ وہیں ٹھیک تھے‘ یہاں کیوں آئے ہیں۔''

''میں ان صاحب سے کیا کہوں جناب؟'' کلرک نے آ کر مداخلت کی۔

''اوہ! انہیں بھیج دو۔'' جان نے درشتی سے کہا۔ ''آخر کبھی نہ کبھی تو ان سے سامنا ہونا ہی تھا۔''

اٹارنی جان ایک ایسے موکل کا استقبال کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا جو اس کے لیے پریشان کن ہونے کے باوجود بہرحال ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے افراد کئی نسلوں سے اس کی فرم کے لیے گراں قدر سرپرستوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس ڈومینی کے لیے اس کے ذہن میں ایک خستہ حال سے شخص کا تصور ابھرا جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ کا دکھائی دیتا ہو۔ اس کے برعکس کچھ دیر بعد وہ ایک نہایت خوش پوش اور وجیہہ و شکیل شخص سے ہاتھ ملا رہا تھا کہ اس جیسا اس کے دفتر میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلے تو وہ اسے پہچان نہ سکا اور ہکا بکا رہ گیا‘ پھر غور سے دیکھا تو وہی ستواں ناک تھی اور وہی گہری گہری نیلگوں آنکھیں تھیں۔ اس کا دل ایک انجانی خوشی سے لبریز ہو گیا۔

''سر ایورارڈ!'' وہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولا۔ ''یہ ایک نہایت غیر متوقع مسرت کا مقام ہے‘ قطعی غیر متوقع‘ گستاخی معاف‘ آپ نہایت شاندار لگ رہے ہیں۔''

ڈومینی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔

''افریقہ بڑا عجیب و غریب ملک ہے‘ جان۔'' اس نے شفقت کے ایسے لہجے میں کہا جس سے جان کے ذہن میں اس کے باپ دادا کی یاد تازہ ہو گئی۔

''مجھے کہنے کی اجازت دیجیے‘ آپ میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ہم شاید کوئی گیارہ سال بعد دوبارہ مل رہے ہیں۔''

''میں نے اپریل‘ انیس سو دو میں لندن چھوڑا

تھا۔'' ڈومینی منہ ہی منہ میں حساب لگاتا ہوا بولا۔ ''ہاں' گیارہ سال ہوگئے' کتنی عجیب بات ہے کہ میں پھر لندن میں موجود ہوں۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو تھوڑی بہت رقم درکار تو ہوگی؟'' جان نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔

''شکریہ' فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' ڈومینی نے بڑا حیران کن جواب دیا۔ ''ہم مالی معاملات پر پھر بات کریں گے۔''

یہ جان کے لیے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ وہ اپنے موکل کو اس کے اسکول کے دنوں سے جانتا تھا اور اس کے ملک سے جانے تک ایک بھی ایسی ملاقات نہ تھی جس میں نقدی کا تذکرہ یوں بے پروائی سے اور سرسری طور پر کیا گیا ہو۔ اس نے ڈومینی کو کریدنے کی خاطر کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ یہاں مستقل رہنے آئے ہیں۔''

''میں افریقہ سے ناتا توڑ آیا ہوں۔'' ڈومینی نے جواب دیا۔ ''رہا یہاں مستقل سکونت کا معاملہ تو یہ حالات پر منحصر ہے جو تم مجھے بتاؤ گے۔''

''آپ روجر ان تھینک والے معاملے سے تو بالکل مطمئن رہیں۔'' جان نے اس کا مدعا سمجھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے انگلینڈ سے جانے کے بعد اس کا کہیں تذکرہ سننے میں نہیں آیا۔''

''اس کی لاش بھی نہیں ملی؟''

''لاش کا نام و نشان تک نہ ملا۔''

دونوں دیر تک خاموش رہے۔ جان' ڈومینی کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور ڈومینی اس کا ذہن پڑھنے کے لیے کوشاں رہا۔

''اور لیڈی ڈومینی کے بارے میں؟'' بالآخر ڈومینی نے پوچھا۔

''جہاں تک میرے علم میں ہے' ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔'' جان نے محتاط لہجے میں کہا۔

''اگر حالات موافق رہے تو میں ڈومینی ہال میں ہی سکونت رکھنا پسند کروں گا۔'' ڈومینی نے کہا تو جان کے چہرے پر تردد کے آثار نمودار ہوئے۔

''آپ کو جاگیر کی حالت دیکھ کر مایوسی ہوگی۔ سر!'' اس نے تاسف سے کہا۔ ''میں نے آپ کو بارہا لکھا ہے کہ کرایوں سے اتنی آمدنی نہیں ہے کہ رہن شدہ جائیداد کا سود بھی اتر تا رہے' آپ کو الاؤنس کی رقم بھیجنے کے لیے جنگل کی لکڑی فروخت کی جاتی رہی ہے۔''

''تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے افریقہ میں کافی دولت کمائی ہے۔'' ڈومینی نے انکشاف کیا تو جان چونک پڑا۔

''دولت کمائی؟'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''آپ نے دولت کمائی سر ایورارڈ؟''

''مجھے یقین تھا کہ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی۔'' ڈومینی نے سرد مہری سے کہا۔ ''میری تم سے اس ملاقات کا مقصد یہ ہے کہ تم جاگیر اور جائیداد کو رہن سے چھڑانے کے لیے جلد از جلد انتظامات کرلو۔ مجھے تین چار خوش قسمت سال میسر آگئے' میں نے سونے کی کانوں' ہیرے کی کانوں اور زمین کے ذریعے اپنا مقدر بدلا ہے۔ اگر ایک آدھ سال اور وہاں رہ لیتا تو ارب پتی بن کر لوٹتا۔''

''میری دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔'' جان بمشکل کہہ سکا۔ ''میرے حیرت زدہ ہونے کی گستاخی کو درگزر کیجیے۔ دراصل آپ اس خاندان کے پہلے فرد ہیں جس نے اس طرح دولت پیدا کی ہے' میری بے تکلفی کو معاف کیجیے' آپ کے خاندان کے افراد نے دولت گنوائی ہی ہے۔''

''ڈومینی خوشدلی سے مسکرانے لگا۔

''اچھا آج تم میرے ساتھ لنچ کرو۔'' اس نے [illegible]ات ختم کرنے کے لیے کہا۔ ''اور میں تمہیں اپنے [illegible]صوبوں کے بارے میں بتاؤں گا۔''

جان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں [illegible]کے کو ٹیکسی لینے کے لیے بھیجتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔'' ڈومینی نے اس کی حیرت میں مزید اضافہ کیا۔ ''اور تم اپنے کلرک سے کہتے چلو کہ وہ رہن کردہ جاگیر اور جائیداد کی مکمل تفصیل تیار رکھے۔''

''بہت بہتر۔'' جان نے کہا۔ ''ویسے گروی کی رقم [illegible]ی ہزار پونڈ کے اندر اندر ہے۔''

راستے میں جان کہنے لگا۔ ''آپ کے ڈومینی ہال جانے سے پہلے میں وہاں کے بارے میں آپ کو کچھ بتانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق لیڈی ڈومینی سے ہے۔ جسمانی طور پر ان کی صحت قابل رشک ہے لیکن ذہنی طور پر ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ بدقسمتی سے ان کے دل میں اب بھی آپ کے لیے وہی بدگمانی ہے جو آپ کے انگلینڈ سے جانے کا موجب بنی۔ وقت نے آپ کے خلاف ان کے معاندانہ جذبات میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔''

''دوسرے الفاظ میں وہ اب بھی مجھے روجر کا قاتل سمجھتی ہے؟'' ڈومینی نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔

''مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بات ایسی ہی ہے۔''

''اور میرے خیال میں دوسرے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں۔'' ڈومینی نے کہا۔

''وہ راز اب تک نہیں کھل سکا ہے۔'' جان بتانے لگا۔ ''یہ بات سب کے علم میں تھی کہ آپ اور روجر [illegible]ل میں لڑ پڑے تھے اور آپ زخموں سے چور' نیم [illegible]ں گھر لوٹے تھے لیکن روجر کو اس لڑائی کے بعد کسی نے نہیں دیکھا۔''

''اگر میں نے اسے ہلاک کردیا تھا تو اس کی لاش کیوں نہیں ملی؟'' ڈومینی نے کہا۔

''اس بارے میں کئی باتیں مشہور ہیں۔'' جان کہنے لگا۔ ''لیکن سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ میلوں تک شاید ہی کوئی فرد ہو جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ روجر کا بھوت اب بھی بلیک وڈ میں منڈلاتا رہتا ہے۔ جہاں آپ دونوں کی لڑائی ہوئی تھی۔''

''ایک بات بتاؤ۔'' ڈومینی نے کہا۔ ''اگر لاش کبھی ملی تو کیا مجھے قتل کے الزام میں پکڑ لیا جائے گا؟''

جان نے جواب دیا۔ ''اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ نارفوک میں مشہور ہے کہ بلیک وڈ میں اگر کوئی انسان یا حیوان گم ہوجائے تو اس کا سراغ عمر بھر نہیں ملتا۔''

''لیجیے آپ کا گھر آگیا۔'' سڑک کا موڑ مڑ کر ڈومینی ہال نظر آتے ہی جان نے کہا۔ ''ہم نے اسے دیدہ زیب رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اردگرد کے جنگل سے کچھ زیادہ لکڑی بھی کاٹی نہیں گئی ہے۔''

''اور بلیک وڈ سے؟'' ڈومینی نے ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہاں سے ایک ٹکڑا بھی نہیں۔'' مینگان نے بتایا۔ ''اس کی معقول وجہ بھی ہے۔ کوئی لکڑہارا ادھر کا رخ کرنے کی جرات نہیں کرتا۔''

''وہی تو ہم کی بات ہے نا۔''

''دیہاتی تو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی درجن بھر آدمی کھلے عام کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے روجر کا بھوت دیکھا ہے۔ بیسیوں تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے راتوں کو اس کی لرزہ خیز

پکارا اپنے کانوں سے سنی ہے۔"

"اسے کس جگہ دیکھا گیا ہے؟" ڈومینی نے اشتیاق ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"کہا جاتا ہے کہ وہ بلیک وڈ سے نکلتا ہے اور آپ کے گھر کے چبوترے پر ٹھیک لیڈی ڈومینی کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے آبیٹھتا ہے۔ یہاں جتنے بھی ملازم رکھے گئے وہ ایک مہینے کے اندر اندر بھاگ کھڑے ہوئے' میں نے اسی لیے خط میں آپ کو لکھا تھا کہ روجر کی ماں کو ملازمت سے نہ نکالا جائے۔"

"کیا وہ ابھی بھی لیڈی ڈومینی کی مخصوص ملازمہ ہے؟"

"محض اس وجہ سے کہ دوسری کوئی عورت ملتی نہیں اور لیڈی ڈومینی یہاں سے منتقل ہونے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتیں۔"

کار بڑے سے پورچ میں داخل ہوئی تو وہاں استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ انہیں صدر دروازے کی گھنٹی بھی خود ہی بجانا پڑی۔ دروازہ ایک نئے ملازم نے کھولا۔ اس کے پیچھے نصف درجن ملازمائیں کھڑی تھیں۔ یہ سب کی سب نئی نئی ملازم ہوئی تھیں۔ مردوں میں صرف دو بوڑھے پرانے تھے۔ ایک مڈلٹن' دوسرا لوے بونڈ۔ ڈومینی ان دونوں سے گئے دنوں کی باتیں کرنے لگا۔ اچانک ایک عورت تیزی سے آکر ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ بانس کی طرح دبلی تھی اور اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا سارا سر سفید تھا' چہرہ دبلا اور لمبوترا تھا جس پر ابھرے ہوئے نقوش خاصے مضحکہ خیز لگتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے برس رہے تھے۔

"اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ایورارڈ ڈومینی۔" وہ تن کر بولی۔ "قاتل کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے' وہیں واپس جاکر چھپ رہو جہاں سے آئے ہو۔"

"یہ تم بہت زیادتی کررہی ہو۔" جان نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں وکیلوں کی چکنی چپڑی باتیں سننے نہیں آئی ہوں۔" عورت نے بے جھجک کہا۔ "میں اس سے دو 'دو باتیں کرنے آئی ہوں۔ کیا تم میرے سامنے نظر اٹھا کر بات کرسکتے ہو ڈومینی؟ تم جو میرے بیٹے کے قاتل ہو اور تم جس نے اپنی بیوی کو ایک پاگل عورت بناکر رکھ دیا ہے۔"

جان نے پھر مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن ڈومینی نے اسے ایک طرف ہٹادیا۔

"مسز ان تھینک!" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "فوراً چلی جاؤ اور اپنا کام کرو۔ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ میرا گھر ہے' میں جب چاہوں یہاں آجاسکتا ہوں۔"

روجر کی ماں اس کا لہجہ دیکھ کر لمحے بھر کے لیے ساکت رہ گئی۔

"گھر تمہارا سہی ایورارڈ ڈومینی......" اس نے بالآخر زبان کھولی۔ "لیکن اس کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جہاں تم قدم رکھنے کی جرات نہیں کروگے۔"

"تم اپنی اوقات بھول رہی ہو۔" ڈومینی نے کڑے تیوروں سے کہا۔ "جاکر اپنی مالکہ کو میرے آنے کی اطلاع دو اور کہو کہ میں اس کے کمرے میں آنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

روجر کی ماں نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھیں ڈومینی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"مسز ان تھینک' میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنے مالک کا احترام کرو۔" جان نے پھر مداخلت کی۔ روجر کی ماں بھڑک اٹھی۔

"احترام! میں اپنے بیٹے کے قاتل کا خاک احترام کروں گی۔ ٹھیک ہے' اگر یہ یہاں میری مرضی کے خلاف ٹھہرے گا تو میری مالکن اسے احترام کے معنی بتادے گی۔"

وہ اچانک مڑی اور کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اس کے رویے کے بارے میں ملازموں میں بھنبھناہٹ شروع ہوگئی اور جان' ڈومینی کا ہاتھ تھامے اسے ایک طرف لے گیا۔

"سر ایورارڈ!" اس نے بیتابی سے کہا۔ "اس ناخوشگوار واقعے کا مجھے بے حد قلق ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ عورت گم صم رہتی ہوگی لیکن معلوم نہ تھا کہ وہ اتنی بدتمیزی کا مظاہرہ کرے گی۔"

"مسٹر جان!" ڈومینی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "کیا وجہ ہے کہ مجھے روجر کا قاتل سمجھا جاتا ہے۔"

جان نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "بعض حقائق اس الزام کی تائید کرتے ہیں۔ جب آپ یہاں رہنے آئے تھے تو اس وقت مس فلبرگ اپنے چچا کی اچانک موت کے بعد دنیا میں تنہا رہ گئی تھیں اور روجر کی ماں ان کی واحد ساتھی تھی جوان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ علاقے کے سارے لوگوں کو علم تھا کہ روجر ان پر مرتا تھا اور اس سے مس فلبرگ کو بڑی ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ انہوں نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ اسی اثناء میں آپ آگئے' مس فلبرگ کی محبت میں گرفتار ہوگئے اور انہیں اپنالیا۔ اس بات سے لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔"

"روجر ایک خبطی شخص تھا۔" ڈومینی نے کہا۔ "شروع سے ہی اس میں پاگل پن کے آثار تھے۔"

"اس دیہاتی اسکول ٹیچر کے بارے میں لوگوں کا عمومی یہی خیال تھا لیکن حالات اس وقت بگڑے جب وہ چھٹیوں میں گھر آیا اور اسے آپ کی شادی کا علم ہوا۔" جان نے کہا۔

"بعد میں جو ہوا وہ اس کی اسی رقابت کا نتیجہ تھا۔" ڈومینی بولا۔

"ایک شام وہ مجھے بلیک وڈ کے سرے پر ملا اور ایک جنونی کی طرح اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ مجھے بھی اپنے بچاؤ میں لڑنا پڑا۔ جب میں گھر پہنچا تو میرا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ میں خون میں نہایا ہوا اور نیم بیہوش تھا۔ تقدیر کی ستم رانی دیکھو کہ گھر میں داخل ہوتے ہی میرا سامنا سب سے پہلے لیڈی ڈومینی سے ہوا۔ اسے زبردست ذہنی دھچکا پہنچا اور وہ بیہوش ہوگئی پھر......!"

"وہ اس صدمے سے اب تک چھٹکارا نہیں پاسکی ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔" جان نے اس کی بات پوری کی۔

"اس المیے کا سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ وہ مجھ سے بدظن ہوگئی حالانکہ میں اپنے دفاع میں لڑا تھا۔ اسی بات نے مجھے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا' اس خوف نے نہیں کہ میں روجر کو قتل کرنے کے الزام میں پکڑا جاؤں گا اور مجھ پر مقدمہ چلے گا۔ اس کے لیے تو میں تیار تھا لیکن اس دوسری بات نے میرا دل توڑ دیا تھا۔"

"درست ہے۔" جان نے تائید کی۔ "دراصل آپ ہر طرح محفوظ تھے کیونکہ روجر کی لاش کا آج تک پتا نہیں چلا۔"

"اگر وہ مل جاتی تو؟"

"تو آپ پر قتل کا مقدمہ ضرور چلتا۔"

"تو لاش کی گمشدگی نے روجر کے بھوت بن جانے کی افواہوں کو جنم دیا ہے۔"

"بلاشبہ! ایک بھی متنفس نہیں ہوگا جو دن ڈھلنے پر اس جنگل کا رخ کرے۔"

ڈومینی نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ "رات

کھانے کے بعد میں تمہیں افریقہ کے چند توہمات کے بارے میں بتاؤں گا۔"

رات کو وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو نئے بٹلر نے آ کر بتایا کہ اس نے کافی' مطالعہ گاہ میں رکھ دی ہے اور دوسری بات یہ کہ مڈلٹن ملنے آیا ہے۔ وہ بہت پریشان دکھائی دیتا ہے' ڈومینی نے اسے مطالعہ گاہ میں بلوایا اور جان کو لے کر ادھر کا رخ کیا۔ کچھ دیر میں مڈلٹن بھی آ گیا۔ واقعی وہ بے حد پریشان نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے مڈلٹن؟" ڈومینی نے پوچھا۔

"میں آپ سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں اور امید ہے آپ اپنے مفاد میں اسے قبول کر لیں گے۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ آپ آج رات اپنے کمرے میں نہ سوئیں۔" مڈلٹن نے کہا۔

"کیوں نہ سوؤں؟" ڈومینی نے پوچھا۔

مڈلٹن نے جان کی طرف دیکھا' جیسے اس کی موجودگی میں کچھ کہنا نہ چاہ رہا ہو۔

"تم کہہ ڈالو!" ڈومینی اس کا تذبذب دیکھ کر بولا۔ "مسٹر جان' باپ دادا کے وقتوں سے ہمارے خاندانی مشیر ہیں۔ انہیں ہمارے خاندان کی ساری باتیں معلوم ہیں۔"

"جناب آپ کو یاد ہوگا" مڈلٹن کہنے لگا۔ "کہ جب آپ روجر سے لڑائی کے بعد گھر لوٹے تھے تو سب سے پہلے آپ کی مڈبھیڑ مجھ سے ہوئی تھی۔ آپ کا ایک بازو جھول رہا تھا' چہرہ خون سے لت پت تھا' اور لباس تار تار تھا' لیڈی ڈومینی پر ہذیانی دورہ پڑ گیا تھا' وہ بیک وقت ہنس بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ خدا ہم سب کو امان میں رکھے' ان کی وہی حالت اب بھی ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا اور ڈومینی کے چہرے سے کرب ٹپکنے لگا۔ "اور جب وہ چھری لے کر آپ پر جھپٹیں تو میں نے پیچھے سے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔" مڈلٹن نے بات جاری رکھی۔ "اور جب رات کو دبے پاؤں وہ آپ کے کمرے میں داخل ہوئیں اور آپ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تو یہ میں ہی تھا جس نے ان پر قابو پایا تھا اور اگلے روز ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔ میرے کانوں میں ان کی دھمکیاں اب تک گونج رہی ہیں۔"

ڈومینی نے اس کی طرف اکتاہٹ سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

"وہ ایک جنونی عورت کی دھمکیاں تھیں۔ ان کا ذہنی توازن اس لیے بگڑا کہ وہ خوفزدہ تھیں لیکن ان کی ہمت بڑھانے والی عورت آپ سے نفرت کی وجہ سے پاگل بن گئی کہ اس کا بیٹا آپ کے ہاتھوں مارا گیا۔ شاید ہی کوئی ہفتہ جاتا ہو کہ روجر کا بھوت لیڈی ڈومینی کے دریچے کے نیچے آ کر آپ کے خون کے لیے واویلا نہ کرتا ہو اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ اپنے کمرے میں نہ سوئیں۔"

"بھوت کے واویلا کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" ڈومینی نے اس کے مشورے کو نظر انداز کر کے کہا۔

"اس کی آواز کسی زخمی کتے سے ملتی جلتی ہے جناب' جو کسی انسان کے حلق سے نکل رہی ہو۔ اسے سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھر کے سبھی افراد نے یہ آواز سنی ہے اور اسی لیے یہاں کوئی ملازم ٹکتا نہیں۔"

"تم نے کبھی اس بھوت کو دیکھنے کی کوشش کی ہے؟" ڈومینی نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" مڈلٹن جھرجھری لے کر بولا۔ "روحوں اور بھوتوں کو دیکھنے کی جرات کون کر سکتا ہے؟"

ڈومینی نے اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ

ہا گیا تو جان نے پوچھا۔ "آپ نے اس کمرے میں نے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں کسی کو ناامید کرنا نہیں چاہتا۔" ڈومینی نے لٹن سے کہا۔ "میں اسی کمرے میں سوؤں گا۔"

وہ سویا نہیں تھا' آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ معاً ھٹی حس نے اسے چونکا دیا اور اس نے آنکھیں ھول دیں۔ مومی شمع کی ٹمٹماتی روشنی میں ایک خنجر کی ھار عین اس کے گلے پر چمک رہی تھی وہ بزدل نہیں ھا لیکن اس وقت اس کے جسم کا سارا خون جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ اعضاء بے جان ہو گئے تھے اور ذہن ماؤف سا لگتا تھا۔ اس کا کالر گیلا گیلا سا محسوس ہوتا تھا۔ جس ہاتھ میں وہ خنجر تھا' وہ چھوٹا سا' نازک اور خوبصورت ہاتھ تھا اور پلنگ کے پردوں کے پیچھے سے نکلا ہوا تھا۔

اس نے سر تکیے سے تھوڑا سا سرکایا تو خنجر بھی ہاتھ ساتھ آیا۔ اس کا نشانہ ڈومینی کا حلقوم تھا۔ اس نے اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ کو آہستہ سے جنبش دی کہ خنجر کو اس کے ہاتھ سے جھپٹ لے۔ معاً ایک دھیمی سی زنانہ آواز اس کے کانوں میں آئی۔ "اگر تم نے ہلنے جلنے کی کوشش کی تو موت کی نیند سو جاؤ گے' خاموشی سے لیٹے رہو۔"

ڈومینی ساکت لیٹ گیا' پھر اس ہمت کر کے پوچھا۔ "تم میری جان کیوں لینا چاہتی ہو؟"

"خاموش! اگر آواز بلند کی تو تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔" میٹھی سی آواز آئی۔ "میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

پردوں میں سرسراہٹ ہوئی اور بھاری سانس ڈومینی کے کانوں سے ٹکرائی' پھر ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا جو ہذیانی سسکیوں میں ڈھل گیا۔ خنجر ڈومینی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ چند لمحوں تک اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا' پھر آہستہ آہستہ سرکتا ہوا پلنگ کی پٹی سے لگ گیا اور دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر تپائی پر سے اپنا ریوالور اور ٹارچ اٹھا لی۔ چند ثانیے مزید رک کر اس نے اچانک ٹارچ کی روشنی کمرے میں پھینکی تو اسے کچھ فاصلے پر ایک نسوانی پیکر نظر آیا جو چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور تیزی سے ٹارچ کی روشنی کمرے میں گھمانے لگا۔ کمرے سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جس پر چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حلق پر جلن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے حلق پر انگلیاں پھیر کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو ان پر خون لگا ہوا تھا۔

ضرور کوئی خفیہ راستہ بنایا گیا ہوگا۔ اس نے خود سے کہا اور پھر ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح ملازم پارکن اسے جگانے آیا تو وہ کھڑکی میں کھڑا سمندر کے گہرے سبز پانی کا نظارہ کر رہا تھا۔ پارکن نے اس کی قمیص کے کالر پر لگے ہوئے خون کو تشویش کی نظر سے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "شیو بناتے ہوئے خراشیں آ گئی ہیں۔"

"رات وہ بھوت تو نہیں آیا تھا؟" اس نے سرسری طور پر پوچھا۔

"نہیں' رات تو کچھ نہیں ہوا لیکن کچھ دنوں قبل میں نے جو بھیانک آواز سنی تھی اسے میں زندگی بھر نہ بھولوں گا۔" پارکن نے جواب دیا۔

"کسی انسان کی تھی یا حیوان کی؟"

"ملی جلی انسانی اور حیوانی آواز تھی جناب۔"

کچھ دیر بعد جب وہ اور جان ناشتہ کر رہے تھے تو روجر کی ماں آ پہنچی۔

"آپ کو میری مالکہ نے بلایا ہے۔" اس نے کرخت لہجے میں ڈومینی سے کہا۔

''یہ ان کی عنایت ہے۔ ان سے کہو کہ چند منٹوں میں حاضر ہوتا ہوں۔'' ڈومینی نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد اسے ایک شاندار مرصع کمرے میں لے جایا گیا۔ روجر کی ماں اسے کمرے میں چھوڑ کر فوراً چلی گئی اور وہ کوچ پر بیٹھی ہوئی عورت کے سامنے گم صم کھڑا رہا۔ وہ بے حد خوبصورت' نازک اندام اور پرتمکنت تھی۔ روزامنڈ بالکل ویسی ہی تھی جیسی وہ اسے چھوڑ گیا تھا البتہ کمزور لگتی تھی۔

''تو تم آخر آ ہی گئے؟'' وہ رک رک کر بولی۔ ''بہت بہادر ہو۔''

ڈومینی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور سے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ روزامنڈ پر اس کا کوئی رد عمل نہ ہوا۔ ڈومینی نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ اس کے پہلو میں بے جان سا گر گیا۔

''میں تمہارے پاس لوٹ آیا ہوں۔'' ڈومینی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''اپنی کھوئی ہوئی مسرت حاصل کرنے۔''

''مسرت؟'' روزامنڈ نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا۔ ''تم یہاں سوئے اور ابھی تک زندہ ہو' میں نے اپنا عہد توڑ دیا' نہ جانے کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونے کے قابل نہیں ہوں۔'' ڈومینی نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

''بڑی عجیب بات لگتی ہے یہ تو۔'' روزامنڈ بولی۔ ''کیا بائبل میں کسی جگہ لکھا نہیں ہے کہ جان کے بدلے جان! تم نے روجر کو قتل کیا ہے۔''

''میں نے تو اپنے دفاع کے لیے اور بھی لوگوں کو میدان جنگ میں قتل کیا ہے' کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب انسان کو قتل کرنا یا قتل ہو جانا پڑتا ہے۔ یہ روجر تھا جس نے......''

''میں اس کے بارے میں مزید کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔'' روزامنڈ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''پرسوں رات اس کی روح مجھے دریچے کے نیچے سے پکار رہی تھی۔ وہ چاہتی ہے کہ میں جا کر روجر کے ساتھ جہنم میں رہوں اور یہ تصور ہی میرے لیے ہولناک ہے۔''

''چلو چھوڑو' اس بات کو۔'' ڈومینی نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ تمہیں کیا تحفے دوں؟''

''تحفے؟'' لحظہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر طفلانہ بشاشت دوڑ گئی پھر وہ سنبھل گئی اور کہنے لگی۔

''میری بات سنو یہ بڑی اہم ہے نہ جانے کیوں کل رات کے بعد میں نے تمہاری جان لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اب تم میرے قریب آ کر بیٹھو میرے...... رفیق حیات۔ اتنے سالوں بعد شوہر کو دوبارہ پانا کیسی عجیب بات ہے۔''

ڈومینی کو یہ سب پرتصنع لگ رہا تھا' روزامنڈ کے الفاظ' اس کا لہجہ' کمرے کی معطر اور سکون بخش فضا۔

''تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو روزا!'' وہ اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

روزامنڈ نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''تمہیں معلوم ہے' جب سے تم گئے ہو' میں نے باغ میں قدم نہیں رکھا ہے۔''

''اب سب حالات بدل جائیں گے۔'' ڈومینی نے جلدی سے کہا۔ ''اب تم کار میں پھرو گی' ہم شہر میں مکان لے لیں گے' میں بہترین ڈاکٹروں سے تمہارا علاج کراؤں گا۔''

روزامنڈ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔ ''میں یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں' ہر ہفتے بلکہ ہفتے میں دو مرتبہ بھی اس کی روح مجھ سے ملنے آتی ہے' اگر میں یہاں سے چلی گئی تو وہ بے قابو ہو کر میرے

پیچھے چلی آئے گی۔ مجھے یہیں رہنا ہے' میں ہاتھ ہلا کر اس کی تسکین کر دیتی ہوں' پھر وہ چلی جاتی ہے۔''

ڈومینی خاموشی سے اٹھ کر دریچے کے پاس گیا اور نیچے باغ میں جھانکنے لگا' پھر وہ مڑا اور بولا۔ ''میں تمہیں خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں' لیکن تم کچھ زیادہ تندرست و توانا نہیں ہو' ہم جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے' تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔''

''جا کر مسز ان تھینک کو میرے پاس بھیج دو۔'' روزامنڈ نے تھکی تھکی آواز سے کہا اور ڈومینی بھاری بھاری قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔

❁ ...... ● ...... ❁

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈومینی کی آنکھ ایک دلخراش آواز سے کھل گئی۔ یہ انسان اور حیوان کی ملی جلی آواز تھی جیسے بیک وقت کوئی شخص گریہ و زاری کر رہا ہو اور کوئی کتا رو رہا ہو۔ یوں لگتا تھا کہ ایک ہی حلق سے دہری نوعیت کی آواز نکل رہی ہو' جیسے کوئی زخمی جانور تکلیف سے چلا رہا ہو۔ اس آواز میں اذیت سی بھی تھی اور فریاد بھی' کرب بھی تھا اور احتجاج بھی' ڈومینی تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اس کے قدم بیساختہ روزامنڈ کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ اسے یقین تھا کہ یہ آواز اس کے دریچے کے نیچے سے آ رہی تھی۔ مایوسی اس کی منتظر تھی' روزامنڈ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے زینے اتر کر صدر دروازے کی طرف لپکا۔

دروازہ کھول کر اس نے جھانکا تو باغ تاریکی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک بھیانک سناٹا ہر سو تھا' وہ آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا اس چبوترے کی طرف بڑھا جو روزامنڈ کے کمرے کے عین نیچے تھا اور جہاں دریچہ کھلتا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو چبوترے پر ایک بڑی سی کالی گٹھڑی پڑی نظر آئی۔ معاً ڈومینی نے ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ گٹھڑی کو جنبش ہوئی' دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑھکتی ہوئی باغ کی طرف بڑھی اور تاریکی میں غائب ہو گئی۔ ڈومینی کئی منٹ تک وہیں کھڑا رہا' پھر پلٹا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ رات کا باقی حصہ اس نے جاگ کر گزارا اور پو پھٹتے ہی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سیدھا چبوترے پر گیا تو اسے اوس سے بھیگی ہوئی مٹی پر نشانات' باغ کی سمت جاتے نظر آئے' اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو یہ نشانات انسانی قدموں کے لگتے تھے نہ جانور کے۔ پنجہ ضرور تھا اور انگلیاں بھی تھیں لیکن کچھ عجیب قسم کا پاؤں تھا۔ اس نے افریقہ کے جنگلوں اور دلدلوں میں عجیب و غریب جانوروں کے قدموں کے نشانات دیکھے تھے لیکن مٹی پر ان نشانات کو دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ ایسا عجیب الخلقت جاندار اس نے ساری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ ان نشانات کو دیکھتا ہوا بڑھا۔ باغ ختم ہوا اور بلیک وڈ شروع ہوا تو وہ نشانات اس میں داخل ہو گئے۔ لیکن کچھ دور جا کر اسے رک جانا پڑا۔ آگے سیاہ مٹی کی دلدلی زمین تھی۔ دراصل یہ دلدل نہیں تھی بلکہ کیچڑ جم گئی تھی لیکن اس کی سیاہ تہ اتنی دبیز تھی کہ ڈومینی اس پر قدم نہ رکھ سکا۔ وہ ناچار وہاں سے لوٹا اور گھر میں جا کر مڈلٹن کو بلوا بھیجا۔

''مڈلٹن!'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''رات تم نے اس بھوت کا واویلا سنا تھا؟''

''جی ہاں سنا تھا۔'' مڈلٹن نے جواب دیا۔ ''وہ روجر کی روح کی آواز تھی۔ اسی طرح وہ مالکن کے دریچے کے نیچے آ بیٹھتی ہے اور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

ڈومینی سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا' یہی کہ روجر کی روح ڈومینی کے ہاتھوں روجر کے قتل پر فریاد کر رہی تھی۔

"میں بلیک وڈ میں جانا چاہتا ہوں۔" ڈومینی نے کہا تو مڈلٹن نے اس طرح چونک کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

"خدا نہ کرے، آپ جائیں گے تو لوٹ کر نہیں آئیں گے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"خیر دیکھا جائے گا' میں نے اس سے زیادہ خطرناک اور ہولناک جنگل افریقہ میں دیکھے ہیں۔" ڈومینی نے بے پروائی سے کہا۔

"اس جیسا جنگل دنیا میں کہیں نہ ہوگا جناب۔" مڈلٹن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "اس کی زمین کھوکھلی ہے جس پر سیاہ گیلی مٹی کی تہ پر تہ جمی ہوئی ہے اور پورے جنگل میں زہریلی ہوا پھیلی ہوئی ہے۔ پرندے تک وہاں جانے سے گھبراتے ہیں اور جاتے بھی ہیں تو تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ انسان اس میں داخل ہو تو سیدھا قبر کا رخ کرتا ہے۔"

"بہر حال میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔" ڈومینی نے جیسے فیصلہ سنا دیا اور مڈلٹن لاجواب ہوگیا۔

اسی دوپہر ایک حیران کن خبر سارے علاقے میں پھیل گئی' کھیت مزدور سے زمیندار تک' اسکول کے بچوں سے ان کے گھروں تک' مقامی ڈاک خانے سے قرب وجوار کے لوگوں تک' وہ خبر یہ تھی کہ باہر سے مزدوروں کی ایک کھیپ کدالیں' پھاوڑے اور تگاریاں لیے آ پہنچی ہے۔ ان کے ساتھ پانی کھینچنے والا انجن اور دیگر مشینیں بھی ہیں۔ لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے اور انکشاف ہوا کہ ڈومینی نے بلیک وڈ کو صاف کرنے کے لیے دور دراز کے علاقے سے آدمی منگوا لیے ہیں۔ سب لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے' بعض لوگوں نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج بھی کیا کہ روجر کی روح کو پریشان کرنے سے علاقے کے مکینوں پر مصیبت نازل ہوگی۔ وہ اسے ڈومینی کی ان سے دشمنی بتا رہے تھے۔ کچھ لوگ اسے ہٹ دھرم یا عاقبت نااندیش قرار دے رہے تھے۔

مزدوروں نے ایسے موقعوں کے لیے مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے چہروں پر ماسک تھے اور ہاتھوں پر انہوں نے کہنیوں تک چمڑے کے دستانے چڑھا رکھے تھے۔ ڈومینی جنگل کے سرے پر کھڑا مزدوروں کی کارکردگی دیکھ رہا تھا کہ ایک تند و تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو سیاہ پوش روجر کی ماں شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سر ایورارڈ!" وہ تقریباً چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "آپ جنگل کو کس لیے کٹوا رہے ہیں؟"

"میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں۔" ڈومینی نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "جنگل میں ایک بھی درخت باقی نہیں رہے گا' سارے کے سارے درخت کاٹ کر جلا دیئے جائیں گے اور اس بھیانک جنگل کی جگہ لہلہاتے کھیت نظر آئیں گے سمجھ گئیں؟"

"کیا آپ ایسا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں؟" روجر کی ماں دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"کیا تم مجھے یہ بتانے کی ہمت رکھتی ہو کہ میں ایسا کیوں نہ کروں مسز ان تھینک؟"

روجر کی ماں لب بستہ چلی گئی' لیکن رات کو پھر ڈومینی کے کمرے میں آ دھمکی۔

"ہاں' اب کیا کہنا چاہتی ہو مسز ان تھینک؟" ڈومینی نے سرد مہری سے پوچھا۔

"اگر آپ اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو آپ پر بلائیں نازل ہوں گی سر ایورارڈ!" روجر کی ماں نے چاپلوسی سے کہا۔

"اس جنگل کی طرف سے مجھ پر پہلے ہی کافی

بلائیں نازل ہو چکی ہیں۔" ڈومینی نے بے پروائی سے کہا۔

"کیا تم اس کی روح کو بے چین کرنا چاہتے ہو' اسے تم نے مار کر جنگل میں پھینک دیا تھا؟" روجر کی ماں تیوریاں چڑھا کر بولی۔

ڈومینی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خباثت مچل رہی تھی اور آنکھوں کی پتلیوں میں شیطان ناچ رہا تھا' ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور پیلے پیلے دانت چمک رہے تھے۔

"کاش تم افریقہ کے جنگلوں میں ہی مر کر سڑ چکے ہوتے۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔ "اب تم میرے بیٹے کی روح کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے کے لیے تیار رہو۔"

"میں اس کا خوشدلی سے خیر مقدم کروں گا مسز ان تھینک۔" ڈومینی نے نیم مسکراہٹ سے کہا۔

❁ …… ● …… ❁

ڈومینی اپنی کمر کے گرد موٹا رسا لپیٹے' جیب میں بھرا ہوا ریوالور ڈالے اور لوہے کے مٹھ والا ڈنڈا لیے باغ کے اس گوشے میں چھپا بیٹھا تھا جو بلیک وڈ سے قریب تر تھا اور جہاں سے ایک پگڈنڈی گزرتی ہوئی اس کے گھر تک جاتی تھی۔ مہینے کی پہلی تاریخیں تھیں لیکن تارے چمک رہے تھے۔ اس کی نظر بلیک وڈ کی سمت جمی ہوئی تھی اور کان ہر آہٹ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ رات کے تیسرے پہر کا آغاز ہو چکا تھا اور اسے وہاں بیٹھے ایک پہر گزر چکا تھا۔

دفعتاً اسے جنگل کی سمت سے کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی اور وہ چوکنا ہوگیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کی پوری طاقت سیاہ پٹی سی' ناہموار پگڈنڈی پر مرکوز کردی۔ لمحہ بہ لمحہ کھڑ کھڑاہٹ گھسٹنے کی آواز بن کر قریب تر آ رہی تھی پھر اسے چند لمحوں بعد پگڈنڈی پر ایک ہیولا سا رینگتا ہوا نظر آیا۔ ہر دو قدم پر ٹھہر جاتا اور پھر رینگنے لگتا۔ دیکھنے میں وہ کوئی چوپایا لگتا تھا' کچھ آگے آ کر وہ دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چند قدم چلا اور پھر گر کر چوپائے کی طرح چلنے لگا' اسی طرح کھڑے ہو کر اور رینگتے ہوئے وہ بڑھتا ہوا ڈومینی کے سامنے سے گزرا۔ اس کا رخ ڈومینی کے گھر کی طرف تھا۔

کچھ دیر بعد وہ روزامنڈ کے دریچے کے نیچے چبوترے پر جا بیٹھا اور پھر صبح کاذب کا سکوت ایک انسان اور حیوان کی ملی جلی آواز سے پارہ پارہ ہوگیا۔ فضا لرزہ براندام ہوگئی۔ ڈومینی بھی یکبارگی کپکپا اٹھا۔ اس مکروہ اور دہشت انگیز آواز کی صدائے بازگشت دیر تک جنگل میں گونجتی رہی' جب وہ تھم گئی تو ڈومینی اپنی جگہ سے ہلا اور کمر سے بندھا رسا کھول کر کمان کی طرح جھکا دبے پاؤں بڑھا۔ وہ اس مخلوق کے قریب پہنچا تو اس نے پھر منہ سے بھیانک آواز نکالی اور اس کے ساتھ ہی اس نے رسے کا پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا' اس مخلوق کی آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔

❁ …… ● …… ❁

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ڈومینی ملازموں کی فوج کو چبوترے پر لے آیا۔

"جانسن!" اس نے قوی ہیکل دربان کو حکم دیا۔ "تم اسے میری کار میں ڈال کر ناروچ کے اسپتال لے جاؤ اور کہو کہ اگر میں دن میں کسی وقت نہ آسکا تو پوری تفصیل سے رقعہ لکھ بھیجوں گا۔ باقی لوگ گھر میں جائیں۔"

سارے ملازمین پھٹی پھٹی آنکھوں سے چبوترے کی طرف دیکھ رہے تھے جس پر سیاہ گٹھڑی بنا ہوا روجر ان تھینک پڑا تھا۔

"اب کھیل ختم ہوگیا ہے۔" ڈومینی ملازموں سے کہہ رہا تھا۔ "اور تم لوگوں کو یقین آ گیا ہوگا کہ روجر

کا بھوت ایک ڈھکوسلا تھا۔ یہ پہلے ہی خبطی تھا' میرے ہاتھوں پٹ کر اس خیال سے جنگل میں چھپ گیا تھا کہ لوگ مجھے اس کا قاتل سمجھیں گے اور مجھے پھانسی ہوجائے گی لیکن میرے لاپتا ہوجانے سے اس کی حسرت دل کی دل میں ہی رہی اور ناکامی نے اسے نیم پاگل بنادیا پھر اس نے بھوت بننے کا ڈراما رچایا تو رہی سہی عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی ماں اس سازش میں شریک تھی۔ وہ اسے کھلاتی پلاتی رہی۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے کہ یہ زندہ تو ہے لیکن نیم انسان' نیم حیوان ہے۔"

اچانک ایک طرف سے روجر کی ماں تیزی کے ساتھ آئی اور اپنے بیٹے پر گر پڑی۔

"آخر تم نے اسے پکڑ ہی لیا۔" اس نے بجھی بجھی آنکھوں سے ڈومینی کو دیکھتے ہوئے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"مسز ان تھینک!" ڈومینی نے تاسف سے کہا۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں' اپنے بیٹے کے ساتھ اسپتال جاؤ۔ کار آتی ہی ہوگی' مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے سوائے اس کے کہ اپنے جگر گوشے کو اس حال تک پہنچانے پر تم اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ ہو۔ مجھ سے انتقام لینے کی خواہش نے اس کا کیا حشر کر ڈالا۔"

"اگر میں اسے نہ کھلاتی پلاتی تو یہ مر جاتا۔" روجر کی ماں نے سسکیاں لے کر کہا۔ "میں رو رو کر دعائیں مانگتی رہی کہ یہ اپنی اصل حالت پر آ جائے۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔" ڈومینی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اسی لیے تم نے اس نیم پاگل کو دریچے کے نیچے آ بیٹھنے اور بھیانک آواز سے واویلا کرنے کی تربیت دی' تاکہ ایک معصوم عورت جو تمہاری بہو نہ بن سکی' اس آواز کو تمہارے بیٹے کی روح کی پکار سمجھ کر احساس جرم کا شکار ہوجائے' اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے' مجھے ایک بے گناہ کا قاتل سمجھ کر مجھ سے بدظن ہوجائے اور میری جان لینے کا عہد کرے۔ تمہارا بیٹا ایک خبیث انسان تھا لیکن تم اس سے زیادہ خبیث ہو کہ تمہاری خباثت نے اسے زندہ درگور کر ڈالا۔"

کار آ گئی اور جانسن نے دوسرے ملازموں کی مدد سے روجر کو اٹھا کر اس میں ڈال دیا۔ اس کی ماں بھی لڑکھڑاتی ہوئی اس کے ساتھ جا بیٹھی اور گردن گھما کر ڈبڈبائی ہوئی نظر سے ڈومینی کی طرف دیکھنے لگی۔

"اگر روزامنڈ ٹھیک ہوگئی تو میں تہ دل سے تم دونوں کو معاف کر دوں گا۔" ڈومینی نے کہا۔ "اور اگر نہ ہوئی تو عمر بھر بددعائیں دیتا رہوں گا کہ تم ماں بیٹے کا ٹھکانا جہنم ہو۔"

وہ بوجھل قدموں سے گھر کے اندر گیا تو گلاب کی طرح تروتازہ نکھری نکھری روزامنڈ دوڑ کر آئی اور اس نے اپنے بازو ڈومینی کے گلے میں حمائل کر دیئے۔

"میرے سرتاج!" اس نے مہکی ہوئی سانسوں سے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ میں نے ایک مہیب اور کربناک خواب دیکھا ہے......" اور اس کے ہونٹوں کی گلابی گلابی پنکھڑیاں ڈومینی کے سبزہ رخسار سے مس ہوگئیں۔

تابوت

حسن اختر پریم

ایک کینہ پرور شخص کی روداد' جب وہ زندہ تھا تب وہ لوگوں کے لیے آزار تھا لیکن مرنے کے بعد بھی وہ گورکن کے لیے مصیبت ثابت ہوا۔

پراسرار کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے بطور خاص ایک دلچسپ کہانی

ملر ہمارے گاؤں کا واحد گورکن تھا۔ یہ گاؤں دراصل پہاڑوں کے دامن میں ایک خوب صورت وادی میں واقع تھا۔ آبادی بہت کم تھی۔ اتنی کم کہ ملر تن تنہا کفن دفن کا انتظام کر لیتا تھا۔ سردیوں میں یہاں شدید برف باری ہوتی تھی۔ لہٰذا ایسے موسم میں قبریں کھودنا ناممکن ہوجاتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سردیوں میں مرنے والے اپنا آخری سفر کیسے طے کرتے۔ تو ملر نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا۔ گاؤں سے کافی فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں تہ خانہ تھا۔ جسے سردیوں میں مرنے والوں کے لیے عارضی قبرستان کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ تابوت تیار کرتا تھا اور سردیوں میں مرنے والوں کی لاشیں ان ہی تابوتوں میں بند کر کے رکھ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ موسم بہار کا آغاز ہو جاتا۔ یہی وہ موسم ہوتا تھا جب ملر قبریں تیار کر کے لکڑی کے تابوتوں میں بند لاشیں دفن کر دیتا تھا۔

ایک دفعہ موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ ایک دن میں وہ ایک ہی تابوت دفن کرتا تھا۔ کیونکہ دوپہر کے بعد اکثر موسم خراب ہوجاتا تھا۔ اس دفعہ دس تابوت میں لاشیں تھیں۔ ابھی ایک ہی تابوت دفن کیا تھا کہ موسم خراب ہوگیا اور اس بنا پر کام دو تین دن تک رکا رہا۔

موسم نے جیسے ہی اجازت دی وہ دوبارہ اپنی گھوڑا گاڑی لے کر تہہ خانے جا پہنچا۔ آج اسے جم کی لاش دفنانا تھی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ یہ جم والا تابوت دراصل اس نے مسٹر براؤن کے لیے تیار کیا تھا لیکن بعد میں ملر کو یہ احساس ہوا کہ یہ مسٹر براؤن کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ مسٹر براؤن بے انتہا شفیق اور مہربان انسان تھے۔ ملر ان کے لیے بہترین تابوت تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے ایک خوب صورت تابوت تیار کیا تھا اور ان ہی دنوں میں جم چل بسا گیا۔ جو ظالم اور بداخلاق تھا۔ لہٰذا پہلے والا تابوت بھی بے کار نہیں گیا۔ ملر نے جم کو اسی تابوت میں بند کر دیا۔ جو دراصل مسٹر براؤن کے لیے بنایا تھا۔ حالانکہ جم لمبے قد کا تھا اور تابوت مسٹر براؤن کے قد کے مطابق تھا۔ مسٹر براؤن جو پستہ قد تھے مگر ملر تو جم سے نفرت کرتا تھا۔ اس لیے اس نے جم کے لیے نیا تابوت بنانے کی زحمت گوارا نہ کی۔

اس نے تہ خانے میں پہنچ کر جم کا تابوت ایک طرف رکھ دیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں موسم خراب ہوگیا اور پھر موسم نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ بادل آندھی اور موسلا دھار بارش کی وجہ سے پریشان ہوگیا۔ اچانک تہ خانے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ دروازہ بند ہوجانے سے تہ خانے میں روشنی برائے نام رہ گئی تھی۔ ملر جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچا تو دیکھا دروازہ بڑی سختی سے بند ہے۔ دور دور تک کسی ذی روح کی موجودگی کا امکان بھی نہیں تھا کیونکہ تہ خانہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے کوئی شاذ و نادر ہی گزرتا تھا۔ تھوڑی دور چوکیدار کا جھونپڑا تھا۔

لیکن ایسے موسم میں وہ اس طرف آئے۔ اس کا بھی امکان نہیں تھا لہٰذا چیخنا چلانا اور مدد کے لیے پکارنا بے کار تھا۔ ملر نے اپنی مدد آپ کرنے کی ٹھانی۔ اب وہ نو لاشوں کے درمیان زندہ تہ خانہ میں مقید تھا اور یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا۔

اس نے باہر نکلنے کے لیے جدوجہد شروع کردی سب سے پہلے دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی پھر تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ تو روشن دان ہی ایک واحد ذریعہ نظر آیا لیکن وہ بھی کافی اونچائی پر تھا۔ اس نے دو تابوت روشن دان کے نیچے دیوار کے قریب رکھے اور باقی چھ بھی اسی طرح دو دو کے حساب سے ان کے اوپر رکھتا گیا اور اب باقی رہ گیا ایک...... یہ اس کے خیال میں مسٹر براؤن کا تابوت تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ صرف چھو کر جان سکتا تھا۔ یہ آخری تابوت اس نے سب سے اوپر رکھا اور تمام اوزار لے کر اوپر والے تابوت پر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کا ہاتھ با آسانی روشن دان تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اوزاروں کی مدد سے روشن دان کو توڑنا شروع کر دیا اس کام میں اسے کافی دیر لگی۔ جیسے ہی اس نے باہر کودنے کا ارادہ کیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پنڈلیوں میں خنجر گھونپ دیے ہوں۔ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر آ گرا۔ اب اس میں کھڑا ہونے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ رینگتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھا لیکن سیڑھیوں تک آتے آتے بے ہوش ہو گیا۔

جس وقت ملر کی دل دوز چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس وقت اتفاقاً چوکیدار کا گزر ادھر سے ہوا۔ اس نے تہہ خانے سے بلند ہونے والی آواز سنی۔ تو اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ملر کی آواز ہے باہر اس کی گھوڑا گاڑی بھی موجود تھی۔ چوکیدار نے تہ خانے کا دروازہ کھولا جو بڑی مشکل سے کھلا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے چھو کر دیکھا تو یہ کسی انسان کا جسم تھا۔ جسے وہ کندھے پر اٹھا کر باہر لے آیا۔ اپنے جھونپڑے میں ایک بستر خالی کر کے ملر کو اس پر لٹا دیا اور پھر اپنے بیٹے رچرڈ کو گاؤں بھیجا تاکہ جلدی سے ڈاکٹر کو لائے جو بے ہوش ملر کو طبی امداد پہنچا سکے۔

ڈاکٹر آیا اس نے ملر کے پاؤں سے جوتے، موزے اتارے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ملر کے پاؤں تقریباً ٹخنوں تک زخمی تھے۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دی۔ اسی دوران ملر کو ہوش آ گیا لیکن وہ چیخ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ دو خدا کے لیے چھوڑ دو۔

ملر نے جب ڈاکٹر کو دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی کہ وہ نو لاشوں کے درمیان سے زندہ لوٹ آیا ہے۔ پھر اس نے ڈاکٹر کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کی آواز اب بھی خوف اور دہشت سے کانپ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نے لالٹین اٹھائی اور خاموشی سے تہہ خانے کی راہ لی کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن لالٹین کی زرد مدھم روشنی میں جو کچھ اس نے دیکھا وہ بہادر سے بہادر انسان کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ سب سے اوپر والا تابوت لڑھک کر نیچے گرا ہوا تھا اور لاش تابوت سے باہر فرش پر پڑی تھی اور یہ لاش جم کی تھی۔ وہ جم کو اچھی طرح سے پہچانتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ جم کا علاج کرتا رہا تھا اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جم کے پیر ٹخنوں سے غائب تھے۔ ایک نگاہ اس نے تابوت کو دیکھا۔ جو دیکھنے میں جم کے قد کے لحاظ سے کافی چھوٹا تھا۔ ڈاکٹر کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ملر نے پاؤں کاٹ کر جم کو اس چھوٹے سے تابوت میں بند کر دیا تھا۔

مزید دیکھنے کی ڈاکٹر میں ہمت نہیں رہی۔ وہ فوراً ملر کے پاس پہنچا اور اس سے کہا۔

''ملر اوپر والا تابوت جم کا تھا۔ تم نے یہ کیا کیا؟ تم تو جم کی عادت سے اچھی طرح واقف تھے کہ وہ بدلہ لینے سے بھی نہیں چوکتا'' کیا تم اس کا یہ جملہ بھول گئے تھے آنکھ کے بدلے آنکھ دانت کے بدلے دانت اور ٹانگ کے بدلے ٹانگ۔''

مجھے یہ کہانی ڈاکٹر نے سنائی تھی۔ ملر نے اس کے بعد یہ پیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اب جبکہ ملر اس دنیا میں نہیں رہا تو میں نے اس کے اپاہج ہونے کی داستان قلم بند کر دی ہے۔ ورنہ اس کی زندگی میں تو یہ سب کچھ راز تھا اور شاید راز ہی رہتا۔

❖

دربان

شکیل صدیقی

وہ پانچ سال سے اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے ترس رہا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا اس کے راستے پر چلتے ہوئے جرائم پیشہ بن چکا تھا۔

ایک باپ کی روداد، وقت اس سے انتقام لینے پر تل گیا تھا

ٹیگو رو رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا اور التجائیں کر رہا تھا مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہے۔ میں نے پھر ایک ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ دیوار سے جا لگا۔ اب اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون کی لہریں نمودار ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید اس کی زبان دانتوں تلے آ کر کٹ گئی تھی، یا پھر ممکن ہے ایک آدھ دانت ہی حلق سے اتر گیا ہو۔

''وہ اس وقت کہاں ہے ٹیگو؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

ٹیگو نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شدید خوف جھلک رہا تھا۔ اسے یہ خوبی علم تھا کہ اس نے زبان نہیں کھولی تو میں اس کا قیمہ بنا دوں گا۔

''ٹیگو! مجھے بتا دو وہ کہاں ہے، ورنہ میں تمہاری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔'' میں کسی سانپ کی مانند پھنکارا۔

ٹیگو نے پھر نفی میں سر ہلا دیا تو میں نے جھنجلا کر تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے منہ پر جڑ دیے۔ مجھ پر سچ مچ جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اگر وہ زبان نہ کھولتا تو شاید میں اسے ختم ہی کر ڈالتا۔

''ٹیگو! میں نے تمہیں اس کا سرپرست بنایا تھا کہ تم اسے نظر میں رکھ سکو۔ اب اگر تم سے یہ کام بہ طریق احسن نہیں ہو سکا تو اب یہی بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے ابھی تک تمہارے ساتھ رعایت ہی برتی ہے، اب میں واقعی سختی کروں گا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ڈینی! مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے تمہیں شرم آنا چاہیے۔ میں تمہارا بہنوئی ہوں۔ میں یہ کیسے......''

''میں پوچھتا ہوں، وہ کہاں ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جنونیوں کے انداز میں پھر وہی سوال کیا۔

''تم مجھے اس کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے ڈینی۔ تمہاری بہن نے مجھے چھوڑ دیا اور وہ شاید اسی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ میں تو اس کا اچھی طرح خیال رکھتا تھا۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوئی کوتاہی......''

''وہ کہاں ہے ٹیگو؟ اس کا پتا بتاؤ ورنہ میں تمہیں مار مار کر یہیں دفن کر دوں گا۔'' میں غرایا۔ میرے حلق سے نکلنے والی آواز کسی زخمی درندے سے مشابہ تھی۔

''مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ڈینی۔'' اس نے بے بسی کا مظاہرہ کیا۔

میں نے جھنجلا کر اس کی ناک پر مکا مارا۔ مخصوص انداز سے چلائے ہوئے اس مکے نے اس کی ناک کا بانسا توڑ دیا۔ وہ کتوں کی طرح چیخنے لگا۔ چند ثانیوں بعد ہی میں نے اس کی ناک سے خون کی بوندیں ٹپکتی دیکھیں۔ اس کی حالت دگرگوں تھی اور وہ سردی کھائے ہوئے پلے کی طرح چیخ رہا تھا۔

''ڈینی! تم......'' وہ کانپتی آواز میں بولا۔

''وہ کہاں ملے گا ٹیگو؟'' مجھے اس کی کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔

ٹیگو کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی تو میں نے اس کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ مجھے اس کی آہ و بکا پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو اپنے لڑکے سے دلچسپی تھی۔ اگر ٹیگو درست کہہ رہا تھا تو یہ سب میری خبیث بہن کا کیا دھرا تھا۔ وہ ٹیگو سے علیحدگی نہ اختیار کرتی تو میرا لڑکا ابھی تک ٹیگو کے پاس ہوتا۔

مار کھا کھا کر اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ جھوم رہا تھا' لڑکھڑا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ممکن تھا کہ چند لمحوں بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا تو اس نے شرابیوں کی طرح بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ڈینی! اب مجھے مت مارو...... ٹھہرو...... میں......''

''بکو...... تیزی سے بکو' میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''وہ سرائے میں ہیمار کھا کھا کر اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ جھوم رہا تھا' لڑکھڑا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ممکن تھا کہ چند لمحوں بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا تو اس نے شرابیوں کی طرح بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈینی! اب مجھے مت مارو...... ٹھہرو...... میں......''۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔

''کیسی سرائے؟ کون سی سرائے؟'' میں نے بھنویں سکیڑیں۔

''کونی...... کونی۔'' وہ اب منہ کھول کر حیوانوں کی طرح سانس لے رہا تھا۔

''کونی؟ کونی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تم ہوش میں ہو یا نہیں؟ غلیظ جانور۔''

''میری مراد کونی بلین سے ہے ڈینی! میں قطعی ہوش میں ہوں۔ قسم کھانے کو تیار ہوں کہ......''

''تم جھوٹ بول رہے ہو سور کی اولاد۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آیا۔''

میں نے پھر مکا بنایا اور اپنا ہاتھ اس انداز میں پیچھے لے گیا جیسے ابھی مزید ہاتھا پائی کے موڈ میں ہوں۔ وہ گریہ وزاری کرتا ہوا بولا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ڈینی۔ میری بات کا یقین کرو۔ وہ آج کل کونی بلین کے ساتھ ہے۔ مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔''

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد سوال کیا۔ ''وہ اس کے ساتھ کتنے عرصے سے ہے؟''

''تقریباً ایک سال سے۔ اس سے پہلے میں نے اپنے بچوں کی طرح اس کی خبر گیری کی۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں ڈینی۔ مگر کونی بلین نے......''

''کونی بلین؟'' میں نے تلخ لہجے میں دہرایا۔ ''میرا لڑکا کونی بلین کے ساتھ ہے؟''

''میں درست کہہ رہا ہوں ڈینی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔ وہ مشکل سے اکیس سال کا ہوگا اور وہ......''

''نک اس کہانی میں کہاں فٹ ہوتا ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نک؟'' اس نے ہونقوں کی طرح دہرایا۔

''حیرت ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہاری اس اداکاری سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ نک کا اس کہانی میں کیا کردار ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ ان کی ملی بھگت ہے۔ نک اور کونی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔'' اس نے خیال آرائی کی۔

''مجھے قہقہے لگانے پر مجبور نہ کرو۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ کونی کہاں ملے گی؟''

''کیوں؟'' دفعتاً اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں دکھائی دی۔ ''کیا تم اس کے پاس جاؤ گے ڈینی؟ نہیں' یسوع مسیح کی قسم نہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اس سلسلے میں زبان کھولی ہے تو وہ مجھے......''

''کونی کہاں ملے گی؟'' میں نے اپنا سوال ...ایا۔

''ڈینی! میں کہتا......''

''اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو صاف صاف بتا دو ...ہ وہ کہاں پائی جاتی ہے؟'' میں نے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ ''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہارے ...اتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔''

اس نے چند ثانیوں تک کچھ سوچا' پھر کونی ب لین ...ا پتا بتا دیا۔ میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف ...یا اور کمرے سے نکل آیا۔ اب میں کونی کے ٹھکانے ...بار رہا تھا۔

......☆☆☆......

کونی بلین سے میں بخوبی واقف تھا۔ اس سے ...ا پہلے بھی مل چکا تھا۔ میری دستک پر اس نے ...وازہ کھولا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں ...وئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ اس وقت بھی ایک ...ایک سا گون پہنے کھڑی تھی جو اس نے تکلفاً جسم پر ...ال لیا تھا۔ وہ ستر پوشی کے موڈ میں نہیں تھی۔

مجھے' بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ایک آدمی کو سامنے ...کر اس نے اوباشانہ انداز میں انگڑائی لی اور اپنے ...ی بالوں کو جھٹک کر بولی۔ ''ڈینی میں تمہاری منتظر ...تھی۔''

''مجھے بھی اس کی توقع تھی۔ وہ کہاں ہے؟'' میں ...نے پوچھا۔

''کون کہاں ہے؟'' اس نے حیرت کا مظاہرہ ...کیا۔

میں نے قدم بڑھایا تو اس نے ایک طرف ہو کر ...مجھے راستہ دیا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو میری ...شامہ سے بھینی بھینی خوشبو کا ایک جھونکا ٹکرایا۔ معلوم ...نہیں اس نے خوشبو لگائی تھی یا یہ اس کے جسم کی مہک ...تھی۔ اس کی نیم باز آنکھوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا ...اس نے تھوڑی دیر پہلے ڈھیروں پی ہو۔

دروازہ بند کر کے وہ اندر آئی۔ اس نے میز کے قریب پہنچ کر ڈبے میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

میں تیزی سے اندر گیا اور چاروں طرف نگاہ ڈال کر واپس آ گیا۔

''میرا لڑکا کہاں ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''تم اپنے بیٹے کو پوچھ رہے ہو؟'' اس نے سگریٹ کو شعلہ دکھایا۔

''ہاں۔''

''مجھے کیا معلوم؟'' اس نے تیکھے لہجے میں کہا اور سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچ کر دھوئیں کا ایک مرغولہ فضا میں اگل دیا۔

''میں نے تم لوگوں کے بارے میں بہت سی باتیں سنی ہیں۔'' میں بولا۔

''مثال کے طور پر؟'' اس نے اٹھلا کر پوچھا۔

''یہی کہ تم اور نک میرے بیٹے کو غلط راستوں پر چلانے کی کوشش کر رہے ہو' اور یہ کہ میرا بیٹا آوارگی اختیار کر رہا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' اس نے عجیب سا سوال کیا۔

''تم بہ خوبی جانتی ہو کہ مجھے اس طرز کی زندگی سے نفرت ہے۔ مجھ پر ایسی قاتلانہ نگاہ نہ ڈالو۔ اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔''

''جونی اب بالغ ہو گیا ہے مسٹر! اسے اپنے برے بھلے کی تمیز ہے۔ وہ بالغ ہے اس لیے جس کے ساتھ رہے اور جو چاہے کرے' تم اس کے معاملے میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟''

''وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے' میں انہیں پسند نہیں کرتا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے تو جو پسند ہے' وہ اسی کے ساتھ رہے گا۔''

''مجھے بہ خوبی معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔'' میں نے بھیانک لہجے میں کہا۔ ''مگر بہتر ہوتا کہ تم

میرے غصے کو آواز نہ دیتیں۔''

''دیکھو ڈینی! اگر تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ میری بے عزتی کرو تو......''

''میں یہاں جونی کو تلاش کرنے آیا ہوں۔ وہ محض ایک بچہ ہے۔ اس لیے مجھے اس کا تم لوگوں سے میل جول پسند نہیں ہے۔ میں تمہارے کرتوت سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''اس کی عمر اکیس سال ہے اور وہ قانونی طور پر بالغ ہو چکا ہے۔ خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے' بالغ شہری کی طرح ووٹ دے سکتا ہے' تم غلطی کر رہے ہو بوڑھے گدھے وہ اب بچہ نہیں رہا۔''

''اگر کسی کی مسیں بھیگ جائیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بالغ ہو گیا ہے یا اس میں شعوری پختگی آ گئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے؟'' اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ ''تمہارے ہاتھ پیر بہت لمبے ہیں اور رابطے مضبوط۔ تم خود معلوم کر لو کہ وہ کہاں ہے۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ فضا میں کشیدگی بڑھ گئی۔ دفعتاً وہ مسکرائی۔ جیسے اس کشیدگی کو کم کرنا چاہتی ہو۔ ''جیل کی فضا کیسی رہی؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کہیں اب تک گرمیوں کی چھٹیاں گزار رہا تھا۔''

''واقعی؟''

''ہاں' یہ چھٹیاں ایسی تھیں جن کا معاوضہ بھی ملنا تھا۔ میں نے پانچ سال جیل میں گزارے اور اب لوٹی ہوئی رقم میری ہو گئی کونی! پچاس ہزار ڈالر کم نہیں ہوتے۔ میں اب شاندار زندگی گزاروں گا۔ میں اپنے حصے کے پچاس ہزار ڈالر چاہتا ہوں۔''

''اس سلسلے میں نک سے بات کرو۔ لوٹ کی رقم اس کے پاس ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسی سے بات کر لوں گا۔ پہلے جونی کا معاملہ صاف کر دو وہ کہاں ہے؟''

''تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟''

''میں ابھی ابھی جیل سے نکلا ہوں اور یہ تک نہیں جانتا کہ میرا بیٹا کہاں ہے۔''' میں نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں' اسے اس گرد آلود ماحول سے نکال کر کہیں اور لے جانا چاہتا ہوں۔ جہاں تم جیسے لوگوں کا اس پر سایہ بھی نہ پڑ سکے۔ میں نے نہایت کثیف بلکہ زہر آلود زندگی گزاری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ زہر یا یہ کثافت اس کی زندگی میں بھی داخل ہو۔ میں نے اپنے بچے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ وہ باقی زندگی خوش و خرم طور پر گزار سکتا ہے۔ اسے تم جیسے گھناؤنے لوگوں کے ساتھ رہنے کی کوئی حاجت نہیں۔''

''تم میرے متعلق ایسے ریمارکس پاس نہیں کر سکتے۔''

''میں اس سے بھی زیادہ کہہ سکتا ہوں۔ چند روز پہلے تک میں گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا مگر اب میں باہر آ گیا ہوں۔ اب میں اس کمینے ماحول سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ نک میرے حصے کے پچاس ہزار ڈالر دے دے گا' پھر میں اپنے بیٹے کو......''

''بکواس بند کرو۔'' وہ پھنکاری۔ ''اب وہ بچہ نہیں رہا۔''

''اگر تم نے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی یا میرے بچے پر کوئی غلیظ نگاہ ڈالی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا تم مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو ڈینی؟'' اس نے بے خوفی سے پوچھا۔

''تمہارا خیال ہے کہ نک بہت خوف ناک آدمی ہے اور اس کے گروہ کے افراد سارے شہر میں پھیلے

ہوئے ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''مگر گروہ کے آدمی تمہیں ہر لمحے تحفظ نہیں دے سکتے۔ کم از کم اس وقت تو تمہیں کوئی میرے قہر سے نہیں بچا سکتا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ مجھے جونی کے بارے میں بتا دو۔''

''اس قسم کی گیدڑ بھبکیاں دے کر تم مجھے مرعوب نہیں کر سکتے۔ جہاں تک تحفظ کا سوال ہے تو میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔''

''میں پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے؟''

''کون کہاں ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''کونی! تم یہ خوب جانتی ہو کہ میں کس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' میرا پارہ چڑھنے لگا۔

''اگر تمہارا خیال ہے کہ وہ یہاں چھپا ہوا ہے تو یہاں کی تلاشی لے سکتے ہو۔''

اس بار میں نے ایک ایک کونا چھان مارا اور عمیق نگاہ سے تلاشی لی لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ جب میں تھک ہار کر واپس آیا تو اس نے کہا۔ ''تمہیں اطمینان ہو گیا؟ یا اب بھی یہی گمان ہے کہ میں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے؟''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھے گالی دے رہی ہو لیکن اس نے اپنے اشتعال پر قابو پایا اور وہاں سے نکل آیا۔

......☆☆☆......

نک تھرنٹن کو گوشت کا پہاڑ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے بازوؤں پر گوشت کی تہیں تھیں اور رخسار لٹکے جا رہے تھے۔ گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی اور چہرے کے نیچے گوشت کی دو تہیں اس طرح پیدا ہو گئی تھیں کہ چہرے پر ایک کی بجائے تین ٹھوڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے دیکھ کر اس نے گرم جوشی کا اظہار کیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیر تک دباتا رہا۔

ایک زمانے میں وہ اپنے بغلی ہولسٹر میں ریوالور رکھا کرتا تھا لیکن اب وہاں گوشت کی زیادتی سے اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی اسے اب ریوالور رکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس کرائے کے بہت سے ریوالور بردار تھے' جو ہمہ وقت اس کی جنبش ابرو کے منتظر رہا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں میں بھی اس کا ماتحت رہ چکا تھا مگر ایک معاملے میں گرفتار ہو گیا تھا تاہم میں نے زبان نہیں کھولی تھی جس کے نتیجے میں لوٹ کی رقم پولیس کے پاس جانے سے بچ گئی تھی۔ اب میں اپنا حصہ یعنی پچاس ہزار ڈالر لینے آیا تھا۔

''تم اچھے لگ رہے ہو ڈینی۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تمہارا چہرہ قدرے زرد ہے تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جسم تو ویسا ہی مضبوط اور توانا ہے۔''

''میرا کمرہ ایک ورزشی کلب کے اوپر ہے۔''

''ہاہاہا۔'' نک منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''لوگ صحیح کہتے ہیں کہ تمہاری حس لطیف ابھی فنا نہیں ہوئی ہے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا ہوں کہ تم پرانے والے ڈینی ہو۔''

''میں ایک خاص معاملے میں تمہارے پاس آیا تھا نک۔''

''خاص معاملہ؟ وہ کیا؟''

''شاید تم بھولے نہیں ہو گے کہ تمہیں میرے پچاس ہزار ڈالر ادا کرنا ہیں۔''

''پچاس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ تم نے میرے لیے اتنا لمبا ہاتھ مارا۔''

''لفظی خراج تحسین پیش کرنے کی بجائے بہتر ہوتا کہ تم اس کا عملی مظاہرہ کرتے۔'' میں مسکرایا۔

نک نے پھر قہقہہ لگایا۔ اس کی توند میں زلزلہ سا آ گیا اور سارا جسم ہلنے لگا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اپنی ڈیسک کے قریب گیا۔ کرسی پر بیٹھنے کے

بعد اس نے دراز سے ایک چیک بک نکالی اور میز پر ڈال دی۔

''میرا خیال ہے کہ چیک مناسب رہے گا کیونکہ رقم زیادہ ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے چیک تو اصلی سونے کے مانند ہوتے ہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں چیک لینے میں کیوں تامل ہے؟''

''میں جانتا ہوں مگر اس کے باوجود میں نقد لینا پسند کروں گا۔''

''ڈینی......ڈینی۔'' اس نے بے چینی سے منہ چلایا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''اتنی رقم تو یہاں نہیں رکھی جاسکتی؟ تم چیک کیوں نہیں قبول کررہے ہو؟''

''ممکن ہے میں اس چیک کو لے کر بینک تک نہ پہنچنے پاؤں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم چیک کی ادائیگی رکوادو۔ چیک کی ادائیگی اس صورت میں رکوانا تو بہت آسان ہے کہ رقم طلب کرنے والے ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔''

''گویا اس سلسلے میں تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔'' اس نے اپنے شانوں کو جھٹک کر کہا۔ ''خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میں تمہیں ٹھکانے ہی لگانا چاہوں تو یہ کام نقد رقم کی ادائیگی کے بعد بھی انجام دے سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے' جب تمہارے دماغ میں سوراخ ہوچکا ہوگا تو تم اس پر احتجاج نہیں کرسکو گے کہ کوئی تمہاری جیبوں میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے ملائم لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے میں رقم' سیونگ بانڈز کی شکل میں چاہتا ہوں۔''

''کیا؟''

''شاید آج کل تم اونچا سننے لگے ہو۔ میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سیونگ بانڈز کا تذکرہ کررہا تھا' اور یہ کہ تمام بانڈز میرے لڑکے جونی کے نام ہوں گے۔''

''تم نے اس لائن پر کیسے سوچا؟'' نک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''جب آدمی ہمہ وقت بھیڑیوں کے غول میں رہتا ہے تو اسے اپنی کھال کی حفاظت کرنا آہی جاتی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم رقم بانڈز کی شکل میں چاہتے ہو تو میں اس طرح بھی ادائیگی کردوں گا مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔''

''زیادہ وقت تو نہیں لگنا چاہیے۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''تم اپنے کسی آدمی کو ابھی بینک روانہ کردو۔ وہ بانڈز لے آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آجاؤں گا۔''

''غالباً تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔ کیوں؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''ہاں' اب مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔''

''تمہیں اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے بھی سوچ لینا چاہیے تھا۔'' نک بولا۔

''ہاں' مجھے اسی وقت یہ سب سوچ لینا چاہیے تھا۔ بہر حال اب میں پوری طرح محتاط ہوں اور تم مجھے کوئی دھوکا نہیں دے سکتے۔''

''میں تمہیں دھوکا دے کر اس کاروبار میں بے اعتباری کی فضا نہیں پیدا کرنا چاہتا۔'' نک تھرنٹن نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تم چھ بجے آجاؤ ڈینی! تمہیں بانڈز تیار ملیں گے۔''

''یہ نہ بھولنا کہ بانڈز جونی کے نام ہوں گے۔''

''میں قطعی نہیں بھولوں گا۔''

''اور اب ایک دوسری بات۔''

''وہ کیا؟''

''جونی کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟'' نک تھرنٹن مسکرایا اور اس نے اپنے مجرب باز دہلائے۔

☆☆☆......

نک تھرنٹن کے ٹھکانے سے باہر آکر میں دماغ سوزی کرنے لگا کہ جونی کہاں ہوسکتا ہے۔ نک کا گروہ بہت بڑا ہے۔ وہ اس کی فکر میں کیوں دبلا ہونے لگا۔ پھر یہ جونی تو ابھی بہت چھوٹا تھا' وہ اس کے کس کام کا؟ نک کے گروہ میں تو ایک سے ایک گھاگ شخص پڑا ہوا تھا۔

میں نے ہر ممکنہ جگہ پر اسے تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ میں پانچ سال سے اپنے بچے سے جدا تھا۔ اسی لیے اب اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کے لیے میری نگاہ ترس رہی تھی۔ میرا رواں رواں اسے آغوش میں لینے کے لیے مچل رہا تھا۔

جب عدالت سے مجھے سزا ہوئی تھی تو وہ اس وقت دس سال کا تھا۔ گویا قانونی طور پر نابالغ' اس لیے عدالت نے اسے میرے سب سے قریبی رشتے دار کی امانت میں دے دیا۔ یعنی وہ میری ہمشیرہ کی سرپرستی میں چلا گیا' میں اپنی جگہ مطمئن تھا کیونکہ ٹیگو اچھا آدمی تھا۔ میری بہن اور بہنوئی میرے بچے کی مناسب دیکھ بھال کرسکتے تھے۔

مگر وقت کب یکساں رہتا ہے' میری بہن نے ٹیگو کو چھوڑ دیا۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ اب وہ کہاں ہوگی۔ میرا بچہ لوگوں کے اس جنگل میں کہاں گم ہوگا؟ یہ صحیح ہے کہ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا' کچھ کچھ بالغ ہوگیا تھا' جب ہی کونی بلین جیسی عورتوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا تھا۔

میں اسے تمام متوقع جگہوں پر تلاش کرچکا تو میں نے شراب خانوں میں جھانکنا شروع کردیا۔ وہاں بھی سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا' یا ممکن ہے کہ وہ اس کے بارے میں بتانا نہیں چاہتے ہوں۔ چار شراب خانوں سے مایوس ہو کر جب میں پانچویں میں داخل ہوا تو میری ملاقات بینی گان سے ہوئی۔

وہ اپنا ایک پاؤں ریلنگ پر رکھے کھڑا تھا۔ اس کے آگے وہسکی کا چھوٹا پیگ رکھا تھا اور آنکھیں فلسفیوں کے انداز میں کسی نادیدہ نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ پانچ سال پہلے بھی اس کا یہی حال ہوا کرتا تھا۔ وہ شراب کم پیتا تھا' اور فضا میں غیر مرئی نقطوں کو زیادہ گھورتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمام پولیس والے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

میں اس کے قریب گیا تو اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''کہو کیسی گزر رہی ہے؟''

''فی الوقت سپاٹ اور بے ذائقہ۔'' میں نے جواب دیا اور بارٹینڈر سے کہا۔ ''میرے لیے ایک ڈبل وہسکی بنانا۔''

''جیل خانے کی سیر کیسی رہی؟'' بینی گان نے پوچھا۔

''اچھی نہیں رہی کیونکہ وہاں تمہاری کمی محسوس ہوئی تھی۔''

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''کاش میں وہاں کا وارڈن ہوتا' اس صورت میں تم مجھے زندگی بھر یاد رکھتے۔''

بینی گان کا جسم ٹھوس اور قد خاصا دراز تھا۔ میں نے اس جیسے فرض شناس اور بے رحم پولیس والے بہت کم دیکھے تھے۔ وہ بینک لوٹنے والے معاملے میں پانچ سال پہلے ہم لوگوں کے پیچھے بہت پڑا تھا مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ مجھے محض سزا ہوکر رہ گئی۔ بہر حال اب میں اس کے سائے سے بھی بچنا چاہتا تھا کیونکہ میں پچاس ہزار ڈالر کا مالک بننے والا تھا۔ وہی پچاس ہزار جن سے میں اپنی اور اپنے بچے کی زندگی سنوار سکتا تھا اور یورپ کے کسی بھی ملک میں جا کر قیام کرسکتا تھا۔

بارٹینڈر نے جام تیار کرکے میرے سامنے رکھ دیا تو میں نے ہلکی سی چسکی لی۔

''تمہیں رقم کب ملے گی؟'' اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''کیسی رقم؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''پانچ سال پہلے تم لوگوں نے ایک بینک سے ایک لاکھ ڈالر اڑائے تھے۔ اس وقت قانون کچھ ثابت نہیں کر سکا تھا' تاہم زیر زمین دنیا کے افراد کہتے ہیں کہ وہ رقم نک کے پاس محفوظ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس میں سے حصہ ضرور ملے گا۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''مجھے کوئی حصہ وصہ نہیں ملے گا۔''

''تم مجھ سے نہیں چھپا سکتے۔'' اس نے مجھے تیز نگاہ سے گھورا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''سچ کہو' کیا تمہارا دامن پاک ہے؟''

''اگر میرا دامن آلودہ ہو تو تم میرے گلے میں دوبارہ پھندا ڈال سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

بینی گان نے منہ بنایا اور یوں ہی میری جیبیں تھپتھپانے لگا۔ میری دائیں جیب میں رکھا ہوا چاقو اس کی انگلیوں سے ٹکرایا تو اس نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ناخن تراش۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کیا قانون اس پر معترض ہے؟''

''اس کے پھل کی لمبائی پر منحصر ہے۔''

''اس کی لمبائی چار انچ سے کم ہے۔'' میں نے غصہ دلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم اس کی پیمائش کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں' مجھے تمہاری بات پر اعتبار ہے ڈینی۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''شکریہ۔''

بینی گان دوبارہ اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا جام اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تمہارا بیٹا......''

''کیا ہوا میرے بیٹے کو؟'' میں نے سرعت سے کہا۔

''کچھ نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ مجھے تمہارا منصوبہ جان کر خوشی ہوئی۔ تم بیٹے کے لیے جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ لائق تحسین ہے' اسے گناہوں کی دلدل سے نکال کر کہیں اور لے جاؤ ڈینی۔ کوشش کرو کہ اس پر تمہاری منحوس شخصیت کا سایہ نہ پڑنے پائے۔''

''ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''اس وقت اس کی خبر گیری کرنا ضروری ہے ڈینی' آج کل اس کے متعلق شہر میں کئی کہانیاں گردش کر رہی ہیں۔ لوگوں کی زبان پر اس کے افسانے ہیں۔''

''کیسے افسانے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''یہ کہ جونی اب آوارگی اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس نے نک تھرنٹن کے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور اب وہ ریوالور لے کر دندناتا پھرتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ......''

''بس کرو......بس کرو۔'' میں نے اضطراب میں ہاتھ ہلایا۔

''لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ وہ کونی بلین کے دام الفت میں گرفتار ہے۔ بندہ بے دام کی مانند۔ اس کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کونی اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر یہ کہہ دے کہ وہ اپنے دادا کو قتل کر دے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔''

''شٹ اپ۔'' میں نے برہم ہو کر کہا۔

''تم اس وقت میرا منہ بند کرا سکتے ہو مگر سارے شہر کی زبان پر اس کے افسانے ہیں۔ تم کس کس کا منہ بند کراؤ گے؟''

''خدا کے لیے خاموش رہو تاکہ میں سکون سے شراب پی سکوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''میں کہتا ہوں' جونی کو اس جہنم سے نکال کر کہیں اور لے جاؤ ڈینی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس میں جل

فنا ہو جائے۔ میں کسی نہ کسی روز نک تھرنٹن پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس وقت جونی جیسے لڑکے گرفت میں آ جائیں گے۔ نک تھرنٹن خود ہی اپنے گروہ کا کچا چٹھا کھول دے گا۔ تم اس وقت اپنے لڑکے کو کیسے بچاؤ گے؟ اسے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کی جوانی پر رحم کھاؤ اور اسے بھیڑیوں کے غول سے نکال لے جاؤ۔''

''اگر نک نے اسے اپنی راہ پر لگایا ہے تو میں اس کا خون پی جاؤں گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

☆☆☆

بینی گان کے جانے کے بعد میں دیر تک شراب پیتا رہا۔ میرا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ پینے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ جب چھ بجے تو میں چونکا۔ مجھے نک کے پاس وصولیابی کے لیے جانا تھا۔

نک تھرنٹن ایک اپارٹمنٹ کی بارھویں منزل پر رہتا تھا۔ میں اپنی کار میں لفٹ کے ذریعے بارہویں منزل پر گیا' پھر اسے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کر کے اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ جب میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو اندر سے سرگوشیاں سنیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولا گیا۔ سب سے پہلے میری نگاہ کونی بلین پر پڑی۔ معمول کے مطابق اس وقت بھی وہ برائے نام لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے میری طرف ایک قاتلانہ مسکراہٹ اچھالی اور کہا۔ ''تم ذرا دیر سے آئے ڈینی۔''

''شاید کچھ دیر سے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں کوئی جشن ہو رہا ہے تو میں جلدی آتا۔''

میں اس کے ساتھ اندرونی کمرے تک گیا جہاں نک اپنی ڈیسک کے پیچھے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور اس نے مصافحہ کیا۔

''تم بالکل صحیح وقت پر پہنچے ڈینی۔''

''کونی کا کہنا ہے میں قدرے دیر سے آیا ہوں۔''

''معاملہ پچاس ہزار ڈالر کا ہو تو تم دیر سے کیسے آ سکتے ہو۔'' اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ بدستور مسکراتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگنے لگی کیونکہ اس کے ہونٹ محض افقی سمتوں میں کھنچے ہوئے تھے جبکہ آنکھوں سے کینہ جھلک رہا تھا۔ ''ہوں تو تمہیں بانڈز چاہئیں؟''

''ہاں۔ شاید میں کہہ کر گیا تھا۔''

''یہ لو......وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔'' اس نے دراز کھول کر بانڈز کی گڈیاں میز پر ڈال دیں۔ ''اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا کہ نک تھرنٹن اپنے ساتھیوں سے دھوکا فریب نہیں کرتا۔''

میں نے مسکرا کر گڈیاں گنیں۔ وہ مجموعی طور پر پچاس ہزار ڈالر کی مالیت کی تھیں۔

''ٹھیک ہے؟'' نک نے پوچھا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

مجھے اس کی مسکراہٹ سے الجھن ہونے لگی۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور ایک بانڈ گڈی سے کھینچ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''تم کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ بولا۔

''یہی کہ تم نے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ بانڈز جونی کے نام ہونا چاہئیں مگر ایسا نہیں ہے۔''

''اوہ! کیا واقعی؟ میں نے ان کو ہدایت کی تھی کہ ......''

''جونی کی بجائے یہ سب تمہارے نام ہیں۔ تم کیا ڈرامہ رچا رہے ہو نک؟''

''یہ بینک کے احمق کلرک کی غلطی سے ہوا ہے۔'' نک بولا۔ ''تم خواہ مخواہ میری طرف سے بدگمان ہو رہے ہو۔''

''احمق' کلرک نہیں تم ہو۔ غالباً تمہیں خوش فہمی ہے کہ مجھے الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے غصہ دلانے والی مسکراہٹ سے پوچھا اور میرے کان کی لویں گرم ہو گئیں۔

''معاملہ دو اور دو چار کی مانند سادہ ہے۔ میں ان بانڈز کو لے کر جیسے ہی یہاں سے نکلتا تم مجھے ٹھکانے لگوا دیتے۔ الزام یہ ہوتا کہ میں نے تمہارے بانڈز چرائے ہیں۔ نہیں' تھرنٹن نہیں! اب میں ایسی بچکانہ چال میں نہیں آ سکتا۔ ان ہتھکنڈوں کو کسی اور پر آزمانا۔''

''میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اتنی سی بات کے لیے اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا پھروں۔'' نک نے شانے جھٹک کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس قصے کو اتنی سی بات کے لیے اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا پھروں۔'' نک نے شانے جھٹک کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس قصے کو ختم کیا جائے۔'' کونی بلین نے دخل دیا۔

''کیسے ختم کیا جائے؟'' میں نے برہم ہو کر کہا۔

''تمہیں معلوم نہیں کہ نک سانپ جیسی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس کے کاٹنے پر آدمی پانی نہیں مانگ سکتا۔''

''اگر میں ان بانڈز پر نام تبدیل کرانے سے انکار کر دوں تو؟'' نک نے تلخ مسکراہٹ سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب دیے بغیر اچھل کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کی ٹھوڑی پر مکا مارا۔ اس کے حلق سے بھنسے کی سی آواز نکلی اور وہ دیوار سے جا لگا۔ دوسرا مکا میں نے اس کے پیٹ پر مارا تو وہ ڈگراتا ہوا منہ کے بل گرا اور چند ثانیوں میں بے ہوش ہو گیا۔

میں نے جھپٹ کر تمام بانڈز میز سے اٹھا لیے اور کونی سے کہا۔ ''اب میں ان کو کیش کرانے جا رہا ہوں۔ اس لفنگے سے کہنا کہ کسی کو میرے تعاقب میں نہ بھیجے ورنہ میں اس کا کچومر نکال دوں گا۔''

''تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔'' عقب سے ایک آواز آئی۔

آواز شناسا نہیں تھی' اس لیے میں تیزی سے مڑا۔ بغلی دروازے پر ایک سایہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ریوالور کی نال میری کھوپڑی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی شکل دیکھی۔ وہ بڑی حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔ گزشتہ بار جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ لڑکا سا لگتا تھا۔ اس کے رخسار ابھرے ہوئے اور ہونٹ ملائم تھے۔ آنکھوں سے نرمی جھلکتی تھی مگر اب اس کے چہرے پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا اور آنکھوں سے کرختگی جھلک رہی تھی۔

''ہیلو پاپ!'' جونی نے کہا۔

میرے بیٹے نے پاپ کا لفظ کچھ اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے اس کے ہونٹ جل گئے ہوں۔ جیسے اس نے یہ لفظ طوعاً و کرہاً ادا کیا ہو۔

''جونی!'' میں نے مسرت آگیں لہجے میں کہا۔

''اپنی جگہ سے مت ہلو پاپ......! ایک انچ بھی نہیں۔''

''اس ریوالور کو جیب مین رکھ لو جونی۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ تم مجھے......''

''شٹ اپ!'' وہ دہاڑا۔

''تم نے ڈینی کو حیران کر دیا۔'' کونی نے اٹھلا کر کہا۔ اس کی آواز فتح مندی سے سرشار تھی۔ ''ڈینی واقعی حیرت زدہ ہے۔''

''دیکھو تم لوگ......''

''اپنے بیٹے کو وہ تلقین کیوں نہیں کرتے جو آج سہ پہر تم مجھے کر رہے تھے۔'' کونی پھنکاری۔ ''اس کو یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ میں فاحشہ اور مکار عورت ہوں' اسے میرے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔'' پھر وہ جونی کی طرف مڑ کر بولی۔ ''اب اس خبیث کا وعظ سنو جونی۔''

''میں تمہارے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتا کونی۔'' جونی نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گھونسا مار دیا ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا بدل جائے گا؟ اس کے نقوش تو تبدیل ہو ہی گئے تھے مگر آواز کتنی بدل گئی تھی؟ میرے لیے اس کے لہجے میں کتنی تلخی تھی۔ میرے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ پانچ سال میں وہ میرے لیے بالکل اجنبی ہو جائے گا؟ کونی بلین جیسی سڑی ہوئی عورت اسے اپنی جنبش آبرو پر نچا رہی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے دھند سی آ گئی۔ میں سراب ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھا تھا۔

''جونی!'' میں نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔

''اس ریوالور کو جیب میں رکھ لو۔ میں تمہارا باپ ہوں بیٹے تم......''

''بکواس بند کرو۔ تم ایک لٹیرے ہو۔ تمہیں سزا ہوئی تھی اور اب تم سزا کاٹ کر لوٹ کا حصہ لینے آئے ہو۔ تم ٹیگو سے زیادہ خبیث ہو۔ چچا ٹیگو سے دو ہاتھ آگے۔''

''جونی! یسوع مسیح کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ تمہیں گمراہ کر رہے ہیں اپنا آلہ کار بنا رہے ہیں۔ یہ تمہیں کبھی نہ کبھی بطور چارہ استعمال کریں گے' جیسے انہوں نے مجھے استعمال کیا تھا۔ میں......''

''اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''تم کونی کو خراب کہتے ہو جبکہ میں اسے کہیں سے خراب نہیں پاتا۔ ویسے بھی دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے کا تمہیں کیا اختیار ہے؟''

''جونی میرے پاس پچاس ہزار ڈالر ہیں۔ یہاں سے نکل چلو۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔ ہم اس سے ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ہمیں نک تھرنٹن جیسے لوگوں کے گروہ میں......''

''یہاں سے نکل چلوں؟ کونی کو چھوڑ دوں؟'' جونی نے حیرت سے کہا۔ ''بڑے میاں! شاید تمہارا دماغ الٹ گیا ہے۔ میں اب کونی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' اس نے توقف سے دوبارہ کہا۔ ''بہتر ہو گا کہ میں اب تمہارا جھگڑا نمٹا دوں۔''

میں نے چونک کر جونی کی طرف دیکھا۔ وہ میری سوچ سے قطعی مختلف ہو چکا تھا۔ میرے لیے یکسر اجنبی اور نا آشنا۔ اس کثیف ماحول میں اس کا دل و دماغ گرد آلود ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ہلاک کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بارے میں وہ سنجیدہ ہے کیونکہ ریوالور کے ٹریگر پر رکھی ہوئی اس کی انگلی بتدریج سفید ہوتی جا رہی تھی۔

اب رونے' چیخنے یا گڑگڑانے کا وقت نہیں تھا۔ اس کے آگے ہر دلیل بے اثر ہو رہی تھی اس لیے اسے سمجھانا بھی فضول تھا۔ میں نے برق رفتاری سے جھکائی دی اور اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ جونی نے فائر کیا۔ گولی چلی مگر مجھے لگنے کی بجائے کونی کے سینے پر پڑی۔ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور سینہ پکڑے ہوئے فرش پر گری۔ اس کا ہاتھ بتدریج خون میں لتھڑتا جا رہا تھا۔

نقشہ پلٹتے دیکھ کر جونی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ میں چھلانگ لگا کر اس سے دور ہو گیا۔ کمرے کے دوسرے گوشے میں پہنچ کر میں نے سرعت سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا چاقو نکالا۔ وہی چاقو جسے میں نے ہینی گان کے سامنے ناخن تراش کہا تھا اس کے پھل کی لمبائی ساڑھے تین انچ تھی۔ اس لیے قانونی طور پر میں گرفت میں نہیں آتا تھا۔ میں نے اسے جھٹکے سے کھول لیا۔

جونی کی آنکھوں میں اجنبیت اور بے گانگی تھی۔ وہ ایسی منزلوں کا راہی بن چکا تھا جس میں اجسام' خون

اگلتے ہیں۔ فاحشہ عورتیں نوجوانوں کو اپنی جنبش ابرو پر نچاتی ہیں اور لوگ کثیف دھواں حلق میں اتار کر دوسری دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ کبھی میں بھی انہی منزلوں کا راہی تھا مگر اب میری اور اس کی دنیا الگ تھی۔

اس نے ہاتھ بلند کر کے دوسرا فائر کیا لیکن میں اس بار بھی جھکائی دے کر خود کو بچا گیا۔ میرے نتھنوں نے بارود کی بو محسوس کی تھی۔ فرش پر لڑھک کر میں تیزی سے اس کے قریب گیا۔ پھر میں نے اٹھتے ہی چاقو سے اس کے نرخرے پر وار کیا۔

اسے مجھ سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اس اچانک حملے سے سنبھل ہی نہ سکا۔ اس کے نرخرے سے خون کا فوارہ بلند ہوا تو وہ بلبلا کر بولا۔

''ذلیل! خبیث یہ کیا کر رہا ہے۔''

میں نے نرخرے کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے وار کیے۔ اس کی گردن لہولہان ہوگئی۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں تھوڑی دیر پیشتر ایک قاتلانہ چمک تھی، ماند پڑ گئی۔ وہ چیختا ہوا فرش پر گرا۔ کچھ دیر تڑپتا رہا، پھر اس کا جسم کانپا اور ایک جھٹکے سے ساکت ہوگیا۔

اسے خون میں لت پت دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں دبا لیا ہو۔ میری آنکھوں سے اشک رواں تھے اور کوئی چیز ٹھیک سے بھائی نہیں دے رہی تھی، تاہم میں کسی نہ کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا نک تھرنٹن کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر ڈیسک کے پیچھے سے نکالا اور فرش پر پٹخ دیا۔ وہ اب بھی ہوش وحواس سے عاری تھا۔ پھر میں نے ہینیگان کو فون کیا۔

☆☆☆......

جب ہینی گان آیا تو میں نے اپنی آنکھیں خشک کرچکا تھا، اپنے دل کو کسی نہ کسی طرح سے سمجھا چکا تھا۔ بونڈز میری جیکٹ کی جیب میں تھے اور چاقو نک تھرنٹن کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے نک کی طرف اشارہ کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''غالباً اس لڑکی کے لیے ان دونوں کے درمیان رنجش ہوئی ہے۔ اس کمینے نے میرے بیٹے کو......''

''تم نے ان لوگوں کو اسی حالت میں پایا تھا ڈیڈی؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''میں...... میں مجھے تمہارے بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر رنج ہوا۔''

''اس کا تذکرہ نہ کرو ہینی گان!''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

وہ ٹہلنے والے انداز میں نک کے قریب گیا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ ''یہ جب ہوش میں آئے گا تو خود کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر حیران ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''یہ خون آلود چاقو اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہے۔''

اس کی مٹھی میں دبا ہوا چھوٹا سا چاقو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی تھی، جیسے وہ کچھ سمجھنے یا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر وہ اٹھا پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر مجھ پر ایک مغموم نگاہ ڈالی اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

⌘

قسط نمبر 7

آتش زیر پا

وہ ظلم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا' جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا' جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔

حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی' اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پوروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے' ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے

پھر ایک دشمن جاں نے شب خوں مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔

اس کی وحشت دو چند ہوگئی' وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔

پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

سطر سطر ہنگامے' لفظ لفظ تجسس' نئے افق کی نئی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

طبلے کی تھاپ کے ساتھ ساتھ موت کا گہرا احساس شعور کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میرے ذہن پر حاوی ہوا تھا۔ کہیں دور میری موت کی خوشی میں محفل سجائی گئی تھی جس کا شور مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ دماغ پر چھائی دھند کی دبیز تہہ ہٹنے لگی۔ میں جو مر چکا تھا شاید دوبارہ زندگی کی جانب لوٹ آیا تھا۔ سنا تھا بے ہوشی کے بعد آنکھیں کھولنے والا کچھ دیر کے لیے خود پر بیتے لمحات بھول جاتا ہے اور ''میں کہاں ہوں۔'' جیسے سوال کرتا ہے۔ جانے کیوں میرے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے سے قبل ہی میرے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ میں موت کے سفر پر نکل کھڑا ہوا ہوں۔ خون کے چھینٹے اور جسم میں پیوست ہونے والی انگارے کی مانند گرم گولیوں کا احساس ابھی تک زندہ تھا۔ میں آنکھیں کھولنا چاہتا تھا لیکن جانے کیوں میرے پپوٹے میرے اختیار سے باہر نکل گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی آنکھیں نہیں کھول پا رہا تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے پھر آہستہ آہستہ جسم کی توانائی بحال ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک اور احساس نے گھیر لیا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا کھلی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی دبیز تہہ کے سوا کچھ نہ تھا میں نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں لیکن بے سود رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے مستقل اندھیرا تھا۔

''کیا کسی گولی سے کوئی ایسی رگ کٹ گئی ہے جس کا تعلق بصارت سے تھا؟ کئی سوال میرے دماغ کی دیواروں سے ٹکرانے لگے۔ دور کہیں طبلے کی آواز آرہی تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتی یہ تھاپ سر میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ بے بسی، اندھے پن کا احساس اور طبلے کی دھمک انتہائی اذیت کا باعث بن رہی تھی۔ چہرے پر نمی سے احساس ہوا کہ اندھی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ کائنات کا کمالا بے آواز رو رہا تھا۔ میں ایک

بار پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا۔

دوبارہ شعور نے ذہن کے دریچے پر دستک دی تو منظر نامہ بدل چکا تھا۔ بازو میں چبھن کا احساس اور کسی کی مدہم آواز زندگی کا پتا دے رہی تھی۔ چند لمحے ذہن سن رہا اور پھر گفتگو واضح ہونے لگی۔ میں یونہی خالی ذہن لیٹا رہا۔ آوازیں پھر مدہم ہوگئیں کچھ دیر بعد کوئی میرے قریب آیا اور سر کے نیچے رکھا تکیہ درست کرنے لگا۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ پہلا خیال کافی خوشگوار تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کمرے کی چھت پر لگا پنکھا میرے سامنے تھا۔ میں کچھ دیر یونہی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

اچانک کمرے میں موجود ذی نفس کو میرے ہوش میں آنے کا احساس ہوگیا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'' اس نے مدہم لہجے میں سوال کیا تو جیسے مجھے بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں جانے کہاں تھا یہاں مجھے کون لایا تھا میرے ذہن میں تین نام گونجنے لگے۔ بیکھے مل، شاہد ملتانی یا پھر میجر صاحب؟ پولیس نے مجھے اٹھایا ہوتا تو اس وقت کسی گھر کی بجائے اسپتال میں ہوتا۔ اس کمرے کی حالت واضح کر رہی تھی کہ یہ کمرہ کسی گھر کا حصہ ہے پرانا پنکھا اور ایک طرف رکھی پیٹی کسی اسپتال میں نہیں گھر میں ہی ہوسکتی تھی۔ میں نے سوال کرنے والی کی جانب دیکھا۔ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی جس کے کھلے بال میرے چہرے پر آرہے تھے۔

''آپ بول سکتے ہیں؟'' مجھ پر جھکتے ہوئے اس نے دوبارہ پوچھا تو اس کے لہجے سے تشویش چھلک رہی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ آنکھیں موند لیں کمزوری او تھکاوٹ کا بے پناہ احساس آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آنکھیں کھولنا بھی کسی قدر طاقت کا مرہون منت ہے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے بے مقصد لیٹا ہوا تھا۔ وہ لڑکی غالباً مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے قدموں کی چاپ دور جاتی سنائی دی۔

کچھ دیر بعد کسی نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی اجنبی لڑکی میرے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے سہارا دے کر بٹھا دیا اور کمر کے پیچھے تکیہ رکھ دیا۔

''گرم دودھ لینے گئی تھی۔ یہ پی لیں تو کمزوری کچھ کم ہو جائے گی۔ اس نے ایک طرف پڑا دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

میں نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا دودھ پی کر واقعی جسم میں توانائی بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے خالی گلاس واپس کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کافی زخمی تھے اس لیے ملتانی سائیں آپ کو یہاں چھوڑ گئے۔ آپ کے لیے ڈاکٹر کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔''

''شاہد ملتانی کہاں ہے؟''

''انہیں ایک ضروری کام سے جانا تھا ایک دو دن میں شاید لوٹ آئیں۔''

یہ کنفرم ہوگیا کہ میں اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ شاہد ملتانی نے میرے بدلے پیسے

ے کرنے کی بجائے نسلی خون کا ثبوت دیا وہ چاہتا تو مجھے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ سکتا لڑائی کے دوران زخمی فوجی کو بھلا کون پوچھتا ؟ شاہد ملتانی کے بارے میں متعدد بار سنا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے کسی فرد کی لاش بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دیتا۔

اپنے ساتھیوں کی لاش موقع واردات سے اٹھانا اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن جاتا تھا اس لیے مشہور تھا کہ جہاں شاہد ملتانی کی کسی سے ٹپ ہو اور اس کا کوئی ساتھی زخمی ہو جائے یا مارا جائے تو اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ اس کو اٹھا کر لے آئے۔ یہ کوئی نفسیاتی پہلو تھا پولیس سے اس کی نفرت کی انتہا تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی لاش تک کو پولیس سے بچاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب پولیس کسی لاش کو ہاتھ لگاتی ہے تو وہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری پولیس کا رویہ ہی تھا جس نے ایک بے ضرر طالب علم کو اس سطح تک پہنچایا تھا۔ میں نے شاہد ملتانی کے بارے میں یہ سب باتیں سنی ہوئی تھیں لیکن تب میرا ابھی یہی خیال تھا کہ یہ محض افواہیں ہیں جو اپنی دہشت پھیلانے کے لیے اس نے پھیلا رکھی ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پولیس کا گھیرا توڑنے والے دوبارہ صرف اس لیے لوٹ آئیں کہ ان کے کسی ساتھی کی لاش پولیس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ شاہد ملتانی اس معاملے میں جتنا جذباتی تھا اس سے کہیں زیادہ زیرک بھی تھا۔ وہ پولیس کے راستوں پر نظر رکھتا تھا اور کسی بھی وقت دوبارہ حملہ کر کے اپنا کام دکھا جاتا تھا۔

محفوظ جگہ پر ہونے کے احساس نے کئی فکریں دور کر دیں۔ اب میں نے اپنے اردگرد کا بھرپور جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ ایک درمیانہ سا کمرہ تھا۔ ایک طرف پیٹی رکھی ہوئی تھی جس پر مزید ایک صندوق پڑا تھا دیوار کے ساتھ وہ بیڈ تھا جس پر مجھے لٹایا گیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر مختلف کریمیں اور لوشن پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف میلے کپڑوں کا ڈھیر دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کمرہ کسی خاتون کے زیر استعمال ہے۔ اب تک میرا سامنا صرف ایک لڑکی سے ہوا تھا۔ وہ اس وقت بھی میرے سرہانے بیٹھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' وہ سوال جو پہلے کرنا چاہیے تھا مجھے اب یاد آیا۔

''میرا نام نیلی ہے، آپ اس وقت میرے ہی کمرے میں ہیں۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے اگلا سوال پوچھا۔

''لاہور ہے، اچھا میں چلتی ہوں باجی کو بتادوں کہ آپ جاگ گئے ہیں۔'' اس نے گڑبڑاتے ہوئے مختصر جواب دیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ وقت مجھے جانے کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ کمالا جٹ کبھی اپنے جٹ ہونے پر فخر کرتا تھا اور آج اس حال میں تھا کہ آنکھیں کھولنے میں بھی قوت درکار تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے پورے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نکال لیا ہو۔ میرے سامنے بار بار اپنے دوستوں کے چہرے آرہے تھے۔ وہ سب مارے گئے اور میں پھر بھی زندہ تھا عام طور پر محاذ جنگ میں زندہ رہ جانے والا آخری شخص یا تو غدار ہوتا ہے یا پھر بھگوڑا۔ جری اور جانباز تو آگے بڑھ کر ایک دوسرے پر جان لٹا دیتے ہیں۔ وہ یا تو شہید کہلاتے ہیں یا پھر غازی۔

میں کہاں کھڑا تھا؟ نہ میں اس جنگ کا فاتح تھا اور نہ ہی شہید۔ میں تو قیدی بھی نہ تھا بھاگنا کمالے جٹ نے سیکھا نہ تھا خدا جانے میرا کیا مقام تھا۔

تنہائی کے اس عالم میں خود احتسابی کا عمل شروع ہو چکا تھا اس کے ساتھ ساتھ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا کہ جب میرے سبھی ساتھی جان دے رہے تھے تو میں زندہ کیوں رہا۔ وہ مجھ پر قربان ہوئے تو میں کیوں ان پر قربان نہیں ہوا۔ کیا میرے خلوص اور دوستی میں کھوٹ تھا؟ کیا کمالے جٹ نے جتاں والی کی گندم نہیں کھائی تھی شدت کرب سے میں نے اپنا سر اِدھر اُدھر مارنا شروع کردیا۔ میرے سر کے نیچے تکیہ تھا اس لیے اس عمل سے شدید چوٹ تو نہیں لگ سکتی تھی لیکن شاید میں اس بات سے بے نیاز ہو چکا تھا عالم دیوانگی میں زمان و مکاں کا خیال ہی کہاں رہتا ہے۔ میرے سر میں دھماکے ہو رہے تھے جانے یہ اندرونی کرب تھا یا بیرونی طور پر لگی کسی چوٹ کا اثر لیکن ان دھماکوں نے ایک بار پھر حال سے بے حال کردیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور مجھے ان اذیت ناک سوالوں سے چھٹکارا مل گیا۔

یونہی سوتے جاگتے جانے کتنے دن گزر گئے۔ نیم غنودگی کے عالم میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ لوگ پاس کھڑے ہو کر میرے بارے میں مبہم گفتگو کرتے ہیں کئی دفعہ بازو میں چبھن کا احساس بھی ہوتا تھا۔ مجھے دانستہ طور پر بے ہوش رکھا جا رہا تھا۔ بے ہوشی کا اثر کم ہوتا یا ختم ہونے لگتا تو چند ہی لمحوں بعد کوئی شخص چلا آتا وہ غالباً کوئی ڈاکٹر یا ڈسپنسر ٹائپ شخص تھا جو آتے ہی میرے بارے میں کسی سے ایک آدھ سوال کرتا اور پھر بے دردی سے کوئی انجکشن لگا کر دوبارہ گہری نیند سلا دیتا تھا۔

اس دوران طبلے کی تھاپ بھی سنائی دی جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ ماہرانہ انداز میں طبلہ کون بجاتا تھا اور وہ شخص کہاں تھا اس بارے میں مجھے کچھ نہ پتا تھا میں محض ایک قیدی بن کر رہ گیا تھا جسے جانے کیوں ہوش کی دنیا میں لوٹنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی رگوں میں نشہ بھر دینے کی وجہ بھی مجھے معلوم نہ تھی۔ سچ کہوں تو میں وہاں ایک زندہ لاش بن چکا تھا۔ سوچ سمجھ تو دور مجھے تو آنکھ کھلتے ہی اردگرد دیکھنے کا بھی موقع نہ دیا جا رہا تھا غالباً مجھے وہاں رکھنے والے کسی کے منتظر تھے۔

یہ سب ایک مخصوص دائرے میں چل رہا تھا۔ پھر اس میں دراڑ پڑنے لگی۔ مجھے کچھ دیر ہوش والوں کی دنیا میں جینے کا حق ملنے لگا۔ اب میں گہری نیند سے بیدار ہوتا تو ایک نوخیز لڑکی میرے پاس بیٹھی مجھے دیکھ رہی ہوتی تھی میرے جاگنے کے کچھ دیر تک وہ یونہی بیٹھی رہتی مجھ سے ایک آدھ سوال کرتی جس کا جواب عموماً ہوں ہاں میں ہی ہوتا کیونکہ ہوش میں آنے کے بعد میرا ذہن میرے کنٹرول میں نہ ہوتا تھا۔ بھاری پن کا احساس مجھ پر حاوی ہوتا اور یادداشت انتہائی کمزور محسوس ہوتی۔ وہ لڑکی کچھ دیر خود ہی بولتی رہتی اور اپنی باتیں کرتی رہتی۔ گرم دودھ لا کر پلاتی اور پھر کسی کو فون کر کے بلا لیتی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اندر آتا اور کوئی بات کیے بنا انجکشن لگا دیتا جس کے بعد میں دوبارہ گہری نیند سو جاتا۔ آہستہ آہستہ ہوش میں آنے کے بعد انجکشن لگانے کا درمیانی عرصہ بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ قوت ارادی بھی لوٹنے لگی۔

ایک دن میری آنکھ کھلی تو خود کو خلاف معمول چاق و چوبند محسوس کیا۔ بازو میں ہلکی سی چبھن کا احساس تھا جیسے کسی نے ابھی انجکشن لگایا ہو یہ پہلے کے برعکس تھا۔ اس سے پہلے بازو میں چبھن کے احساس کے ساتھ ہی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ اب یہی چبھن ہوش کی دنیا میں لا رہی تھی۔ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ پہلے جس انجکشن میں بے ہوشی کی دوائی ڈال کر رگوں میں اتاری جاتی تھی اب اس میں زندگی بھری گئی تھی۔ ایک ہی تکلیف انسان کو زندگی بھی دے جاتی ہے اور وہی اذیت موت کی جانب بھی دھکیل دیتی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔ اس انجکشن نے بھی فطرت کے اصولوں کے مطابق اثر کیا تھا۔ یہ جن ہاتھوں میں تھا اس کی تاثیر انہی کی مرہون منت تھی۔ شاید انسان کی طرح انجکشن بھی کٹھ پتلی ہوتے ہیں۔

میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا تو نیلی چراغ کے جن کی طرح دودھ کا گلاس اٹھائے میرے پاس پہنچ گئی۔ اب تک مجھے اسی نے سنبھالا ہوا تھا۔ شاید یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ میں نے دودھ پینے سے انکار کردیا۔ انجکشن کی تکلیف اپنی جگہ لیکن مجھے شک ہو گیا تھا کہ اس دودھ کا بھی میری بے ہوشی سے کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ خیال ابھی آیا تھا اور میں نے بلا جھجک نیلی سے اپنے خدشات کا بھی اظہار کردیا میری بات سن کر وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ سر پیچھے کی جانب پھینکے وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی اور میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں لگتا ہے اس دودھ میں کچھ ملا کر پلاتی ہوں تو تم بے ہوش ہو جاتے ہو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو نیلی کہنے لگی۔ اگر میں نے تمہیں بے ہوش کرنا ہوتا تو اتنا تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی سیدھا سیدھا تمہیں بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیتی۔''

اس کی بات دل پر اثر کر رہی تھی دل کہہ رہا تھا کہ اتنا بے ساختہ ہنسنے والی اس لمحے جھوٹ نہیں بول رہی۔ دماغ ابھی تک محتاط تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ممکن ہے وہ جھوٹ نہ بول رہی ہو۔ اس کی دلیل بھی اثر رکھتی ہے لیکن پھر بھی یہ ممکن تھا کہ وہ بلف کروا رہی ہو۔ دماغ محتاط تھا لیکن نیلی ایک بار پھر ہنسی تو میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ سے گلاس تھام لیا جہاں اتنے دن سے بے ہوش رہا وہاں دو چار دن کی بات ہی کیا تھی۔ میں نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ گلاس خالی ہوتے ہی نیلی بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''تو جناب اب آپ پھر بے ہوش ہو رہے ہیں۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''مجھے بے ہوش کرنے کے لیے تو جناب کی نگاہیں ہی کافی ہیں۔'' اس کی شرارت محسوس کرتے ہی میں نے بھی برابر کی چوٹ کردی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ نیلی خود مختار نہیں ہے وہ مجھے اس وقت تک کوئی بات نہیں بتائے گی جب تک اسے اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے کچھ پوچھنے کے لیے مجھے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ یہاں میری حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ قیدی کو سلاخوں کے پیچھے قید کیا جائے اور اسے قید خانے کا احساس دلایا جائے بعض قیدی ان دیکھی دیواروں کے بھی قیدی ہوتے ہیں۔ چڑیا گھر میں بعض پرندوں کو آزاد رکھا جاتا ہے لیکن انہیں درختوں اور جھاڑیوں کے ایسے قید خانہ میں اڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جہاں

یہی درخت، جھاڑیاں، پہاڑیاں اور جھیلیں انہیں ایک مخصوص حد سے آگے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔'' قدرتی رکاوٹیں پیدا کر کے آزادی کے نام پر یوں قید رکھا جاتا ہے کہ قیدی کو قید کا احساس تک نہ ہو بالکل ویسے ہی جیسے ہمارا میڈیا آزادی صحافت کا تمغہ سجائے اشتہاری کمپنیوں کا قیدی بنا ہوا ہے۔ میں بھی ایسا ہی قیدی تھا جو بظاہر طبی امداد ملنے کے بعد آرام کر رہا تھا لیکن بہر حال اس کمرے سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا جا رہا تھا۔ میری ہی صحت کو بنیاد بنا کر مجھے نشہ آور انجکشن لگائے گئے اور غیر محسوس انداز میں اس کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی۔ میں ایک ایسا قیدی تھا جسے آرام کے نام پر قید کیا گیا تھا دلچسپ بات یہ تھی کہ مجھے اتنے دن تک یہی معلوم نہ تھا کہ میں کس کا قیدی ہوں۔ اب تک مجھے بس اتنا بتایا گیا تھا کہ یہاں تک میں شاہد ملتانی کی مہربانی سے پہنچا ہوں۔ مجھے یہاں بے ہوشی کے عالم میں لایا گیا اور پھر شاہد ملتانی بھی گدھے کے سر پر سینگ کی مانند غائب ہو گیا تھا۔ مجھے نہ تو کوئی اس کے بارے میں بتا رہا تھا اور نہ ہی کسی نے یہ بتایا تھا کہ میں یہاں کب تک رہوں گا۔ میں نے ابتدا میں اس حوالے سے سوال کیے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے مسلسل بے ہوشی میں رکھا جانے لگا۔ اب میں جان گیا تھا کہ اگر میں نے قسم کا تجسس ظاہر کیا تو یہ مجھے دوبارہ نشے کا ٹیکہ لگا دیں گے۔ یہاں اگر کچھ معلوم کرنا تھا تو اس کے لیے انہیں اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

نیلی مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک فربہی مائل خاتون اندر آ گئی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا نیلی کے مقابلے میں اس کی عمر زیادہ تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں اسے نیلی کی والدہ سمجھتا۔ آنے والی خاتون لگ بھگ چالیس سال کی تھی لباس کسی قدر مسلا ہوا تھا لیکن اس کی امارت کی نشاندہی کر رہا تھا اگر اس کے لباس پر سلوٹیں نہ ہوتیں تو مجھے لگتا کہ وہ کسی شادی کے فنکشن پر جا رہی ہے۔ زیورات سے لدی پھندی اس خاتون کی شخصیت میں کچھ خاص بات تھی۔ میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا میک اپ پھیکا پڑ رہا تھا لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کر کے آئی ہے۔ اسے دیکھتے ہی نیلی سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس خاتون نے میرا حال پوچھا اور چند ایک باتیں کرنے کے بعد نیلی کو کھانا تیار کرنے کا کہا۔ یہ ایک خاموش پیغام تھا اب اس کمرے میں نیلی کی موجودگی اسے ناگوار گزر رہی ہوگی۔ نیلی خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی اور خاتون میرے بستر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

جانے کیا بات تھی کہ کئی دن کی کمزوری کا احساس کافی حد تک ختم ہو گیا تھا اب میں اپنے جسم میں توانائی محسوس کر رہا تھا۔ خاتون چند لمحے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ رہی ہے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں تھے۔ جلد ہی ہاں اور ناں کی درمیانی صورت حال سے باہر نکل آئی اور اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جانتی تم کون ہو البتہ میں یہ جانتی ہوں کہ تمہیں یہاں کون چھوڑ کر گیا ہے۔ جب تک یہاں ہو اسے اپنا گھر سمجھ کر رہو۔ تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی البتہ یہاں سے جانے کا مت سوچنا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تمہارے

ارے میں جواب دہ ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ شاہد ملتانی کو کہہ سکیں کہ اس کا مہمان کہیں اور چلا گیا۔''

میں اس خاتون کی جانب ہی متوجہ تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے کھل کر حقیقت سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکی اور پھر کہنے لگی۔

''تم اس وقت لاہور میں ہو شاہد ملتانی انتہائی زخمی حالت میں تمہیں ہمارے غریب خانے پر چھوڑ گیا تھا۔ تمہارا علاج اسی کمرے میں ہوا ہے ہم تمہیں کسی اسپتال لے جانے کی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہوتا۔ کچھ ڈاکٹر یہاں آتے رہے ہیں۔ انہوں نے اسی کمرے کو اسپتال بنا لیا تھا۔ تمہیں گولیاں لگی تھیں لیکن کوئی گولی کسی خطرناک مقام پر نہیں لگی البتہ خون کافی بہہ چکا تھا۔ یہاں تمہیں خون کی بوتلیں لگائی گئیں اور تمہارے جسم سے گولیاں نکالی گئی ہیں۔

''اگر یہاں ڈاکٹر آتے رہے ہیں تو میری موجودگی راز کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ بات باہر نکل چکی ہوگی اور ڈاکٹروں نے بھی تو سوال اٹھائے ہوں گے؟ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے استاد کسی کم عقل طالب علم کو دیکھتا ہے۔

''یہاں آنے والے ڈاکٹر اپنی زبان ہمارے پاس گروی رکھ جاتے ہیں۔ یہاں کی کوئی بات باہر نکلے تو جانے کہاں کہاں زلزلہ آ سکتا ہے۔'' اس نے پر غرور لہجے میں کہا۔

''خیر میں تمہیں تمہارے یہاں گزرے دنوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ تم طویل بے ہوشی میں رہے لیکن ڈاکٹروں کی محنت اور نیلی کی توجہ کی وجہ سے ایک دن تم ہوش میں آ گئے۔ ہم یہ جان کر خوش تھے لیکن پھر ایک اور حادثہ ہو گیا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دم تو لینے دو بتا رہی ہوں۔ ہمارا خیال تھا تم شاہد ملتانی کے ساتھی ہو۔ اس کے کئی زخمی ساتھی یہاں آ کر آرام کر چکے ہیں لیکن تم ان سب سے مختلف ہو تم کسی شدید جذباتی حادثہ کا شکار ہوئے تھے۔ اس کا اثر تمہارے ذہن پر خاصا گہرا تھا۔ تم نے ہوش میں آتے ہی انہی باتوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس وجہ سے تم پر جنون طاری ہونے لگا تم اپنے آپ کو زخمی کر رہے تھے اس لیے ہمیں پھر ڈاکٹر کو بلانا پڑا جس نے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ تمہیں کچھ عرصہ نیند کی حالت میں رکھا جائے تاکہ تمہارے ذہن سے بے چینی اور کرب کا احساس کچھ کم ہو سکے۔ پہلے تمہیں مسلسل بے ہوشی کی حالت میں رکھا گیا لیکن یہ عمل تمہارے لیے انتہائی نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ڈاکٹرز نے بے ہوشی کے درمیان وقفہ شروع کیا جسے آہستہ آہستہ بڑھایا گیا اس سے تم صدمے کے اثر سے باہر نکلنے لگے اور اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ تمہیں مزید بے ہوشی کے عالم میں نہیں رکھا جائے گا۔''

وہ گزشتہ دنوں کا خلاصہ بتا رہی تھی اور میں خاموشی سے سنتا جا رہا تھا اس نے مختصر الفاظ میں اب تک کی صورت حال بتا دی تھی۔ اس سے جہاں میرے ذہن میں اٹھنے والے کئی سوال حل ہو چکے تھے وہیں وہ بہت خوب صورت انداز میں یہ جتلا چکی تھی کہ اب میں یہاں سے باہر جانے کا

نہ سوچوں اسی طرح اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے بے ہوش رکھنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ میں ہوش میں آ کر اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس کا رویہ دیکھتے ہوئے میں نے ذہن میں بار بار آنے والا سوال پوچھ ہی لیا۔

''میں کس جگہ پر ہوں؟'' یہ وہ سوال تھا جس کا جواب دینے کے بجائے نیلی کمرے سے ہی چلی جاتی تھی یا پھر بات کا رخ بدل دیتی تھی۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے ہی میرے اندر سے تجسس سر ابھارنے لگا تھا۔ میرا سوال سن کر خاتون کچھ دیر تذبذب کا شکار نظر آئی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرے خیال میں تمہیں اصل بات بتا دینی چاہیے۔ مجھے معلوم نہیں کہ شاہد ملتانی کو یہ بات پسند آئے گی یا نہیں لیکن یہاں رہو یا چلے جاؤ لیکن سچ تو کھل ہی جانا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن سچ کا تو لباس بھی نہیں ہوتا وہ ہمیشہ ننگا نظر آتا ہے۔ بالکل عیاں اور واضح۔ سچ پر کوئی شال لپیٹنے کی کوشش کریں تو وہ مر جاتا ہے۔ اسے لباس فطرت ہی میں رہنا پسند ہے۔ جھوٹ کئی بہروپ بدلتا ہے لیکن سچ کا صرف ایک ہی روپ ہے۔ میں تم سے جتنا بھی چھپاؤں سچ پر جتنے بھی لباس ٹانگوں یہ اپنی اصل حالت میں تمہارے سامنے آ جائے گا۔''

میں نے بے صبری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے صاف صاف ہی بتا دیں اتنا گھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں جو بھی سچ ہے میں دوستوں میں ہوں یا دشمنوں میں ہوں آپ مجھے سچ بتا دیں میں سچ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔''

میری بات سن کر اس نے لب وا کیے اور کہنے لگی۔

''یہ ہیرا منڈی ہے اور میں شبنم بائی ہوں تم میرے کوٹھے پر ہو۔ یہاں کیا کچھ ہوتا ہے اب وہ سب تم سے مخفی نہیں رہے گا۔ یہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔''

میرے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا ہو۔ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکل کر سیسے کی مانند میرے کانوں میں جا رہے تھے۔ کمالا جٹ تو گھر کی عورتوں کی کمائی کھانے کے خلاف تھا۔ اب یہاں جانے کتنے دن سے طوائفوں کی کمائی پر پل رہا تھا۔ میرے چہرے پر زلزلہ کے آثار دیکھ کر جیسے شبنم بائی نے میرا ذہن پڑھ لیا۔

''تم بے فکر رہو، تمہارے اخراجات کے لیے شاہد ملتانی بھاری رقم دے گیا تھا۔ طوائف تو اپنے بیٹے پر نہیں لٹاتی تو تم پر کیسے اپنی کمائی خرچ کر سکتی ہوں۔''

شبنم بائی سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں ہیرا منڈی میں ہوں۔ مجھے اس طبلے کی آواز کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی جو گزشتہ دنوں میں اکثر سنائی دیتی تھی۔ میں جس کوٹھے پر تھا وہاں مجرا ہوتا تھا شاید جسم فروشی بھی ہوتی ہو کیونکہ اب نوابوں مہاراجوں کا دور نہیں تھا جو ایک ایک ادا پر اتنا نواز دیتے تھے کہ نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو شبنم بائی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ کمرے میں تاریکی کا راج چھانے لگا۔ یہ کمرہ غالباً چاروں اطراف سے گھرا ہوا تھا اس لیے جوں جوں رات بھیگنے لگی توں توں کمرے میں تاریکی گہری ہونے لگی۔ رات کے کسی پہر طبلے کی تھاپ سنائی دینے لگی۔ لائٹ بند ہونے کی وجہ سے کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ مجھے اپنا ہی ہاتھ نظر

ں آ رہا تھا اچانک ذہن میں ایک جھماکا سا ، میں زخمی ہونے کے بعد اندھا نہیں ہوا تھا دھے پن کا احساس شاید اس لیے ہوا تھا کہ جب ں ہوش میں آیا تو وہ رات کا سماں تھا۔ گھپ د میرے میں اندھے پن کا احساس در آیا تھا۔ د میرے کمرے میں طبلے کی مدہم تھاپ سنتے نے جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ کوٹھے کا علم نے کے بعد یہ میری کسی بھی کوٹھے پر پہلی رات ں مجھے معلوم تھا میں ایک طوائف کے کوٹھے پر ں۔ صبح یہ خیال آتے ہی میں زیر لب مسکرانے گا۔ لوگ کوٹھوں پر عیاشی کے لیے آتے ہیں اور ں جانے کتنی راتیں گزارنے کے باوجود پاک امن تھا۔ مجھے اپنی کائنات کے سامنے نظریں نہیں کانی پڑیں گی۔ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا۔ وب صورت خوابوں کی مالا بنتے بنتے وہ شہر سے ے گاؤں تک چلی آئی تھی اور پھر بیگھے ملوں کی ے سے یہ مالا بکھر گئی۔ میرے گھر والوں، دوستوں قتل اور میری یہاں موجودگی تک کی کہانی شاید سے بھی معلوم ہو چکی ہو۔

کائنات نے تو بہت حسین خواب دیکھے تھے۔ ڈیکل کے بعد ایک خوب صورت زندگی ہماری نظر تھی۔ خواب جب ٹوٹتے ہیں تو انسان زندہ رہ کر بھی مر جاتا ہے۔ خدا جانے کائنات اب کیا رہی ہوگی۔ وہ مجھ سے شادی پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن اس وقت میں ڈاکٹر کمال بن رہا تھا۔ کب اب بھی وہ اس شادی پر رضامند ہوتی؟ اب میں ڈاکٹر کمال کی بجائے کمالا ڈکیٹ بننے جا رہا تھا۔

میری اس زندگی کی ابتدا ہی پولیس مقابلے ہوئی تھی۔ کچہری میں قیدیوں پر حملہ، تھانے سے فرار، پولیس مقابلے، سرکاری اہلکاروں کا قتل، بیگھے ملوں کے پالتو غنڈوں کا قتل اور جانے کون کون سے مقدمات مجھ پر درج ہو چکے ہوں گے۔ چند ہی دنوں میں ایک خوب صورت دل کا مالک اور اعلیٰ مستقبل کی ضمانت رکھنے والا کمال مہذب دنیا کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ لوگ میرے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے خوف اور نفرت کا اظہار کرتے ہوں گے۔ پورے ضلع کی پولیس میرے نام سے واقف ہو چکی ہوگی اور ہو سکتا ہے میرے سر پر انعام بھی رکھ دیا ہو۔ حالات کا تجزیہ کرتے کرتے جانے کب میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور تکیے کو بھگونے لگے۔

لوگ صبح آنکھ کھلنے پر تازہ دم ہوتے ہیں لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد بے دم ہو کر گر پڑا ہوں۔ یہ کوئی فلمی کہانی ہوتی تو شاید کامیاب فلم کہلاتی لیکن یہ مجھ پر حقیقی زندگی میں بیتی تھی۔ میں ہی اس کے کرب سے واقف ہوں۔ سارے حسین خواب پل بھر میں جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

دو تین دن میں اسی کمرے تک محدود رہا۔ نیلی پہلے سے بڑھ کر میرا خیال رکھ رہی تھی۔ میں سارا دن گزرے دنوں کے بارے میں سوچتا رہتا۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ اب میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔ پولیس کا فرض معاشرے سے جرائم کا خاتمہ ہے لیکن جانے ہر روز پولیس ہی کتنے جرائم پیشہ افراد پیدا کرتی ہے۔ میں نے اس دو تین دنوں میں اپنا مستقبل سوچا اور ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے پاس ہتھیار اٹھانے کے سوا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ ابھی مجھے بیگھے ملوں سے بدلہ لینا تھا۔ جنہوں نے میرا ہنستا مسکراتا گھر اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ماضی

یاد آتے ہی میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ دل کرتا تھا نتائج سے بے نیاز ہو کر ابھی بیگھے مل کا پورا خاندان گولیوں سے بھون دوں۔

دو تین دن شبنم بائی سے میرا سامنا نہ ہوا اس کی اپنی مصروفیات تھیں۔ نیلی البتہ میرے پاس ہی رہتی تھی۔ تین دن بعد شبنم بائی آئی تو میں نے اس سے براہ راست دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''بائی ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سرکار آپ دو باتیں پوچھیں۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''کیاں میں یہاں ایک قیدی کی حیثیت سے ہوں۔''

''ایسا کس دشمن نے آپ سے کہہ دیا؟'' اس نے فکر مندی کے تمام تاثرات چہرے پر سجاتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''کہا تو کسی نے بھی نہیں لیکن میں جاننا چاہ رہا تھا۔''

''ہرگز نہیں شاہد ملتانی تو آپ کو اپنا بھائی بتا کر گیا ہے۔ آپ مالک ہیں حضور قیدی تو ہم ہیں۔ آپ کے۔'' اس کے لہجے پر طوائفوں کے لہجے کی ملمع کاری ہونے لگی۔

''تو کیا میں یہاں سے باہر جاسکتا ہوں۔''

''جب چاہیں جاسکتے ہیں ہم تو بے دام غلام ہیں سرکار کے۔''

''کچھ دیر وہ یونہی بیٹھی سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

''ایک عرض اس بندی کی بھی سن لیں۔''

میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ ''جی سنادیں حضور۔'' وہ میری شرارت بھانپ گئی اس لیے برا ماننے کی بجائے مسکرا کر کہنے لگی۔

''سرکار آپ جہاں چاہیں جائیں آپ کو کوئی نہیں روکے گا لیکن درخواست ہے کہ اتنا دور نہ جایئے گا کہ بندی کسی عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ شاہد ملتانی کہاں مانے گا کہ آپ اپنی مرضی سے چلے گئے۔ قہر تو ہم پر ہی ٹوٹے گا۔'' میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور کہا۔

''ایسا کریں کسی کو ساتھ کردیں۔ جو مجھے اس علاقے کے بارے میں بتاتا بھی رہے اور مجھ پر نظر بھی رکھ سکے۔''

''آپ پر نظر تو ہم نے رکھی ہے سرکار، کسی اور کو یہ اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ویسے آپ کو علاقے کے بارے میں بتانے کے لیے میں شرفو کو ساتھ کردیتی ہوں۔''

''یہ شرفو کون ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ جب سے میں یہاں آیا تھا کبھی کسی مرد کی آواز تک نہ سنی تھی۔ میرے سامنے بھی بس نیلی اور شبنم بائی ہی آئی تھیں۔ مجھے تو یہ معلوم تھا کہ یہاں مرد تماش بین آتے ہوں گے لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ کوئی مرد بھی اس گھر میں رہتا ہوگا۔ شبنم بائی کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسی کا کنٹرول ہے اور اس گھر میں تماش بینوں کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔

''شرفو ہمارا اپنا ہے دلال سمجھ لیں لیکن اعلیٰ پائے کا دلال ہے جو صرف ہمارے گھرانے کے ساتھ منسلک ہے۔ ہر ایری غیری جگہ دو پیسے کے لیے منہ نہیں مارتا۔'' شبنم نے نخوت سے بتانا شروع کیا۔

''ویسے ہم اسے منیجر کہتے ہیں۔ وہ پروگرامز کی بکنگ کرتا ہے۔ اچھا بندہ ہے تمہیں بور نہیں ہونے دے گا۔'' شبنم بائی نے دو تین بار شرفو کو آواز دی تو ایک دھان پان سا آدمی دانت نکوستا ہوا چلا آیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ کسی بھی صورت بُرا نہیں لگتا تھا۔ تیل میں چپڑے بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک کان میں بالی اور خوشبو میں بسی روئی اڑس رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھ میں مختلف نگوں والی انگوٹھیاں اور کلائی میں سرخ دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے گلے کے بٹن کھلے تھے جبکہ کف چڑھائے ہوئے تھے۔ اس کی شخصیت کی طرح لباس بھی مسلا ہوا تھا۔

''واہ کیا منیجر ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتا تو قیامت ڈھا دیتا۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل آیا۔

''شبنم بائی نے مرے طنز کا برا مانے بنا کہا۔

''اسے معمولی نہ سمجھو یہ ہیرا ہے ہیرا۔ ابھی باہر کھڑے ہو کر آواز لگا دے تو اس بازار کی سبھی نائیکائیں اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے کروڑوں کی بولی لگا دیں۔ بندہ دیکھ کر جان جاتا ہے کہ یہ کتنے کی آسامی ہے۔ اپنے لائق ہو تو پھر پر نہیں مار سکتا۔ گھٹیا درجے کا مزدور ہو تو ادھر بھٹکنے بھی نہیں دیتا۔''

شبنم بائی کی بات سن کر میں نے شرفو کی جانب دیکھا۔ وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اس نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور مصافحہ کیا۔ شبنم بائی نے مختصراً شرفو کو ہدایت کی کہ وہ مجھے اس علاقہ کا دورہ کرا دے اور یہاں کے بارے میں بھی آگاہ کردے۔

شرفو نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو تنگ سی سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ سیڑھیوں کی طرح گلی بھی خاصی تنگ تھی۔ شرفو میرا ہاتھ تھامے مختلف گلیوں میں گھومنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھے مختلف عمارتوں اور لوگوں کے بارے میں بھی بتاتا جارہا تھا۔ وہ جہاں سے گزرتا وہیں کوئی نہ کوئی جان پہچان والا مل جاتا جس پر شرفو سب کچھ بھول کر اس سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا۔ ہم کافی دیر یونہی بے مقصد پھرتے رہے پھر تھک ہار کر ایک گلی کے باہر تھڑے پر بیٹھ گئے۔

میرے ذہن میں اس حوالے سے کئی سوالات اٹھ رہے تھے اس سے پہلے میں متعدد بار لاہور آیا تھا لیکن اس بازار کا رخ کبھی نہ کیا تھا تجسس کے ساتھ ساتھ آئندہ کی منصوبہ بندی کے لیے بھی مجھے یہاں کے بارے میں جاننا تھا۔ یہ طے تھا کہ اب نامعلوم مدت کے لیے مجھے یہیں رہنا تھا کم ازکم شاہد ملتانی کے لوٹنے تک یہی بازار حسن میرا ٹھکانہ اور طوائف کا کوٹھا میری پناہ گاہ تھا۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے تھے۔ بیگھے مل میری موت کے لیے پاگل ہوئے پڑے تھے۔ پولیس الگ میری تلاش میں تھی۔ میں نے دونوں کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ جٹاں والا میں ایک ہی محفوظ ٹھکانہ تھا وہاں سے میں فرار ہو چکا تھا۔ خدا جانے میرے مقابلے اور فرار کے بعد وہاں کیا صورت حال پیش آئی ہو۔ اب یہ بیگھے مل اور میری لڑائی نہ رہی تھی بلکہ کمالے جٹ اور ریاست کی لڑائی بن چکی تھی۔ شاید ہمارے ہاں کی ریاست کے مجرم اسی طرح تیار کیے جاتے ہیں حالانکہ ریاست کے اصل مجرم وہ ہونے چاہئیں تھے جنہوں نے پولیس کی وردی پہن کر بیگھے ملوں کی دلالی کی اور کمال پتر کو کمالا جٹ بنا دیا۔ میں نہتا اور تنہا واپس

جا کر بیک وقت پولیس اور بیگھے مل سے نہیں ٹکرا سکتا تھا۔ طاقت حاصل کرنے تک مجھے یہیں رہنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ مجھے اس بازار اور علاقے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔

میں نے شرفو کی طرف دیکھا اور کہا۔

''شرفو یہ کیسا علاقہ ہے؟'' پہلے تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگا۔ اسے میرے سوال کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہوا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ میرا سوال اس کے پلے نہیں پڑا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

''میرا مطلب ہے یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں۔'' میری وضاحت سن کر اس نے یوں سر ہلایا جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو کہنے لگا۔

''اچھے لوگ رہتے ہیں، طوائفیں بھی اور کنجر بھی۔ کچھ برے لوگ بھی ہیں لیکن وہ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

اس کا جواب سن کر پہلے تو میں ہکا بکا رہ گیا پھر خیال آیا کہ وہ یہیں پلا بڑھا ہے اس نے عمر یہیں گزار دی ہے۔ یہ اس کا علاقہ اور اس کی برادری ہے۔ اس لیے اس کا جواب اس پس منظر میں درست تھا۔

میں نے کہا۔ ''یار مجھے تفصیل سے بتاؤ میں نے تو بس کتابوں میں پڑھا ہے کہ یہاں جسم فروشی ہوتی ہے لیکن یہاں کی تہذیب، کلچر اور رویوں کا معلوم نہیں ہے۔''

شرفو نے گلے میں موجود باسی موتیوں کے ہار کو سونگھا اور کہنے لگا۔

''باؤ جی، یہاں سب ہی جسم نہیں بیچتے۔ کتابوں میں تو آپ نے نوابوں اور طوائفوں کی کہانیاں پڑھی ہونگی پہلے تو لوگ طوائفوں کے ہاں اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے بھیجتے تھے اب ایسا کچھ نہیں ہے بازاری عورتوں نے یہاں کا کلچر ہی بدل دیا ہے۔ اب یہاں کچھ ایسے کوٹھے ہیں جہاں ناچ گانا ہوتا ہے لیکن وہ غزلیں اور کتھک والا زمانہ بھی چلا گیا۔ اب تو انڈین گانوں اور پاکستانی مجروں پر ہی ڈانس ہوتا ہے۔ یہیں سے شادیوں اور فنکشن کی بکنگ ہوتی ہے۔ یہ لوگ جسم فروشی نہیں کرتے لیکن کچھ لڑکیاں فنکشن پر داؤ لگا لیتی ہیں۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہنے لگا۔

''باؤ جی میں فنکشن کی ٹیم لے کر جاؤں تو پورا خیال رکھتا ہوں لیکن کسی کو خود ہی آفر آئی ہو تو وہاں بندہ کیا کرے؟''

''اس کا مطلب ہے اب یہاں باقاعدہ جسم فروشی نہیں ہوتی۔ یہ تو اچھی بات ہے'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ بات بات پر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرنا شاید اس کی عادت تھی۔ اس نے عجیب سے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''جسم فروشی کہاں نہیں ہوتی؟ دنیا بھر میں جسم بیچا جاتا ہے جہاں بھوک ہوگی وہاں جسم بھی بکیں گے۔ یہاں یہ ہوتا ہے کچھ طوائفوں نے تو گانا بجانا بھی بند کر دیا ہے۔ کون اتنے جھنجٹ میں پڑے۔ جو پہلے گلے اور سر کی کمائی کھاتے تھے اب جسم کی کمائی کھا رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں۔''

''یعنی جسم بیچنے والے اب فنکاروں سے زیادہ کمانے لگے ہیں؟'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''نہیں جی، اب نواب تو ہیں نہیں زیادہ تر تو مزدور، رکشہ ڈرائیور اور ملازم پیشہ لوگ ہی ادھر آتے ہیں۔ بعض طوائفیں تو اب ایک وقت کی روٹی کے بدلے بھی خود کو نیلام کر دیتی ہیں۔ اصل میں یہاں بڑا ظلم ہوا ہے۔'' میں چونک گیا۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ یہاں کوئی ظلم ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم اخباروں میں خبر ضرور آتی۔

''کیسا ظلم؟'' میں نے پوچھا۔

''باؤ جی حکومت نے یہاں سختی شروع کر دی تھی تو جن کے پاس کچھ پیسے تھے وہ یہاں سے چلے گئے۔ اب تو یہ لوگ شہر بھر میں پھیل گئے ہیں۔ شہر میں وہ یہ تو نہیں کہتے کہ ان کا تعلق اس بازار سے ہے لیکن آپ نے بھی سنا ہوگا کہ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اب تو شہر کے ہر علاقے میں خفیہ کوٹھے کھل چکے ہیں۔ ہمیں تو یہی کام آتا تھا یہاں تو عزت دار لوگ آتے نہیں تھے شہر میں تو بڑے دولت مند آتے ہیں۔ اب اس شہر کی کئی کوٹھیوں میں طوائفوں نے کوٹھے اور کنجر خانے کھول رکھے ہیں۔ یہاں تو وہی لوگ رہ گئے ہیں جو یا تو کہیں اور جانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے یا پھر وہ ہیں جو خود ہی یہ گھر نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ماؤں نانیوں کے گھر ہیں ایک دم کیسے چھوڑے جاتے ہیں۔ مجھے بھی زرینہ بیگم نے کہا تھا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں آ جاؤں اور نہر والے فارم ہاؤس کا انتظام سنبھالوں۔ پیسے بھی اچھے تھے اور عزت بھی کرتی ہے کہتی تھی وہاں پینٹ کوٹ پہنوں گا اور گاڑی بھی دے گی لیکن خاندانی دلال ہوں۔ باپ داد کا ایک نام ہے۔ منٹو صاحب نے اپنے افسانوں میں میرے دادا کا ذکر کیا ہے۔ بنی بنائی عزت کیسے چھوڑ دوں۔'' اس کے لہجے میں تاسف در آیا اور میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

شرفو کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ الگ ہی دنیا ہے ہمارے ہاں انہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہیں جس طرح شرفو کو اپنے خاندانی دلال ہونے پر فخر تھا اسی طرح شبنم بائی کو بھی اپنے خاندانی طوائف ہونے پر فخر ہوگا۔ شرفو پر یاسیت کا دورہ پڑ چکا تھا۔ غالباً اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر وہ ''خاندانی عزت'' پر لعنت بھیج کر کسی فارم ہاؤس کی دلالی شروع کر دیتا تو کہیں زیادہ پیسے کما لیتا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا میرے ساتھ ساتھ شرفو بھی اٹھ گیا۔ ہم واپس شبنم بائی کے کوٹھے کی جانب آ رہے تھے کہ سامنے سے دو ہیجڑے آتے نظر آئے۔ میں نے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے شرفو سے کہا۔

''یار، یہاں عورتیں اور لڑکیاں موجود ہیں پھر بھی اس بازار میں ہیجڑوں کا کیا کام یہاں تو کوئی شادی کا فنکشن بک کروانے آئے تو اسے بھی سستے داموں کوئی نہ کوئی لڑکی مل ہی جائے گی۔''

میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔

''باؤ جی وہ کہتے ہیں کہ شوق اپنا اپنا ویسے یہاں تو پورے شہر میں سب سے زیادہ ہیجڑے رہتے ہیں اب تو یوں سمجھ لو کہ بازار حسن انہی ہیجڑوں نے آباد کر رکھا ہے۔''

مجھے اس گفتگو میں دلچسپی ہونے لگی۔ معلومات کا ایک جہاں میرے سامنے کھل رہا تھا۔ یہ معلومات شاید کسی تعلیمی امتحان میں میرے کام نہیں آتی تھی۔ فقط یہی معلومات کیا؟ اب تو شاید کوئی بھی معلومات کسی بھی کتاب یا اخبار میں ہو میرے لیے امتحانی نقطہ نظر سے بے کار تھی۔

پورے ضلع کی پولیس کا دشمن بھلا کسی امتحان میں کیسے بیٹھ سکتا تھا؟ اب زندگی ہی میرا امتحان لے رہی تھی۔ زندگی کے امتحان میں یہ معلومات میرے بہت کام آسکتی تھیں۔

میں نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے شرفو سے ہیجڑوں کا پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''باؤ جی یہاں تو سیکڑوں ہیجڑے رہتے ہیں۔ اب بازار حسن اور طوائفوں کی کہانی تو بس نام کی حد تک ہے ورنہ یہ اصل ٹھکانہ تو ہیجڑوں کا ہی ہے۔ سیکڑوں ہیجڑے ہیں کچھ الگ تھلگ اور کچھ خاندان بنا کر کچھ مانگ کر گزارا کرتے ہیں کچھ گا بجا کر تو کچھ نے الگ ہی روزگار شروع کر رکھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ ان ہیجڑوں کو بھی اسی محلّہ میں پناہ ملتی ہے۔ شریفوں کے محلے میں تو کوئی انہیں دو دن بھی سکون سے نہ رہنے دے۔''

گفتگو کرتے کرتے ہم شبنم بائی کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ یہ کوئی عالی شان بنگلہ نہیں تھا بلکہ ڈھائی مرلہ کا تین منزلہ مکان تھا۔ اندر داخل ہوئے تو جیسے ماحول ہی بدلا بدلا سا تھا۔ شبنم بائی اور اس کی بیٹیاں سر پر دوپٹا اوڑھے گھر چمکانے میں مصروف تھیں۔ شرفو نے اس اچانک تبدیلی کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا پیر صاحب آنے والے ہیں۔

مجھ پر آج حیرتوں کے در وا ہو رہے تھے۔ کیا طوائفیں بھی پیری مریدی پر یقین رکھتی ہیں۔ اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ کیا کوئی پیر صاحب اپنی مریدنیوں کے لیے اس بازار اور کوٹھے پر بھی آتے ہیں۔ کمرے تک شرفو میرے ساتھ ہی چلا آیا۔ میں نے ذہن میں اٹھنے والے سوال اس کے سامنے رکھ دیے۔ میرے سوال سن کر شرفو کچھ دیر تو ہنستا رہا پھر کہنے لگا۔

''باؤ جی کیا طوائفیں مسلمان نہیں ہوتیں۔ انہیں مسئلہ مسائل نہیں ہوتے۔ یہاں تو پیری مریدی پر بہت اعتقاد ہے پیر صاحب کی دعا اور اجازت سے ہی کوئی لڑکی دھندے میں پاؤں رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے ناکامی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس شام ''پیر صاحب'' شبنم کے گھر ہی رکے اور شبنم نے اپنی سہیلیوں کو بھی بلا رکھا تھا۔ رات بھر گانا بجانا چلتا رہا پیر صاحب مخمور آنکھوں سے نوخیز کلیوں کا دیدار کرتے رہے اور سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ نشے میں سر پر رکھا ہاتھ شانے پر اور اس سے بھی نیچے بھٹکتا رہا جسے اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ صبح سورج نکلنے تک یہ طوفان بدتمیزی جاری رہا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے جتنا جاننا تھا جان لیا اب یہاں سے نکلنا ضرور تھا ورنہ ڈر تھا کہ میں بھی اسی رنگ میں نہ رنگا جاؤں۔ یہ اور ہی دنیا تھی یہاں کی شرافت اور ایمانداری میں بھی بے حیائی اور ہوس نظر آتی تھی۔ یہاں پیر کا ہاتھ کندھے سے نیچے بھٹکنا برکت کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ یہ میری منزل نہیں تھی۔ منزل تو دور کی بات یہ میرا عارضی ٹھکانہ بھی نہ تھا۔

پیر جلال شاہ کے شبنم بائی کے کوٹھے پر آنے کے بعد جیسے میں کسی خواب سے جاگ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں اس ماحول اس کلچر اور اس دنیا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میرے لاشعور میں کہیں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اب مجھے طویل عرصہ یہاں رہنا ہے۔ یہ کوئی مجبوری تھی یا بے بسی تھی کہ میں ہتھیار ڈال چکا تھا۔ شاید یہی شکست کی پہلی علامت ہوتی ہے کہ ہم ماضی بھولنے لگتے ہیں۔ ماضی ہمارا دامن چھوڑ دے تو انتقام کی آگ سرد پڑ جاتی ہے یہی

ب میرے ساتھ ہوا تھا۔ ہیرا منڈی کا ماحول مجھ اثر کرنے لگا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن سچ تو یہی تھا کہ میں بہت کچھ بھول گیا تھا۔ بل کھاتی زلفوں کے جال میں الجھنے والے انتقام لینے کے اہل نہیں رہتے یہ تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے۔ میں بھی کسی کی لفوں کا شکار ہونے لگا تھا۔

ایک ہفتے تک میں اپنے عارضی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ میں نے اس سارے عرصہ میں بہت کچھ سوچا۔ اکیلا آدمی بھلا کتنا سوچ سکتا ہے؟ اس سے بھی کہیں زیادہ میں نے سوچا۔ میں نے ماضی کے تمام واقعات دہرائے۔ کائنات سے محبت، اپنی تعلیم، گاؤں کا مچھلی فارم، بیگھے مل اور پولیس کی بے غیرتی، مجھے سبھی کچھ یاد آنے لگا۔ بھولا تو میں پہلے بھی نہیں تھا لیکن اب سارے واقعات تازہ ہونے لگے تھے۔ اس ساری کہانی میں بازار حسن کا بس اتنا سا تعلق تھا کہ مجھے زخمی حالت میں پولیس سے بچا کر اس بازار لایا گیا۔ اب میں جس جال میں پھنس رہا تھا وہ مجھے کسی اور ہی جانب دھکیل رہا تھا۔

میں طویل عرصہ تک یہاں رہنے نہیں آیا تھا، بیگھے مل ابھی بھی دھرتی کا بوجھ بنا پھر رہا تھا' میرا گھر اجڑ چکا تھا' اب ظلم کو روکنا ہی نہیں بلکہ ختم بھی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے یہاں رہ کر اسی مشن کی پلاننگ کرنی تھی' اس بازار میں طوائف رہے یا ہیجڑے رہیں اس بارے میں کھوجنا اپنا رستہ کھوٹا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

مجھ پر یاسیت کا دورہ پڑ گیا' میں اتنے دن سے کن خرافات میں گم تھا؟ طوائفیں پیروں کا دامن تھامیں یا ایسے پیر نوخیز طوائفوں کے بدن پر ہاتھ پھیریں' یہ مسئلہ نہیں تھا' یہ ان کے پرانے چلن تھے' میں ان پر کیوں کڑھتا رہوں؟ جٹاں والا میں بدلہ خاندانی غیرت کی نشانی تھی میں پڑھ لکھ گیا تھا' میرے والد نے مجھے گاؤں کے جھگڑوں سے دور رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کمالا پتر ان فضول کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے جب تک ان کا سایہ ہمارے سروں پر رہا میں کسی اہم لڑائی کا حصہ نہ بنا۔ لڑائی تو دور کی بات ہے مجھے تو گاؤں کے کئی جھگڑوں کی تفصیل تک نہ پتا تھی لیکن اب صورت حال بدل گی تھی' اب کمالے جٹ کا باپ قتل ہوا تھا' اب بدلا گاؤں کی روایت قائم رکھنے یا شملہ سیدھا رکھنے کے لیے نہیں لیا جاتا تھا۔ اب ایک بیٹے نے خود کو حلالی ثابت کرنا تھا' جب بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ لینے گھر سے نکل آئیں تو پھر نہ انہیں کوئی روایت روک پاتی ہے اور نہ ہی کتابوں میں لکھا قانون ان کے درمیان رکاوٹ بنتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہ انتقامی جذبہ ہے لیکن آپ لکھ لیں یہ انتقامی نہیں فطری جذبہ ہے۔ باپ کے قتل کے بعد زمین پر گرنے والا خون پہلے کی رگوں میں لوٹ آتا ہے پھر یہ خون خود اپنا حساب چکتا کرتا ہے' مجھے یہ فرض نبھانا تھا یہ فرض سے زیادہ قرض ہوتا ہے۔ بیگھے مل اور اس کے پالتو کتوں کی موت میرے ہاتھ لکی جا چکی تھی۔

میں حال میں لوٹ آیا' میرے اردگرد گانے بجانے کے آلات رکھے گئے تھے' باپ کے قتل کا بدلہ لینے کی نیت سے گھر چھوڑنے والا کمالا جٹ طوائفوں کے کوٹھے پر چھپا بیٹھا تھا۔ بیگھے ملوں کو خبر ہوتی تو وہ دشمن ہونے کے باوجود میرے خون پر شک کرتے۔ اس کے ڈیرے پر میرا نام لے لے کر قہقہے لگائے جا رہے ہوں گے۔ میں نے سامنے دیوار پر لگے آئینے کی جانب دیکھا اک پل

کو یوں محسوس ہوا جیسے آئینہ بھی مجھ پر ہنس رہا ہے' میرا بھرم' میرا لباس سب اتر گیا۔ ملمع کاری کا اثر جانے لگے تو سونا بھی پیتل ہو جاتا ہے' میں بھی سونے سے پیتل بن رہا تھا۔

''اب اس کوٹھے سے جان چھڑانا ضروری ہوگیا ہے' یہ مجھے میرے مشن سے دور کررہا ہے۔ کمالا جٹ سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن اپنے باپ کا قتل نہ تو بھول سکتا تھا اور نہ ہی معاف کرسکتا تھا۔ اب میں نے سنجیدگی سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

میرے ذہن میں خاکہ ترتیب پارہا تھا شاید ملتانی جانے کب آئے اس کا کوئی وقت مقرر نہ تھا' میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے ہر صورت اس رنگین جال سے نکلنا تھا میں نے اس طرف پڑی کاپی اور بال پوائنٹ کی جانب دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا پھر اس کاپی سے ایک ورق پھاڑا' میں ایک ایسی فہرست تیار کرنا چاہتا تھا جن کی مجھے یہاں سے فرار کے بعد ضرورت پڑنے والی تھی۔ بال پوائنٹ ہاتھ میں تھامے کچھ دیر یونہی سوچنے کے بعد میں نے وہ ورق پھاڑ دیا۔ میں کوئی اپنی نشانی یا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جو بعد میں میرے فرار کی گواہی بنے۔ مجھے یہ فہرست اپنے ذہن میں ترتیب دینی تھی۔ اس سلسلے میں رقم اور مکان سب سے بڑا مسئلہ تھا میں نے یہ کوٹھا چھوڑنا تھا تو اسی وقت مجھے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت پیش آنی تھی' میرے یوں جانے سے شاید ملتانی اور شبنم کے درمیان بھی جھگڑا ہوسکتا تھا۔ یہ لڑائی بڑھ جاتی تو اس نے جانے کتنوں کی جان لے لینی تھی' اس سارے سلسلے میں مجھے شبنم بائی کے لوگ پاگلوں کی طرح تلاش کرتے رہتے۔ میری تلاش میں سب سے پہلے ہوٹل ہی چیک کیے جانے تھے' مردہ خانوں اور اسپتالوں میں مجھے کھوجا جانا تھا' ان میں ناکامی کے بعد یا تو بازار حسن میں صف اول کی طوائف کا راج قائم ہونا تھا یا پھر پہلے کی طرح شاہد ملتانی اور اس قبیل کے لوگوں نے اپنی گرفت مضبوط کرلینی تھی' اس کے لیے شبنم بائی کو سزا دینا شاہد ملتانی کے لیے بہت ضروری ہوجاتا۔ اپنا نام رکھنے کے لیے وہ شبنم بائی کو قتل بھی کرسکتا تھا۔ اس دوران اگر میرے پاس کوئی ایسا ٹھکانہ نہ ہوتا تو میں بے موت مارا جاتا۔ شبنم بائی نے اپنی آنکھیں شہر بھر میں پھیلا رکھی تھیں پھر ان آنکھوں کا کام صرف کمالے جٹ کی تلاش رہ جاتا۔

ٹھکانے اور رقم کے لیے فی الحال میرے پاس نہ تو کچھ تھا اور نہ ہی کوئی راستہ سجھائی دے رہا تھا۔ لاہور جیسے تیز رفتار شہر میں بنا پیسوں کے رہنا اتنا بھی مشکل نہیں۔ جن لوگوں نے پچھلے رابطے ختم کردیئے ہوں اور صرف زندہ رہنے کے لیے اس شہر کا رخ کریں ان کے لیے زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ داتا کی نگری ہے' یہاں بھوکا مرنا آسان نہیں۔ بازار حسن کے پاس ہی ایسے سیکڑوں لوگ رہتے ہیں جن کی جیب میں ایک روپیہ نہیں لیکن پھر بھی جئے جارہے ہیں۔ یہاں داتا کی خاص رحمت ہوتی ہے۔ یہ شہر جتنا ظالم ہے اتنا ہی مہربان بھی ہے۔ امیر شخص یہاں جتنا بھی اکڑ کر چلے اسے کوئی نہ کوئی سوا سیر مل جاتا ہے۔ غریب جتنا بھی لاچار کیوں نہ ہو یہ شہر اسے بھوکا نہیں سونے دیتا' خالی جیب اور پھٹے لباس کے ساتھ اس شہر آنے والے پہلے ہی دن زردہ پلاؤ سے پیٹ بھرتے ہیں' داتا دربار میں چوبیس گھنٹے لنگر چلتا ہے' دربار کے احاطے میں تو لنگر ہے ہی لیکن داتا کے دیوانے باہر سڑک پر بھی دیگوں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو دن بھر دربار کے احاطے میں رہتے ہیں' رات دربار میں نہ سہی سامنے فٹ پاتھ پر اور گراؤنڈ میں سوجاتے ہیں انہیں نہ فکر معاش ہے اور نہ کوئی کام آتا ہے پھر بھی اس یقین کے ساتھ سوتے ہیں کہ صبح اٹھ کر بہترین کھانا نصیب ہوجائے گا۔

میرا مسئلہ صرف پیٹ بھرنا نہیں تھا ایسا ہوتا تو میں کب کا اٹھ کر چلا گیا ہوتا' داتا کا دربار چند منٹوں کی مسافت پر تھا' اکیلے بندے کا سونا کیا اور جاگنا کیا' میں وہاں چھپ سکتا تھا' پیٹ بھر کر کھا سکتا تھا لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔ کمالے جٹ کے ہمراہ اس کے باپ کی روح بھی تھی جو انتقام انتقام کی صدا لگا رہی تھی۔ میرے دوست میرے ہاتھوں میں دم توڑتے گئے اور میں ان کا بدلہ لینے کے لیے زندہ بچ گیا تھا' اب میری باری تھی مجھے یا تو جان دینی تھی یا پھر لینی تھی۔ میں دونوں حالات کے لیے تیار تھا لیکن اندھی موت نہیں مرنا چاہتا تھا ایک بار میں اپنا بدلہ لے لیتا اس کے بعد مارا بھی جاتا تو کوئی غم نہ ہوتا۔

بدلہ اور انتقام کسی طوائف کے کوٹھے پر چھپ کر نہیں لیا جاتا' عورتوں کے پلو سے لپٹنے والے میدان مارنے کے لیے نہیں ہوتے۔ میدان کا دھنی وہی ٹھہرتا ہے جو ناگن جیسی زلفوں کے شکنجے سے بچنا جانتا ہو۔ جسے ہرنی سی آنکھوں میں بھی اپنے دشمن کا چہرہ نظر آئے جسے ہونٹوں کی لالی میں بھی خون کا رنگ نظر آئے جسے کاجل میں ماتمی رنگ چھلکتا محسوس ہوا اور جسے ٹھنڈی ہواؤں سے قبرستان کے درختوں کی سرسراہٹ ملے۔ انتقام لینے والے ایسے ہی ہوتے ہیں' طوائف کا کوٹھا' گھنگھروؤں کی جھنکار' زلفوں کی مہکار' ہونٹوں کی لالی اور آنکھوں کا کاجل تو انتقام کی آگ کو سرد کرنے کے لیے ہوتے ہیں جو شخص ان کے چنگل میں پھنس جائے اس کے لیے انتقام بے معانی ہوجاتا ہے پھر وہ لڑتا ہے تو صرف اپنی محبوب طوائف کی خاطر لڑتا ہے۔ اس کا انتقام ذاتی نہیں رہتا' وہ کرایہ کے قاتل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ پھر وہ طوائف کا بدلہ لیتا ہے اور اسے اس کا معاوضہ جنس کی صورت مل جاتا ہے۔ کرایہ کا قاتل بھی بھلا انتقام لیتا ہے؟ ایسے لوگ جس مردانگی کا دعویٰ کرتے ہیں اس کا مول طوائف کے جسم کی صورت لگا چکے ہوتے ہیں' بکا ہوا انتقام تو کلنک کا دھبہ ہوتا ہے۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں زیادہ دیر شبنم بائی کے کوٹھے پر رہا تو میرا حال بھی ان جوانوں جیسا ہوجائے گا جو چوسی ہوئی گنڈیری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے' نچڑے ہوئے لوگوں کا انتقام کہاں یاد رہتا ہے۔ شرفو سے میں ایسی کئی کہانیاں سن چکا تھا جن میں کئی جاگیردار اس بازار آئے اور پھر سب کچھ لٹا کر اپنی ہی محبوب طوائف کے دلال بن گئے۔ ان کے لیے یہی کافی ہوگیا کہ ان کی منزل نے انہیں اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی' وہ اپنی محبوب طوائف کو ناچتے دیکھ سکتے تھے چاہے وہ کسی اور کے لیے ہی کیوں نہ ناچ رہی ہو۔

یہ لوگ اپنے گاؤں کے چوہدری ہوا کرتے تھے' ان کی وفا شعار بیوی اور بچے بھی تھے۔ یہ اسی دنیا کے باسی تھے کئی مربع زمین' نوکر چاکر اور جانوران کی پہچان تھے۔ اسی دولت کے نشے میں انہوں نے بازار حسن کا رخ کیا جب تک ان کی جیب میں رقم رہی تب تک ان کی محبوبہ انہی کی تھی'

پیار محبت کے وعدے بھی ہوئے اور ناز نخرے بھی اٹھائے گئے' ان نوابوں کا خیال تھا انہوں نے دولت کا دروازہ کھول کر جس بازار میں قدم رکھا وہاں اب ان کی وجاہت بہادری یا نام کی وجہ سے الگ درجہ مل چکا ہے وہ جس طوائف کی زلفوں اور اداؤں کے اسیر ہوئے وہ بھی ان پر فدا ہو چکی ہے۔ بازار حسن آنے والوں کی اکثریت اسی خوش فہمی کا شکار ہو جاتی ہے' اس خوش فہمی کو ہوا شبنم بائی نائیکہ ہی دیتی ہے اور پھر جب ان جاگیرداروں کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچتی تو یہی نائیکہ ان پر اپنے دروازے بند کر دیتی ہے۔

یہی طوائفیں انہیں بتاتی ہیں کہ ان سے پہلے وہ کن کن جاگیرداروں کے پہلو گرم کرتی رہیں اور کون کون سا نواب ان کے در سے کنگال ہو کر نکلا تھا۔ اپنے عاشقوں کی طویل فہرست گنوانے کے بعد یہ بتاتی ہیں کہ اس بازار حسن کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ وفا اور پاکبازی کی تلاش تھی تو اس گلی کیا لینے آئے تھے؟ وفا پرست تو شوہر کا گھر آباد کرتی ہیں۔ روحانی حسن وہیں ملتا ہے جسے چھوڑ کر یہ جاگیردار اس بدنام زمانہ علاقے کا رخ کرتے ہیں یہاں تو ظاہری چمک دمک ہوتی ہے' چند روز پانی لگتا ہے تو رنگ اترنے لگتا ہے پھر معلوم ہوتا ہے کہ جس چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر لپکے تھے وہ پیتل نکلا۔

اس کے بعد ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے جس کے پاس تھوڑی سی عزت اور عقل بچی ہو وہ تھکے ہارے جواری کی طرح مرجھائے تنگ اور اندھیری سیڑھیاں اترتا ہے اور خاموشی سے کبھی نہ آنے کے لیے لوٹ جاتا ہے' البتہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری کشتیاں جلا چکے ہوتے ہیں۔ جیب کے ساتھ دماغ بھی خالی کروا چکے ہوتے ہیں ان کے لیے ذلت بھری زندگی اور نام نہاد محبوب کی ایک جھلک ہی کافی ہوتی ہے' یہ منتیں کرتے ہیں تو نائیکہ انہیں اپنے تلوے چاٹنے کا حکم دیتی ہے' ان کی انا اور خاندانی وقار دم توڑ دیتا ہے اور پھر یہ اسی بازار میں اسی طوائف کے دلال بن جاتے ہیں جس پر کبھی اپنی جاگیریں لٹایا کرتے تھے' اس بازار میں آ کر ہی مجھے معلوم ہوا کہ طوائفوں کے ہاں معزز گھروں کی لڑکیاں ہی جنم نہیں لیتیں بلکہ معزز گھروں کے سربراہ بھی اسی بازار میں دلالی کرتے ہیں۔

سنی سنائی کہانیاں اتنی مضبوط ہوتیں کہ ان پر عن و من یقین کر لیا جائے۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے اس بازار میں بہت کچھ سنا تھا یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اکثر کہانیاں فرضی اور جھوٹ پر بنی تھیں۔ یہاں کے جو منظر کھینچے جاتے ہیں ان میں سے 95 فیصد درست نہیں ہیں یہاں نہ تو محبت کی نہریں چلتی ہیں اور نہ ہی حسن کے دریا بہتے ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں' جا بجا بکھرا ہوا کوڑا کرکٹ اور تیل سے چپڑے بالوں والے زندگی سے تنگ آئے دلال اس بازار کی پہچان بن گئے ہیں۔ البتہ شروع میں روایات کو زندہ رکھنے کے لیے آلات موسیقی کی مرمت اور تلوے والے کھسے کی دکانیں موجود ہیں' میں سنی سنائی کہانیوں پر یقین نہیں کرتا لیکن ایک تو میں خود اس بازار کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا' دوسرا شرفو دلال نے بھی بہت سی داستانیں سنا دی تھیں۔ اس کی کہانیوں میں کئی انتظامی افسروں' نیک ناموں اور اعلیٰ شخصیات کے نام شامل تھے جنہیں فتنہ فساد کے ڈر سے شائع نہیں کر رہا۔ یہ نام جس دن سامنے آ گئے اس دن ملک بھر میں طوفان اٹھ جائے۔

ایک بار اسلام آباد کی ایک نائیکہ نے کسی بات پر غصہ میں آ کر اعلان کیا تھا کہ اس کے پاس اپنے گاہکوں کی مکمل تفصیل موجود ہے کہ کون کب آیا اور کس لڑکی کے ساتھ وقت گزارا۔ اس نائیکہ نے اس ریکارڈ کو کتابی شکل میں شائع کروانے کا اعلان کیا تو مقدس ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ ایک رکن اسمبلی نے یہاں تک کہا کہ اسے روکا جائے ورنہ اسمبلی میں بیٹھے معزز اراکین میں سے 90 فیصد سے زیادہ کو طلاقیں ہو جائیں گی۔ وہ کتاب شائع ہو سکی کیونکہ چھپنے سے پہلے ہی اس کی بولی لگنے لگی تھی' دولت مند با اثر لوگ نوٹوں سے بھری بوریاں لے کر آتے اور اصل مسودے میں سے اپنے نام کا صفحہ خرید کر لے جاتے تھے۔ خریدا گیا صفحہ کتاب سے نکال دیا جاتا تھا اور پھر کتاب کے مسودہ میں جلد کے سوا کچھ نہ بچا' لوگ منہ مانگے دام دے کر اپنا اپنا صفحہ لے گئے اور شہر بھر سے نیک ناموں اور معزز افراد سے بچ گیا۔ یہ وہ معزز لوگ تھے جنہوں نے اپنا گناہ نامہ خرید کر آگ میں جھونک دیا تھا' ریکارڈ جلنے کے بعد انہوں نے دوبارہ تسبیح سنبھالی اور زیر لب کرسی کرسی کا ورد کرنے لگے۔ یہ لوگ آج بھی اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

طوائفوں کی اس دنیا میں جتنی عجیب کہانیاں بکھری ہوئی ہیں اس سے کہیں عجیب سوچ بھی پل رہی ہے' یہاں پیدا ہونے والے بچے کے ذہن میں غیرت اور عزت کا تصور مختلف ہوتا ہے' شرفا کی بستی میں غیرت کا مطلب گھر کی خواتین کی عزت عصمت کی حفاظت ہے۔ ہمارے ہاں عزت کی علامت بہن بیٹیوں کے سر پر چادر کو سمجھا جاتا ہے۔ طوائف زادے کی عزت اس میں ہوتی ہے کہ اس کی بہن دوسروں سے زیادہ خوب صورت ہے اور اس کے گاہک دوسری لڑکیوں کے گاہک سے زیادہ امیر اور با اثر ہیں۔ اسی نسبت سے بازار حسن میں عزت اور رتبہ کا معیار قائم کیا جاتا ہے' بڑی طوائف کے بھائی اور دلال کی دوسروں سے زیادہ عزت ہوتی ہے جبکہ نچلے درجے کی طوائف کے بھائی اور دلال انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ چونکہ ان کی بہن کم خوب صورت ہے اور اس کے عاشق زیادہ امیر نہیں لہٰذا بازار میں ان کی کوئی عزت نہیں ہے۔

میں چند دنوں میں ہی یہاں کا مزاج بھانپنے لگا تھا' یہ یحییٰ خان کی داستان تھا' یحییٰ خان پاکستان فتح کرنے والے آمروں میں سے ایک تھا۔ شراب اور کباب اس کی خاص پہچان بنے' اسی لیے اس کے اردگرد بھی طوائفیں جمع ہونے لگیں اور وہ پاکستان کو بھول کر انہی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اسی یحییٰ خان کی ایک نک چڑھی طوائف کے شوہر سے ایک محفل میں کسی نے پوچھ لیا کہ دنیا بھر کو معلوم ہے کہ تمہاری بیوی ہر وقت یحییٰ خان کا پہلو گرم کرتی رہتی ہے' کیا کبھی تمہاری غیرت نہیں جاگی؟ اس طوائف کے شوہر نے جو جواب دیا وہ تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا تھا اس شخص نے بھری محفل میں کہا۔ ''یہ تو اپنے اپنے سوچنے کا اندازہ ہے' آپ کو لگتا ہے کہ میری بیوی یحییٰ خان کے پاس ہوتی ہے جبکہ میں یہ سوچ لیتا ہوں کہ بیوی تو وہ یحییٰ خان کی ہے بس کبھی کبھار میرا داؤ لگ جاتا ہے۔''

ماضی میں یہ واقعہ پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسی بات کیسے کر سکتا ہے' بات کرنا تو دور ایسی گھٹیا بات تو

سوچنا بھی محال ہے لیکن اب اسی بازار سے واسطہ پڑا تو اندازہ ہوا کہ یہاں اس سے بھی کہیں گھٹیا سوچ پائی جاتی ہے۔ یہاں شوہر اور بھائی کمائی پر پلتے ہیں اور اپنی زبان میں عیش کرتے ہیں۔ کچی شراب پی کر ایک دوسرے سے لڑنا‘ جوا کھیلنا‘ تاش کی بازیاں لگانا اور کبوتر یا تیتر پالنا ان کی عادت بن چکی ہے اس کے علاوہ پان کھانا اور قمیص کے بٹن کھول کر گلی میں اکڑتے ہوئے چلنا یہاں کے مردوں کا انداز تھا۔ وہ کس کے بل پر اکڑتے تھے اس کا اندازہ آپ کو بھی ہو چکا ہوگا۔

میں اب یہاں کا مزاج سمجھنے لگا تھا یہاں سوچ کا دھارا الٹے رخ پر تھا۔ میں چند دنوں میں جتنا اس علاقے کے بارے میں جانتا جا رہا تھا اتنا ہی خوفزدہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں کئی غیرت مند پہلے کاٹھ کے الو بنے اور پھر دلال بن گئے‘ کئی صحافی یہاں سے ہارمونیم سیکھ کر گئے ہیں شرفا کے معاشرے میں وہ گھر کے دروازے بند کر کے آج بھی ہارمونیم پر ریاض کرتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے پھنے خان آئے اور پھر پگڑی طوائف کے قدموں میں رکھ کر دلال بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت بہت بڑا امتحان ہے اس امتحان میں سرخرو ہو جائے اس کے ولی ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ ہم جیسے گناہ گاروں کا تو اس لیے بھی بھرم قائم ہے کہ ہمیں ایسے مواقع ہی نہیں ملتے‘ ہم اس لیے پارس ہیں کہ ہمیں گناہ کی دلدل میں اترنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اعصاب کا مالک نہیں سمجھتا اس لیے یہاں سے بھاگنے کا سوچ رہا تھا۔ نیلی کی توجہ یا شبنم کا تجربہ مجھے ان کے جال میں پھنسا سکتا تھا اگر میں اب بھی نہ نکلتا تو پھر یقیناً اسی رنگ میں رنگا جاتا۔ ایک بار یہ رنگ چڑھ جائے تو پھر اس کا اترنا مشکل ہے پھر نہ انسان دنیا کے ساتھ چل پاتا ہے اور نہ دنیا اسے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیتی ہے۔

میں شبنم بائی کے کوٹھے میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں تنہا لیٹا تھا اس بار یاسیت کا شدید دورہ پڑا تھا خود احتسابی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی صورت حال کا بھی اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب کی بار میں اس کوٹھے سے فرار ہو جاؤں گا۔ کچھ پیسے ہوں گے تو ان سے ہتھیار خرید کر بیگھے ملوں سے ان تمام مظالم کا حساب لوں گا جو اس نے مجھ پر ڈھائے ہیں۔ بیگھے ملوں کا خیال آتے ہی گاؤں کی ساری کہانی میرے ذہن میں آنے لگی اور تکیہ بھیگنے لگا۔ میں بے آواز رو رہا تھا اس دوران مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کیا سوچ رہا تھا اور مجھے کیا کرنا ہے‘ یاد تھا تو صرف بیگھے مل تھا جس نے خون کے دریا بہا کر اپنی حکومت کو آواز دے دی تھی‘ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔

دروازے کی جانب سے کھٹکے کی آواز آئی تو میں نے سر اٹھا کر ادھر دیکھنے کی بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ آنے والا جو بھی ہوتا لیکن میں اس وقت کسی کو بھی اپنی سوچوں میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں رو رہا تھا اگر آنکھیں بند نہ کرتا تو آنے والے کو اس بات کی خبر ہو جاتی۔ میں ان لمحوں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ آنے والے کے نزدیک میں اس وقت سو رہا تھا میں نے ادھ کھلی آنکھ سے صورت حال کا جائزہ لیا نیلی خاموشی سے آگے

ہ کر میرے کافی قریب آ گئی اس نے کچھ دیر مجھے دیکھا اور پھر الگ ہو کر کھڑی ہو گئی میں یونہی اس کی حرکات و سکنات نوٹ کر رہا تھا اس نے گلے میں پہنا قیمتی ہار اتارا اور ایک پرانی الماری کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں سو رہا ہوں لیکن یہ یقین ہی اسے مات دے رہا تھا۔ اس نے پیٹی کے اوپر پڑے صندوق کا ڈھکن اٹھایا اور اپنا ہار صندوق میں ڈال دیا وہ زندگی کی بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی کر بیٹھی تھی۔ میں پلکوں کے رخنے سے اسے دیکھ رہا تھا میری جانب سے تسلی کرنے کے بعد اس نے صندوق کا ڈھکن بند کیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

نیلم کے جانے کے بعد کچھ دیر میں یونہی لیٹا رہا‘ میں اپنے ذہن میں مختلف منصوبے تشکیل دے رہا تھا یہ مجرمانہ منصوبے تھے۔ مجھے یہاں سے فرار کے لیے رقم درکار تھی۔ نیلی اپنی غلطی کی وجہ سے مجھے بتا گئی تھی مہنگے ترین زیور کہاں سے ملیں گے‘ یہیں پاس ہی صرافہ بازار تھا میں وہاں اس ہار کو سستے داموں بیچ سکتا تھا مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میرے سامنے اپنے بچاؤ کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے اب یہ ہار ہی چرانا تھا لیکن ڈر بھی لگ رہا تھا کہ اگر عین وقت پر نیلی یا کوئی اور اس جانب آ گیا تو جانے مجھ پر کون کون سے الزامات لگ جائیں۔

آخر کار ہاں اور نہیں کی درمیانی کیفیت سے چھٹکارا پاتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا یہاں سے نکلنے کے لیے مجھے یہ گناہ کرنا ہی تھا۔ مجھے اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا میرے سامنے بیگھے مل کھڑا قہقہے لگا رہا تھا میری اپنی روح مجھ پر طنز کر رہی تھی کہ انتقام کے لیے گھر سے نکلا کملا جٹ طوائف کے کوٹھے پر چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ان سوچوں کو پرے جھٹکا اور صندوق کی جانب قدم بڑھائے‘ میں بعد میں اس سے زیادہ رقم لوٹا سکتا تھا۔ یہ مجبوری کے تحت کی گئی چوری تھی جسے بعد میں لوٹا دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

صندوق کے پاس پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا‘ کمرہ خالی تھا خدا کے سوا مجھے کوئی نہ دیکھ رہا تھا۔ چارپائی سے صندوق تک یہ چند قدم طے کرنے سے ہی ہانپ رہا تھا اور بدن پسینے سے شرابور تھا یہ میری پہلی چوری تھی صندوق پر قفل نہیں تھا یہ نیلی کی حد سے زیادہ خود اعتمادی تھی‘ لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ یہ صندوق غیر اہم ہے یا پھر اس سے بھول ہو گئی تھی۔ یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا بہرحال مجھ پر قسمت مہربان لگ رہی تھی‘ میں نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ غیر مقفل صندوق کسی بینک کے لاکر سے کم نہیں تھا اس میں زیورات کے ساتھ ساتھ نوٹوں کے بنڈل بھی موجود تھے‘ میں نے جلدی سے سو اور ہزار والے نوٹوں کے دو تین بنڈل اٹھائے اور صندوق بند کر دیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے میں واپس چارپائی پر بیٹھ گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ حواس بحال ہوئے تو خیال آیا کہ نوٹوں کے بنڈل میری گود میں ہی پڑے ہیں‘ شکر ہے ابھی تک کوئی آیا نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے انہیں شلوار کے نیفے میں اڑسا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اب مجھے یہاں سے باہر نکلنا تھا اس سے پہلے نیلی کو احساس ہوتا کہ اس نے صندوق کا تالا نہیں لگایا تھا یا وہ کوئی اور چیز رکھنے آئے اور میری چوری

پکڑی جائے۔ میرے پاس یہاں ایسا کچھ نہ تھا جس کے لیے مجھے پڑتا۔ میں یہاں تن کے لباس اور جسم پر زخموں کے سوا کچھ نہ لایا تھا میں کمرے سے باہر نکل آیا' اتفاق سے میرا سامنا کسی سے نہ ہوا اور میں اس کوٹھے سے باہر نکل آیا۔ میرے پاس آگے کا کوئی لائحہ عمل نہیں تھا کہ اب میں نے کیا کرنا ہے اور کدھر جانا ہے لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے پاس اب اتنی رقم ہے کہ جس سے میں آگے کا راستہ بنا سکتا ہوں' میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا شبنم بائی کے کوٹھے سے دور ہو رہا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ ایک آواز سنائی کہ ''شہزادے اتنی بھی کیا جلدی ہے' کہاں بھاگ رہے ہو؟'' میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

❀......❀......❀

گل ریز خان کی گاڑیوں کو یوں گھیر کر نشانہ بنانا کسی بھرپور پلاننگ کا حصہ تھا یہ ممکن نہ تھا کہ اس کے کسی دشمن نے اچانک اسے آتا دیکھ لیا ہو اور اس قدر بھرپور حملہ کروا دیا اس پہلے حملے سے گل ریز خان کے وفادار بھی نہ سنبھل سکے۔ ہماری گاڑی کے بھی شیشے ٹوٹ چکے تھے اور گاڑی بے قابو ہو چکی تھی اس وقت گل ریز خان کے وفاداروں کی لائن ٹوٹ چکی تھی اور گاڑیاں مختلف سمتوں میں نکل چکی تھیں۔ خود ہماری گاڑی بھی انجانی سمت جارہی تھی۔

گل ریز خان زخمی ہوا تو جیسے میں ہوش میں آ گیا وہ میرا دوست ہی نہیں محسن بھی تھا وہ میری جان بچانے آیا تھا لیکن خود میری وجہ سے اس کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میری چھٹی حس چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ اس حملے کے پیچھے دارا کا ہاتھ تھا' اسی کو مجھ پر خار تھی اور میرے مخالفین میں وہی جانتا تھا کہ ہم کس جانب گئے ہیں اور کس راستے سے گزریں گے۔ گل ریز خان کو گولی لگتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اب مجھے کسی کی پروا نہیں تھی مجھے اپنے محسن پر گولیاں چلانے والوں سے حساب برابر کرنا تھا۔ میں اس علاقے میں دشمنیاں نبھانے ہی تو آیا تھا۔ جہاں اتنے دشمن تھے وہاں کچھ اور بھی بن جاتے تو مجھے کیا فرق پڑنا تھا۔ ویسے بھی حملہ آوروں کو سبق چکھانا ضروری تھا۔

ہم شامل خان کی گاڑی میں تھے میں جانتا تھا کہ یہ گاڑی نہیں بلکہ بارود کا ڈھیر ہے' شامل خان جتنا بااثر سردار تھا اس کی دشمنیاں بھی اتنی ہی وسیع تھیں۔ اس گاڑی میں جس قدر اسلحہ ہوتا تھا وہ سوچ سے بھی باہر ہے۔ شامل خان نے یہ اسلحہ ایک ترتیب سے رکھا ہوا تھا اسے معلوم تھا کہ کس سیٹ کے نیچے راکٹ لانچر ہیں اور کس کے نیچے کلاشنکوف اور پسٹل ہیں۔ یہ بھی وہی جانتا تھا کہ دستی بم اور گولیاں کن کن خانوں میں بھری ہوئی ہیں' مجھے اس ترتیب کا علم نہیں تھا لیکن میں یہ جانتا تھا کہ اس گاڑی میں بیٹھنے والا جس بھی جگہ ہاتھ ڈالے گا اسے مہلک اور جدید اسلحہ اپنے قریب محسوس ہوگا۔ میں اکثر خان کو مذاق میں کہتا تھا کہ تم گاڑی پر نہیں بلکہ اسلحہ پر بیٹھ کر سفر کرتے ہو' وہ اس بات پر فخر کرتا تھا۔ یہ اس کی قبائلی روایات کی ترجمانی کرتا تھا۔

میں نے اپنی سیٹ کے نچلے حصے کو ٹٹولا تو میرے ہاتھ نے لوہے کی مخصوص ٹھنڈک محسوس کرلی میں نے فوراً اسے اپنی جانب کھینچ لیا' خوب صورت جرمن ساختہ پسٹل میرے ہاتھ میں تھا میں

...فٹی کیچ ہٹایا اور قریبی گاڑی کی طرف کر کے ...ل کر دیا۔ یہ گولیاں میں نے اندھا دھند چلائی ...ں مجھے سیفٹی کیچ ہٹاتے وقت معلوم تھا کہ گاڑی ...وجود تمام اسلحہ حفاظتی نقطہ نظر سے رکھا گیا ہے ...ں لیے یہ فل لوڈڈ ہوگا۔ میں نے پہلا میگزین ...ل حملہ آوروں کی گاڑی کو دور رکھنے کے لیے ...ل کیا تھا لیکن مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میری ...لیوں نے کسی کو شکار کر لیا تھا۔ میں نے ایک نظر ...ھلی سیٹوں پر ڈالی آئمہ اور عثمان ایک دوسرے ...لپٹے ہوئے سیٹوں کے درمیان دھنس گئے ... وہ بہت خوفزدہ نظر آ رہے تھے لیکن اس وقت ...ں کا اس طرح سیٹوں کے درمیان دھنسے رہنا ہی ...ں کی زندگی کے لیے بہتر تھا۔ انہیں ایک لفظ کہے ...ا میں نے اسی سیٹ کے نیچے موجود ڈبے میں ...ہ ڈال کر میگزین نکالے اور پھر ساتھ والی سیٹ ...نیچے چیک کیا تو ایک خوب صورت رائفل بھی ...گئی۔ باہر دیکھا تو ایک اور گاڑی ہمارے قریب ...ہی تھی' میں نے اس گاڑی کی جانب رخ ...کے دوبارہ میگزین خالی کر دیا۔ گاڑی ایک ...کے لیے ڈگمگائی لیکن اس بار میری ساری ...لیاں ضائع گئیں۔ اس گاڑی میں سوار کوئی شخص ...انشانہ نہ بن سکا۔

یہ دو طرفہ فائرنگ تھی کون کس پر گولیاں برسا ...ہا تھا اس کا علم نہ ہو پا رہا تھا اس وقت ہر کوئی ...اپنے آپ کو بچا رہا تھا لیکن قبائلی روایات کی وجہ ...سے اپنے دشمن کو بھی فرار ہونے کی اجازت نہیں ...دے رہا تھا۔ پہلے اور اچانک حملے میں گل ریز ...خان کو زیادہ ہوگیا تھا اس کے ساتھی ذہنی طور پر اس حملے کے لیے تیار نہ تھے جبکہ حملہ آور پوری ...تیاری سے آئے تھے' اب گل ریز کے ساتھی بھی سنبھل چکے تھے' بھاگنے والوں کو خیال آیا کہ ان کا سردار دشمن کے گھیرے میں ہے تو وہ تڑپ کر واپس آ گئے تھے۔ کچھ پہلے حملے میں بوکھلا جانے پر شرمندگی اور کچھ یہ احساس کہ سردار کو کچھ ہو گیا تو انہیں نامرد کہا جائے گا کہ وہ کیسے محافظ تھے جن کی موجودگی میں سردار دشمن کا نشانہ بن گیا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ گل ریز خان نے اپنے محافظوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھا تھا وہ ان کا پورا خیال رکھتا تھا۔ وہ حقیقی معانی میں خود کو گل ریز کی اولاد کہتے تھے' اب وہ پلٹے تو قہر کی علامت بن چکے تھے' جس طرح اولاد اپنے باپ کو بچانے کے لیے لڑتی ہے وہ بھی اسی طرح دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔

سب گاڑیاں مختلف سمتوں میں بھاگتی چلی جارہی تھیں اور ہر گاڑی کے سوا کسی نہ کسی کے مقابل تھے کوئی گھیرے میں لینے کی تگ و دو میں تھا کوئی بچ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لگ بھگ سبھی گاڑیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور ان کی باڈی پر گولیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے میں جس گاڑی میں تھا اس کی باڈی پر بھی کئی گولیاں اس جھڑپ کی داستان سنانے کے لیے اپنے نشان چھوڑ چکی تھیں۔ نئی اور مہنگی گاڑیوں کی حالتِ کباڑ خانے میں کھڑی پرانی اور ناکارہ گاڑیوں جیسی ہو چکی تھی لیکن اس وقت گاڑیوں کی جانب کس کا دھیان جاتا؟ یہاں زندگی اور موت کا میدان سج چکا تھا۔ ایک کی موت ہی دوسرے کی زندگی تھی۔

گل ریز خان پر نظر پڑتے ہی میرے اندر کا وحشی پن سمٹنے لگا میرا محسن خون میں لت پت تھا' ابھی تک میں بھی اندھا دھند فائرنگ کرنے والوں میں شامل تھا اور میرا مقصد بھی حملہ آوروں

کو ختم کرنا تھا۔ گل ریز خان کی حالت دیکھ کر میرے ذہن میں بجلی کی مانند خیال آیا کہ اب مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ کمالا جٹ میدان چھوڑ نے والوں میں سے نہیں تھا لیکن مجھے اپنے محسن کو بچانا تھا۔ گل ریز خان بچ جاتا تو میں ان حملہ آوروں کو پاتال سے بھی کھینچ لاتا لیکن اگر میں اس میدان جنگ کا حصہ بنا رہتا اور لڑائی طویل ہو جاتی تو خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے گل ریز خان کی موت ہو سکتی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصہ میں ہی میں نے منصوبہ بندی کی' اب میرا مقصد یہاں سے نکلنا اور دشمن کو تعاقب سے روکنا تھا' میں نے رائفل مضبوطی سے تھامی اور سامنے سے آتی ایک جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنایا' دونوں گاڑیاں تیزی سے بھاگ رہی تھیں ہماری کوئی سمت متعین نہ تھی لیکن کمالا جاٹ نشانہ بازی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں کوئی ہدف نہ تھا لیکن اب ایک ہدف میرے سامنے تھا' میں پوری گاڑی اور اس میں سوار اسلحہ برداروں کو بھول کر صرف گاڑی کے ٹائروں پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ رائفل سے نکلنے والی گولیاں اپنے ہدف کا شکار بن چکی تھیں' جیپ کے ٹائر دھماکے سے پھٹے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی جھولنے لگی اس کا ڈرائیور اسے الٹنے سے بچانے کے لیے اپنی تمام تر مہارت استعمال کر رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگر دو تین جیپوں کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تو حملہ آور بھی میری پلاننگ سمجھ گئے ان کی جانب سے بھی ہماری گاڑی کے ٹائروں پر فائرنگ شروع ہو گئی' اس حملے سے بچنے کے لیے گاڑی کو زگ زیگ چلانا شروع کیا تو رفتار میں بھی کمی آئی۔

میں نے اب دوسرا حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اب میں نے سر اٹھا کر فائر کیا تو ایک گاڑی کا ڈرائیور میرے نشانے پر تھے۔ گولی ڈرائیور کے ماتھے پر لگی اور گاڑی اس کے کنٹرول سے باہر نکل گئی' ڈرائیور کے مرتے ہی وہ گاڑی بُری طرح لہرائی اور زور دار دھماکے سے ایک درخت سے ٹکرانے کے بعد الٹ گئی۔ یہ حملہ گاڑی کے ٹائر کو نشانہ بنانے سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوا' حملہ آوروں کی جانب سے تسلسل فائرنگ کے نتیجے میں ہماری گاڑی بھی لگ بھگ تباہ ہو چکی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کا انجن ابھی تک کام کر رہا تھا اور ہمیں بھگائے لے جا رہا تھا شاید گل ریز خان نے اس حوالے سے خاص توجہ دی ہو یا پھر یہ قدرت کی طرف سے ہماری کوئی مدد تھی کہ ابھی تک انجن اور ٹائروں کو ایسا نقصان نہیں پہنچا تھا جس کی وجہ سے گاڑی بند ہوتی۔ البتہ انجن سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں اور پوری گاڑی ٹین کے ڈبے کی طرح کھڑ کھڑا رہی تھی' دو تین جیپیں مزید میری گولیوں کا نشانہ بن گئیں اور ان کے ڈرائیور بھی مرتے مرتے اپنے ساتھیوں کو لے ڈوبے۔ اب ہم حملہ آوروں کے گھیرے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی' پیچھے گولیاں برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں' یہ گولیاں گل ریز خان کے ساتھی چلا رہے تھے یا حملہ آور مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میرے لیے اتنا کافی تھا کہ ہم حملہ آوروں کی گولیوں کی رینج سے باہر آ چکے تھے اب گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب تھا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کافی فاصلے پر جیپیں آتی نظر آئیں۔ یہ گل ریز خان کے وفاداروں کی گاڑیاں تھیں

کیونکہ ان کی جانب سے ہم پر فائرنگ نہیں ہو رہی تھی یہاں سے اسپتال کافی فاصلے پر تھا میرا محسن موت کے منہ میں جا رہا تھا لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اسپتال پہنچنے تک گل ریز خان کی صورت حال جیسی بھی ہوتی اسے بے بسی کے عالم میں دیکھا ہی جا سکتا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل کھول کر اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کی لیکن پانی اس کے حلق میں نہ اتر سکا اور اس کے چہرے اور گردن کو تر کرتا ہوا نیچے گر گیا۔

ہماری گاڑی اسپتال کے گیٹ سے اندر چلی گئی' گاڑی کی حالت خود ہی چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ اس کے اندر بیٹھ کر یہاں پہنچنے والے کس صورت حال سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہوں گے اس پر کسی نے گاڑی کو روکنے کی کوشش نہ کی' گاڑی کی بریک ایمرجنسی کے باہر جا کر لگی۔ ہمارے پیچھے پیچھے دو اور جیپیں بھی آتی چلی گئیں' ان کی حالت بھی قابل رحم تھی' تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور باڈی گولیوں سے چھلنی تھی' جیپوں کی حالت دیکھ کر لوگ سہم کر خود ہی ایک طرف ہوتے چلے گئے جبکہ ایک ساتھ تین گاڑیوں کا اس حالت میں اسپتال آنا بھی تھرتھلی کا باعث بن گیا۔ ہمارے باہر نکلنے سے پہلے ہی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ہم کسی بڑی لڑائی کا سامنا کر کے آئے ہیں اس لیے جیسے ہی میں نیچے اترا متعدد لوگ مدد کے لیے لپکے چلے آئے' تینوں گاڑیوں میں زخمی موجود تھے۔ گل ریز خان کو اسٹریچر پر منتقل کیا گیا' آئمہ اور اس کا بھائی بھی بے ہوش پڑے تھے' پہلی نظر میں مجھے یہ اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ خوف اور دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہوئے ہیں یا کسی گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔ یہ ایسی باتیں معلوم کرنے کا وقت نہیں تھا ڈاکٹر مجھ سے بہتر جان سکتے تھے اس لیے انہیں بھی ایمرجنسی میں منتقل کر دیا گیا۔ پچھلی گاڑیوں سے بھی زخمیوں کو اسٹریچر پر منتقل کیا جا رہا تھا۔

یہاں تک میرے اعصاب میرے کنٹرول میں تھے مجھ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ میں نے اپنے محسن اپنے بھائی اور اپنے مخلص دوست کی جان بچانی ہے۔ میں نہ صرف دشمنوں سے لڑتا رہا بلکہ تمام راستے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ گل ریز خان کو ہسپتال پہنچانے کے لیے ہی میں نے

دُرِ نایاب

☆ انسان اپنے احساسات کسی نہ کسی کے نام کرنا چاہتا ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے ہر احساس کو اللہ کے نام کر دیں۔ آپ کو درجہ بندی بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

☆ ہماری مسکراہٹ کا قسمت سے گہرا تعلق ہے۔ جب قسمت مسکراتی ہے تو ہم مسکراتے ہیں اور جب قسمت ہی نہ مسکرائے تو ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیوں کر آ سکتی ہے۔

☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ دکھاتے ہیں۔

☆ بڑا قد سے نہیں' کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہے۔

☆ جب دعا سے بات نہ بنے تو فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔

☆ جو لوگ اپنی ذات کے باہر رہتے ہیں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا دماغ مضبوط ہوتا ہے لیکن جو لوگ اپنی ذات کے اندر رہتے ہیں۔ وہ ہر ہر جملے اور ہر ہر لفظ پر زخمی ہوتے ہیں۔

(محمد ندیم......کراچی)

ان نامعلوم دشمنوں کے پیچھے جانے کا ارادہ ترک کیا تھا۔ ورنہ اب کمالا جٹ اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو ان کے گھر سے نکال کر بیچ سڑک الٹا لٹکا سکے اور ان کی لاش کے ٹکڑے کرکے جانوروں کو کھلا سکتے ہیں میں نے اگر پسپائی اختیار کی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ گل ریز خان کو گولی لگ چکی تھی اب اسے گاڑی سے نکال کر اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی منتقل کیا گیا تو میں خالی ذہن سے یہ سب دیکھتا رہا لیکن جیسے ہی گل ریز لالہ اور اس کے جانباز ساتھی میری نظروں سے اوجھل ہوئے‘ میں ڈھ گیا جو کمالا جٹ دشمن کی گولیوں سے نہ گر سکا لیکن اپنے دوست کا خون دیکھ کر گر گیا تھا۔

ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگوں نے میرا ہی وزن اٹھانے سے انکار کردیا ہو۔ بے جان سے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے میں نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ مجھے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے‘ لوگوں کی باتیں تو دور کی بات ہیں مجھے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی نہ سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحے پہلے جب میں اس اہسپتال میں داخل ہوا تو ہماری گاڑی کی حالت دیکھتے ہی شور مچ گیا تھا اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسا سب کو سکتہ ہوگیا ہو۔ ایک ہی لمحے میں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا یا پھر میں کسی ویران گھر میں پہنچ گیا تھا۔ گل ریز خان مجھے پاوندوں کے قبیلے سے بچانے آیا تھا اور میرے ہی سامنے نامعلوم دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ میں بے بسی کے عالم میں کچھ نہ کر پایا تھا۔

میں کافی دیر یونہی زمین پر بیٹھا رہا پھر جانے کب سالار خان نے آکر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا‘ سالار خان‘ گل ریز خان کا ذاتی محافظ تھا۔

گل ریز خان کے والد نے اسے اپنے بچوں کی طرح ہی پالا تھا‘ وہ نہ صرف گل ریز خان کا سب سے وفادار ساتھی تھا بلکہ اس کے علاقائی اور سیاسی معاملات بھی کسی حد تک دیکھ رہا تھا۔ جہاں گل ریز خان کے مفادات پر ضرب لگنے لگتی وہاں پہلے سالار خان اپنے طور پر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرتا اگر پھر بھی معاملہ حل نہ ہوتا تو پھر وہ صورت حال گل ریز خان کے علم میں لے آتا۔ ہمارے پیچھے تیزی سے گاڑی بھگا کر لانے والا یہی سالار خان تھا۔ وہ اپنی گاڑی گل ریز خان کی گاڑی کے بالکل پیچھے رکھتا تھا ایک طرح سے وہ گل ریز کے محافظ دستے کا سالار بھی تھا۔ وہ جانے کب مجھے ڈھونڈتا ہوا باہر آیا اور پھر ایک دیوار کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر صورت حال سمجھ گیا‘ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر مجھے بھی ایمرجنسی میں لے گیا۔ مجھے بھی ایک بیڈ پر لٹا کر گلوکوز کی بوتل لگادی گئی‘ ڈاکٹر کسی کو بتا رہا تھا کہ شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے میرے اعصاب چیخ گئے ہیں۔

گل ریز خان بالکل ہی گمنام شخص نہیں تھا ہماری ڈرامائی انداز میں اسپتال آمد اور زخمیوں میں گل ریز خان کے شامل ہونے کی خبر جانے کہاں تک پھیل گئی تھی۔ سالار خان بھی جانے کن انتظامات میں مصروف تھا‘ ہسپتال کو گل ریز خان کے محافظوں نے گھیر لیا تھا۔ کچھ لوگ انتقام انتقام کے نعرے لگا رہے تھے‘ گل ریز خان کا رویہ اپنے لوگوں سے بہت اچھا تھا اس لیے اس کے چاہنے والوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ وہ اکثر اوقات ضرورت مندوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ اپنے لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جانے کی

عادت نے بھی اسے خاصی شہرت دے رکھی تھی۔

اب ان میں سے جس جس کو معلوم ہوتا جا رہا تھا کہ گل ریز خان پر حملہ ہوا ہے اور وہ اسپتال میں موجود تھا وہ سب دیوانہ وار اسپتال کے باہر جمع ہو رہے تھے۔ انتظامیہ ایک خاص حد تک آگے آنے سے روک رہی تھی‘ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زیادہ رش ہونے سے مریضوں کے لیے پریشانی ہوتی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ ہمدردوں کے اس ہجوم میں گل ریز کا کوئی دشمن بھی اس تک پہنچ کر اسے نقصان پہنچا سکتا تھا‘ گل ریز کے جانبازوں نے اسی خدشے کے پیش نظر اپنا سیکورٹی حصار بھی بنالیا تھا۔

سالار خان اس صورت حال میں بھی مجھے خاص احترام دے رہا تھا‘ اس کے ذریعے پل پل کی صورت حال مجھ تک پہنچ رہی تھی اور وہ بعض حوالوں سے مجھ سے مشورہ بھی کر رہا تھا اس کے انداز سے مجھے یوں لگا کہ جیسے اسے میرے حوالے سے گل ریز نے خاص ہدایات کر رکھی ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گل ریز نے میرا کیا تعارف کروایا تھا لیکن وہ مجھے اتنا ہی احترام دے رہا تھا جتنا گل ریز کے گھر کے کسی فرد کو دیا جاتا۔ گل ریز اور اس کے پانچ جانباز آپریشن تھیٹر میں تھے اس کے چاہنے والے خون دینے کے لیے لائن بنائے بیٹھے تھے جن جن کا بلڈ گروپ یکساں تھا ان میں کچھ کا خون لیا جا رہا تھا۔ سالار خان نے بتایا کہ اس نے گل ریز کی صحت کے لیے قرآن اور دعاؤں کا اہتمام کروادیا تھا۔

آپریشن تھیٹر سے پہلی مرتبہ خبر یہ آئی کہ محافظ جانبر نہ ہوسکا‘ محافظ خان بھی گل ریز کے محافظ دستے میں شامل تھا۔ سالار خان نے بتایا کہ وہ بے جگری سے لڑا تھا اس نے جب دیکھا کہ گل ریز خان کو نشانے پر لیا جا رہا تھا تو اپنی جان کی پروا کیے بنا کھڑکی سے باہر نکل کر دیوانہ وار دشمنوں پر گولیاں برسانے لگا اسی دوران اسے بھی کسی کی گولیوں نے چاٹ لیا۔ محافظ خان کی ایک سال قبل شادی ہوئی تھی اور ایک ماہ کی بیٹی تھی۔ وہ گل ریز خان کا بااعتماد ساتھی اور محافظ تھا اور اسی کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں‘ میں نے سالار خان کی طرف دیکھا او رکہا۔

”سالار خان! اس کے لیے ”مارا“ گیا جیسے لفظ استعمال نہ کرو‘ وہ شہید ہے۔ اس نے اپنا فرض نبھایا تھا اس وقت اسے نہ اپنی بیوی یاد تھی اور نہ ہی ایک ماہ کی بیٹی کا خیال آیا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ گل ریز خان پر حملہ ہوگیا ہے اس کا مالک خطرے میں تھا اور اس نے اپنے مالک کے لیے جان کی بازی لگادی۔ وہ راہ وفا میں جان لٹانے والوں میں شامل ہوگیا ہے اس میں وفاداری کا جتنا جذبہ تھا اگر اس سے آدھا جذبہ ہماری بندگی میں ہوتا تو ہم ولی کہلاتے۔“ میری آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ سالار خان بھی رو رہا تھا۔

اتنے میں خبر آئی کہ ایک اور جان باز نے راہ وفا میں جان لٹادی ہے‘ میرے ساتھ ساتھ در و دیوار بھی بین کرنے لگے‘ گل ریز خان دنیا کے خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جس کی خاطر صرف محافظ ہوتے ہیں‘ جانباز قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ اکثر اہم شخصیات پر حملہ ہو تو ان کے محافظ اپنی جانیں بچانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جانباز جان تک نچھاور کردیتے ہیں۔ یہ جانباز دولت سے نہیں خریدے جاتے‘ دولت سے صرف

محافظ خریدے جاتے ہیں' تاریخ تو یہ بھی بتاتی ہے کہ اکثر بادشاہوں کے قتل میں ان کے محافظ دستے کے لوگ ہی شامل ہوتے تھے۔

اسپتال میں افراتفری کا سماں تھا' ڈاکٹر پریشانی کے عالم میں بھاگ دوڑ کررہے تھے' ہم یہاں گل ریز خان کو بچانے لائے تھے لیکن اب ایک ایک کرکے اس کے جانبازوں کی لاشیں مل رہی تھیں۔ دو لاشیں ہمیں کچھ ہی دیر میں ملنے والی تھیں کہ ایک اور جانباز کی موت کی خبر آگئی' ڈاکٹر ہر بار باہر آتا سر جھکا کر افسوس کا اظہار کرتا اور ایک لاش اسٹریچر پر آپریشن تھیٹر سے باہر چھوڑ کر واپس اندر چلا جاتا۔ آخری جانباز کی موت کی خبر سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی' ابھی تک ہمیں اچھی خبر نہ ملی تھی ایک ایک کرکے سبھی موت کی آغوش میں جارہے تھے۔ ڈاکٹر سر توڑ کوشش کررہے تھے لیکن اب یوں لگ رہا تھا کہ جیسے قیامت آنے والی ہے۔

نامعلوم حملہ آوروں سے ہماری جھڑپ پاک افغان سرحدی علاقے میں ہوئی تھی وہیں یہ جانباز زخمی ہوئے تھے۔ ہم نے زخمیوں کو اس اسپتال تک لانے کے لیے تمام تر تیز رفتاری کا سہارا لیا تھا' ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ ہم نے زخمیوں کے ساتھ طویل فاصلہ طے کیا تھا اس سارے سفر کے دوران زخمیوں کا خون بہتا رہا تھا یہاں آکر خون دینے والوں کی لائن لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ خون حاصل کرچکے تھے لیکن اس کے باوجود زخمی جانباز زندہ نہ بچ سکے تھے اب آپریشن تھیٹر میں صرف گل ریز خان رہ گیا تھا' ہسپتال کے سینئر ترین ڈاکٹروں کو بلالیا گیا تھا' ماہر اور تجربہ کار سرجنوں کا پورا بورڈ آپریشن تھیٹر میں موجود تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ گل ریز خان کون ہے' پورا اسپتال اس کے جانبازوں نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ایمرجنسی تک میں اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ گونج رہی تھی انہیں باہر بھیجنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ گل ریز کو گولی لگنے کی خبر نے اس کے جانبازوں کو وحشت کی جانب دھکیل دیا تھا۔ وہ سب وحشی ہورہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا' ڈاکٹر جانتے تھے کہ اس آخری زخمی کو کچھ ہوا تو شاید ان کی زندگی کی ضمانت بھی نہ مل سکے اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کررہے تھے کہ گل ریز کی سانسوں کی ڈوری قائم رہے۔ اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر نکلا' میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا' ڈاکٹر نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کہا۔

''آئی ایم سوری۔'' میرے سر پر بم آپھٹا' آپریشن تھیٹر میں اب صرف گل ریز خان تھا اور ڈاکٹر باہر آیا ''آئی ایم سوری'' کہہ رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

بے آواز

طاہرہ جبین تارا

اسلام ایک آفاقی دین ہے جسے دین فطرت بھی کہا جاتا ہے یعنی اس میں انسانی بلکہ اس کائنات میں پائی جانے والی ہر مخلوق کے مسائل کا حل موجود ہے لیکن جب بھی ہم نے دین سے ہٹ کر زندگی کے اصول بنانے کی کوشش کی تو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

زیر نظر کہانی ایک دل دہلا دینے والے واقعہ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس نے ہر صاحب دل کی پلکوں کو بے ساختہ بھیگنے پر مجبور کردیا تھا۔

''آج پھر اس نے طفیل کو مارا ہے اور بہت بری طرح مارا ہے پلیز میم بتائیں اس کی ہسٹری کے بارے میں مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' ایک ہفتہ ہوا تھا اسے چراغاں کو جوائن کیے ہوئے۔

''سامعہ اس کی ہسٹری کا تو ہمیں بھی نہیں پتہ بس فائل ہم نے خود ہی تیار کی ہے۔ اس کی بہن اور بھائی آئے تھے اور یہ بتایا تھا کہ ایک مہینے سے یہ حالت ہے بیٹھے بیٹھے چلانا شروع کردیتی ہے اور جو مرد سامنے آتا ہے اسے مارتی ہے۔ ملازموں سے لے کر رشتہ داروں تک کسی کو نہیں چھوڑا' اب تنگ آکر ہم اسے یہاں لے آئے ہیں۔ اب یہ کیس تمہارے لیے چیلنج ہے۔''

''اوکے میم آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔''

وہ سنبل کے کمرے میں گئی جو بے خبر چھت کو گھور رہی تھی اور اس کے چہرے پر ناقابل بیان تاثرات تھے۔

''سنبل! کیا سوچ رہی ہو؟'' مگر وہ ہنوز اسی طرح لیٹی رہی جیسے اس نے آواز ہی نہ سنی ہو وہ تھوڑا سا آگے بڑھی اور اس کے شولڈر پر ہاتھ رکھا ایک دم وہ تڑپ کر مڑی اور اس کے ہاتھ کو بڑی شدت سے جھٹکا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔

''سنبل! کیا ہوا؟ میں ہوں ڈاکٹر سامعہ تم سے ملنے آئی ہوں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں میری دوست بنوگی' نا۔''

''ڈاکٹر! کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا اور مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی' پلیز آپ جائیں' میں پاگل نہیں ہوں۔ اگر میرے گھر والے یہاں چھوڑ گئے ہیں اور میں یہاں رہ رہی ہوں تو صرف اس لیے کہ میں کچھ دن سب سے دور سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔''

''سنبل جی' میں نے کب کہا کہ تم پاگل ہو میں تو صرف تم سے دوستی کرنے آئی ہوں' تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ یار میں یہاں اکیلی ہوں کسی سے جان پہچان ہی نہیں ہے۔ میرے پیرنٹس کراچی میں ہیں۔ مجھے ملازمت تمہارے خوبصورت شہر لاہور میں ملی ہے مجھے بولنے کی عادت ہے نا اب بتاؤ کس سے باتیں کروں سب تو دن کے وقت ہوتے ہیں مگر رات میں یہاں ہو کا عالم طاری ہوجاتا ہے' اف کہاں کراچی کی رونقیں اور چراغاں' کہاں چراغاں کا سناٹا اب اللہ اللہ کرکے تم نظر آئی ہو میری ایج فیلو مگر تم لفٹ کرانے کو تیار ہی نہیں ہو۔''

''آپ کتنا بولتی ہیں ڈاکٹر' آپ کے مریض تو تنگ آجاتے ہوں گے؟'' وہ بڑی بے تکلفی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ہاں تو سنبل جی' اب تمہیں مجھے اس وقت تک برداشت کرنا ہے جب تک مجھے نیند نہیں آجاتی۔''

اور پھر رات گیارہ بجے تک صرف وہی بولتی رہی کبھی اسکول کے قصے تو کبھی کالج کی شرارتیں کبھی یونیورسٹی لا

ئف کا سنہرا دور مگر وہ عدم دلچسپی سے سنتی رہی۔

"او کے یار لگتا ہے تمہیں نیند آرہی ہے کیونکہ میں ہی تمہارا سر کھا رہی ہوں تم تو بس گم صم بیٹھی ہو لیکن کل تم بولو گی اور میں سنوں گی او کے اینڈ شب بخیر۔"

وہ اپنے کمرے میں آکر سر پکڑ کر بیٹھ گئی اف میں کتنا بولتی رہی مگر اس کے چہرے پر کسی جذبے' کسی تاثر کا پتہ نہیں چل سکا اتنا سپاٹ چہرہ اس نے بے اختیار سیل نکالا اور سائیکاٹرسٹ میم روحانہ کو کال کی' جنہوں نے ہمیشہ اپنے اسٹوڈنٹ کو گائیڈ کیا۔

"سوری میم! اس وقت آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں ایک الجھا ہوا کیس ہے آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔"

"وائے ناٹ سامعہ! بتاؤ کیا مسئلہ ہے' مجھ سے بات کرنے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

"سو نائس آف یو میم! ایک کیس ہے جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ایک لڑکی کو اس کا بھائی اور بہن چھوڑ کر گئے ہیں' اس کی فائل میں صرف اس کا نام اور تعلیم درج ہے اور صرف اتنی بات کہ ایک ہفتے سے وہ پانچ لوگوں کو بری طرح مار چکی ہے اور وہ بھی صرف مردوں کو یہاں بھی اس نے مرد ملازمین کو مارا ہے بظاہر وہ پاگل نظر نہیں آتی لیکن سارا وقت خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے کسی سے بات نہیں کرتی ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرہ ہے ہسٹری کا پتہ نہیں' بتائیں کیسے ٹریٹمنٹ کروں ابھی اس سے بہت باتیں کر کے آئی ہوں مگر اس نے کسی بات میں انٹرسٹ نہیں لی بیزاری سے سنتی رہی ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کیا کروں؟ میری جاب کا یہ پہلا کیس ہے اتنا پیچیدہ تھوڑی سی ہسٹری پتہ ہوتی تو میرے لیے مسئلہ نہیں تھا۔"

"نو پرابلم تم اس کے گھر والوں سے ملو ارد گرد کے لوگوں سے اس کے اسکول کالج کی فرینڈز سے تمہیں بہت کچھ پتا چل جائے گا بس آج کل میڈیا' انٹرنیٹ موبائل نے تباہی پھیلا دی ہے یہ لڑکیاں لڑکوں کی جھوٹی باتوں میں آکر اپنی آنکھوں میں سنہرے خواب سجا لیتی ہیں اور جب خواب ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر ڈپریشن کا شکار ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہیں مردوں کو مارنا نفرت کی نشانی ہے اور مردوں کو اسی وقت انتقام کا نشانہ بنایا جاتا ہے جب کسی مرد سے تکلیف پہنچی ہو اس کیس میں بھی یہی ہوا ہوگا۔ تمہیں لوگوں سے بہت کچھ پتا چل جائے گا او کے تھینکس میم! میں کل ہی اس کے گھر والوں سے ملتی ہوں۔"

صبح اس نے ڈاکٹر سونیا کو بتایا اور سنبل کے گھر کا ایڈریس لے کر اس کے گھر چلی آئی۔

"جی آپ کون؟" گیٹ ایک اسمارٹ سی خاتون نے کھولا؟

"میں ڈاکٹر سامعہ ہوں سنبل کا ٹریٹمنٹ کر رہی ہوں' اس کی کیس ہسٹری کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"پلیز آپ تشریف رکھیں' میں اس کی بھابی ہوں۔ جی پوچھئے کیا جاننا چاہتی ہیں؟"

"دیکھیں' علاج کے لیے مریض کی نیچر سے آگہی بہت ضروری ہے لیکن سنبل کی فائل کورا کاغذ ہے اس لیے مرض کی تشخیص کیسے ہو اس نے اسپتال میں بھی دو تین مرد ملازمین کو بہت بری طرح مارا ہے آخر مرد کو ہی کیوں؟ وہ کسی لڑکی کو نہیں مارتی کسی سے محبت کا چکر ہے یا کسی نے سنبل کو دھوکا دیا آپ یقیناً اس پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں' سنبل بہت نائس لڑکی ہے میں خود حیران ہوں کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ تو بہت لونگ اور کیئرنگ تھی نہ جانے ایک دم سے اسے کیا

وگیا ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"بچپن میں کیسی تھی کس کے ساتھ اٹیچ منٹ تھی؟"

"میری شادی کو بارہ سال ہو گئے ہیں جب میری شادی ہوئی تو سنبل دس سال کی تھی مگر ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی آج تک کہ انکل اور آنٹی اسے ہمیشہ اپنے کمرے میں سلاتے' اسے کبھی اکیلا نہیں بھیجا یہاں تک ذہین ہونے کے باوجود اس نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی بلکہ پرائیویٹ میٹرک کیا۔ میں نے کئی بار آنٹی سے کہا کہ اب سنبل بڑی ہو گئی ہے باقی بہن بھائیوں کی طرح اسے الگ کمرہ دیں مگر آنٹی اور انکل کبھی نہیں مانے ان کا ایک ہی جواب ہوتا سنبل سب سے چھوٹی ہے ہمیں اس سے بہت زیادہ پیار ہے ہم اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے اور سنبل بھی یہی کہتی امی اور ابو صرف میرے ہیں میں ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے کمرے میں رہوں گی۔ سب مذاق کرتے' تم شادی کے بعد بھی امی ابو کے ساتھ رہو گی تو بڑے دھڑلے سے کہتی ہاں وہ بھی امی ابو کے ساتھ رہے گا اس کی ذہانت کی وجہ سے ہی ہم سب نے بڑی مشکل سے اس کا کالج میں ایڈمیشن کروایا۔ ابو' امی راضی نہ تھے مگر ہماری ضد اور سنبل کی خواہش پر انہیں راضی ہونا پڑا۔ ابو اسے خود چھوڑ کر آتے اور خود ہی لینے بھی جاتے۔ کالج میں اس کی بہت سی فرینڈز بن گئیں اور سنبل بھی ہر فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ یہ جو پینٹنگ آپ دیکھ رہی ہیں یہ سب سنبل کی محنت کا نتیجہ ہیں' کتنے ہی انعام جیتے۔ کالج کی ہر دلعزیز اسٹوڈنٹ تھی لیکن جب انکل' آنٹی کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوئی اس وقت سنبل نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ انکل' انٹی کی ڈیتھ کے بعد سنبل نے اسٹڈی چھوڑ دی۔ وہ دماغی طور پر بہت اپ سیٹ تھی اس لیے ہم نے بھی زور نہیں دیا لیکن جو حالت اب ہے ایسی نہیں تھی۔"

"سنبل کی یہ حالت کب ہوئی؟"

"تقریباً تین ماہ پہلے یہ کالج اپنی سند لینے گئی تھی۔ واپس آکر یہ کمرے میں بند ہو گئی' میں نے شام کی چائے کے لیے اسے بلایا مگر ملازمہ نوری نے بتایا کہ وہ دروازہ نہیں کھول رہی۔ میں پریشان ہو کر آئی اسے آوازیں دیں تو اس نے کہا بھابی آپ پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں نے کہا سنبو' تم نے کھانا نہیں کھایا' صبح ناشتہ بھی برائے نام کیا تھا۔ اب میں نے چائے کے ساتھ تمہاری پسند کے سموسے اور چپس بنائے ہیں جلدی سے دروازہ کھولو اور آکر کھا لو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"بھابی مجھے ابھی بھوک نہیں ہے جب بھوک ہوگی آکر کھا لوں گی پلیز مجھے اب کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" سنبل نے بنا دروازہ کھولے کہا۔

"پھر رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ زبیر اور بچوں نے بھی بلایا مگر اس دن سنبل کمرے سے نہیں نکلی صبح ناشتے کے وقت کمرے سے نکلی تو آنکھیں سرخ تھیں وہ بے اختیار بھائی کے گلے لگ کر بے تحاشہ روئی۔

"کیا ہوا سنبل! کسی نے کچھ کہا ہے۔ بھابی سے تو لڑائی نہیں ہوئی۔" زبیر پریشان ہو گئے۔

"نہیں بھیا! کسی نے کچھ نہیں کہا بس آج امی' ابو بہت یاد آرہے ہیں۔ کاش میں بھی ان کے ساتھ مر جاتی' میں ذہنی طور پر تو مر ہی چکی ہوں' پتہ نہیں آپ کے سامنے میری زندہ لاش ہے۔"

"سنبو! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو اللہ تمہیں بہت ساری خوشیاں دے' بہت لمبی عمر دے۔ کیا کالج میں کسی نے کچھ کہا ہے؟" میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی' مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا بس آگہی بہت عذاب دیتی ہے۔ کچھ باتیں جب تک پوشیدہ

رہیں انسان سکون سے رہتا ہے اور جب ان باتوں کا دراک ہوجائے تو پھر زندگی عذاب بن جاتی ہے۔"

"سنبو! کون سی باتیں مجھے بتاؤ کیا کہا ہے کسی نے تمہیں؟" زبیر ایک دم پریشان ہوگئے۔

"کچھ نہیں بھیا! بس ایسے ہی بات کررہی ہوں چلیں ناشتا کرلیں۔"

"اس دن کے بعد سنبل زیادہ تر اپنے کمرے میں گم صم رہنے لگی فردا اور ایاز سے اس کی بہت انڈرسٹینڈنگ تھی جو سنبل کے خالہ زاد ہیں مگر اب ان سے نہیں ملتی' بہانہ کرتی کہ میری طبیعت خراب ہے۔ صرف ایک ماہ پہلے ہاکر کو بہت بری طرح مارا ہمارا پرانا ملازم ہے اس کا بیٹا اس سے ملنے آیا اس کی بری طرح پٹائی کی پھر گھر کی چیزیں توڑ پھوڑ دیں پھر یہ دورے زیادہ پڑنے لگے۔ چیختی چلاتی جو سامنے آتا اسے مارتی اور پھر رونا شروع کر دیتی۔ آپ کے پاس لانے سے پہلے بہنوئی کو مارا میری بڑی نند اور ان کے ہزبینڈ ملنے آئے تو سنبل کمرے سے نکلی اور طلحہ کو اسٹک اٹھا کر ماری۔ بس اس کے بعد ہی زبیر نے آپ کے اسپتال کا رخ کیا۔"

"آپ کو بھی ریزن پتہ نہیں چل سکا؟"

"نہیں ڈاکٹر سامعہ! ہمیں نہیں پتا کہ اس کی کنڈیشن ایسی کیوں ہوئی ہے۔ میں نے تو دل ہی دل میں ایاز سے اس کا رشتہ بھی طے کردیا تھا اگر اس کی یہ حالت نہ ہوتی تو میں نے زبیر سے کہہ کر اس کی خالہ سے رشتے کی بات کرنا تھی۔"

"ڈونٹ وری سنبل بھی جلد ہی ٹھیک ہو آکر آئے گی۔"

......☆☆☆

"کیا رہا ڈاکٹر سامعہ؟" مسز رفاقت نے اس کے تھکے تھکے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں سنبل کی یہ حالت صرف ایک دو ماہ سے ایسی ہے اس سے پہلے تو اس کی بھابی کے مطابق بہت کیئرنگ اور لونگ تھی' کسی سے محبت کا بھی کوئی چکر نہیں ان شاء اللہ اللہ بہتر کرے گا۔"

"سنبل جی! کیسا دن گزرا' مجھے یاد تو نہیں کیا ہوگا۔ شکر ہی کیا ہوگا کہ سامعہ سے جان چھوٹی لیکن میں اتنی جلدی جان چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"ڈاکٹر! آپ میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں' میں سچ میں پاگل نہیں ہوں۔ پتا نہیں بھیا مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ سنیں میں ایک دفعہ اپنے گھر جانا چاہتی ہوں' کچھ اہم چیزیں گھر رہ گئی ہیں۔"

"او کے میں آپ کو لے جاؤں گی اب تو دوستی پکی ہے نا۔"

"ابھی کوئی ایسا دعویٰ نہ کریں جب میرے بارے میں کچھ جان لیں گی تو آپ کو مجھ سے نفرت ہوجائے گی۔"

"آپ جیسی پیاری سی لڑکی سے کوئی نفرت کرسکتا ہے میں تو بالکل بھی نہیں کرسکتی آزمالینا۔"

دوسرے دن ڈاکٹر سامعہ اسے اس کے گھر لے گئی۔

"ارے میری سنبو آئی ہے' میں اور بچے بہت اداس ہیں بس اب تم نے واپس نہیں جانا۔"

"بھابی! میں اپنے روم سے کچھ چیزیں لینے آئی ہوں جلد واپس آجاؤں گی۔ میں نے کہاں جانا ہے بھیا سے کہنا مجھے لے آئیں وہ خود ہی تو چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"آپ کمرے سے چیزیں لے آئیں پھر چلتے ہیں' ہاں مسز زبیر! ابھی ہم سنبل کو نہیں آنے دیں گے ابھی ابھی تو میری اس سے دوستی ہوئی ہے کچھ دن ہم اکٹھے گزار لیں پھر بے شک سنبل کو لے آئیے گا۔"

"چلیں ڈاکٹر!" کمرے سے باہر آتے ہوئے سنبل نے کہا۔

"اب کھانے کا ٹائم ہوچکا ہے تم لوگ کھانا کھا کر

جاؤ' میں کھانا لگاتی ہوں۔ سنبل تمہاری پسند کی کڑھی بنائی ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد دونوں چراغاں میں پہنچیں تو ہر طرف گہما گہمی نظر آئی' سنبل اپنے کمرے میں چلی گئی اور سامعہ مسز رفاقت کی طرف چلی گئیں۔

"میم! کیا بات ہے بڑی صفائیاں ہو رہی ہیں کس کا وزٹ ہے؟"

"کل چراغاں کے اونر ڈاکٹر احتشام صاحب آرہے ہیں۔"

......☆......☆......

"ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں' یہ ڈاکٹر سامعہ ہیں یہ ڈاکٹر سونیا اور ڈاکٹر واجد ہیں۔" مسز رفاقت نے سب سے تعارف کی رسم نبھائی۔

"کتنے پیشنٹ ہیں اب یہاں؟"

"بیس پیشنٹ موجود ہیں اور پانچ اللہ کے فضل سے صحت یاب ہوکر جاچکے ہیں' کیا آپ ان لوگوں سے ملنا چاہیں گے؟"

"ضرور' ان کے کمروں میں ملتا ہوں' کوئی خطرناک مریض تو نہیں ہے ان میں۔"

"نہیں سر! بے چارے زمانے کی ستم ظریفوں کا شکار ہیں' الجھنوں میں پھنسے بے ضرر سے لوگ۔"

"او کے۔" وہ سب سے ملے اور جب سنبل کے کمرے میں آئے تو ڈاکٹر سامعہ نے کہا۔

"سر' یہ میری بڑی اچھی سی دوست ہے۔"

"جی سنبل بی بی! کوئی پرابلم؟"

سنبل یک ٹک ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی' اس کی آنکھیں خون رنگ ہورہی تھیں' چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سامعہ کو یوں لگا وہ ڈاکٹر پر جھپٹ پڑے گی اس لیے اس نے کہا۔

"چلیں سر! اب ایک اور پیشنٹ سے ملاتی ہوں۔" اور جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

......☆......☆......

"ڈاکٹر سامعہ! آپ مجھے سر احتشام صاحب کے بارے میں بتائیں گی؟"

"سنبل! تم سر کے بارے میں کیا جاننا چاہتی ہو اور کیوں؟"

"بس وہ مجھے اچھے لگے ہیں۔"

سامعہ نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا جو بالکل سپاٹ تھا وہ تمہیں اچھے لگے ہیں' سچ کہہ رہی ہو۔

"ہاں' ان کی پرسنلٹی دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ ان کے بارے میں جانا جائے۔"

"ویسے میں ان کے بارے زیادہ نہیں جانتی مسز رفاقت نے ہی بتایا ہے کہ بہت خدا ترس انسان ہیں سروسز اسپتال میں بطور ڈاکٹر کے خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں پھر اسپیشلائزیشن کے لیے انگلینڈ چلے گئے تھے اب وہاں سے آئے ہیں تو سروسز اسپتال میں ایم ایس کی خدمات انجام دے رہے ہیں یہ چراغاں اس لیے قائم کیا کہ یہاں الجھنوں میں پھنسے لوگوں کے مسائل حل کیے جائیں' انہیں زندگی کی پریشانیوں سے نجات دلائی جائے اور زندگی کی طرف راغب کیا جائے۔"

"کیا واقعی! ان کی زندگی کا موٹو لوگوں کو زندگی کی خوشیاں دینا ہے؟ سامعہ جی بتا سکتی ہیں کہ سروسز میں کب سے ملازم تھے۔"

"ارے تم کیوں سر کے بارے میں مشکوک ہورہی ہو؟"

"پلیز سامعہ! آپ نے دوست ہونے کا دعویٰ کیا ہے' میرا چھوٹا سا کام نہیں کرسکتیں؟"

"جناب جو حکم میرے آقا کا۔ سر 1990ء

میں وہاں تعینات ہوئے تھے۔"

"سامعہ جی' تھینک یو سو مچ۔"

"نو مینشن یار! وی آر فرینڈز۔"

چند دن بعد پھر سر احتشام آئے وہ اسٹاف سے میٹنگ کررہے تھے کہ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور سنبل ہاتھ میں تیز دھار چاقو لیے سر کی طرف بڑھی اس سے پہلے کہ کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا اس نے وہ چاقو سر احتشام کے دل میں اتار دیا چاقو اس نے جسم سے نکالا اور پھر اس کا وار دوبارہ چہرے پر کیا اور انتہائی نفرت سے کہا۔

"جی چاہتا ہے اس غلیظ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں۔ اب مجھے گرفتار کرلیں۔" مسز رفاقت نے پولیس کو فون کیا اور اسپتال میں موجود ایمولینس کے ذریعے سر احتشام کو سروسز میں لے کر گئیں۔

"سنبل نے ایسا کیوں کیا؟ کیا دشمنی تھی سر سے۔" سامعہ نے سونیا سے کہا۔

"سامعہ! میں خود حیران ہوں' اُف کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں وحشت ناک چہرہ تھا۔"

"ٹھہرو میں اس کے گھر تو اطلاع دوں شاید وہاں سے پتہ چل سکے کہ کیا معاملہ ہے' سر احتشام سے کیا دشمنی تھی؟"

"میں ڈاکٹر سامعہ بات کررہی ہوں آپ اپنے ہز بینڈ کے ساتھ آجائیں۔"

"ڈاکٹر صاحبہ' خیریت ہے نا سنبل تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بس آپ فوراً آجائیں۔"

"او کے ہم لوگ آتے ہیں۔"

"جی سامعہ صاحبہ' کیا بات ہے؟ آپ نے اتنی ایمر جنسی میں بلایا' سنبل کو بلائیں۔"

"سنبل نے ڈاکٹر احتشام کو شدید زخمی کردیا ہے وہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

کیا...... کب......؟ یہ سب کیسے ہوا؟ سب لوگ کہاں تھے؟" زبیر نے بے اختیار پوچھا۔

"بس اچانک کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا آپ یہ بتائیں ڈاکٹر احتشام سے کوئی دشمنی تھی؟"

"میں ڈاکٹر احتشام کو نہیں جانتا نہ ان کی فیملی کو ہم کیسی دشمنی؟ سنبل کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ میں اس کی ضمانت کی کوشش کرتا ہوں آپ تو جانتی ہیں اس کی دماغی کنڈیشن۔ پتہ نہیں اس نے کیوں ایسے کیا؟" زبیر نے پریشانی سے کہا۔

"سنبل کو تو کچھ نہیں ہوگا نا؟" مسز زبیر نے دل گرفتگی سے کہا۔

"سامعہ میں نے آپ کو بتایا تھا سنبو! بہت کیئرنگ اور لونگ ہے پتہ نہیں اس کو کیا ہوگیا؟"

"آپ فکر نہ کریں اس کی دماغی حالت کو مدنظر رکھا جائے گا۔"

"سنبل میری بہنا! یہ سب کیا کیا تم نے' اتنا غصہ تو تمہیں کبھی نہیں آیا۔"

"بھیا! آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں اپنا بیان عدالت میں دوں گی۔"

دوسرے دن کے اخبارات ڈاکٹر احتشام کے قتل سے بھرے پڑے تھے کیونکہ ڈاکٹروں کی انتھک کوشش کے باوجود زخم بہت گہرے تھے۔ وہ جانبر نہ ہوسکے گا۔

......☆☆☆......

سنبل کو آج عدالت میں پیش کیا جانا تھا ڈاکٹر ڈاکٹر احتشام کی فیملی جراغاں کا اسٹاف سنبل کی فیملی اور سول سوسائٹی سے عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جب سنبل کو عدالت کے کٹہرے میں لایا گیا تو اس کا چہرہ بہت پرسکون تھا اس نے جج کو مخاطب کرکے کہا۔

"جج صاحب! میں نے ابھی تک پولیس کو بیان ریکارڈ نہیں کروایا اور نہ ہی وجہ قتل پر روشنی ڈالی ہے میں

اس عدالت میں کچھ دکھانا چاہتی ہوں پلیز ایل ای ڈی کا ابھی ارینج کیا جائے کیونکہ میں چاہتی ہوں اس مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد سنایا جائے۔"

آدھے گھنٹے میں عدالت میں ایل سی ڈی کا ارینج کیا گیا تو اس نے وکیل سے کہا وکیل صاحب یہ سی ڈی لگا دیں یہ آج سے پندرہ سال پہلے کی ہے شاید لوگ اس کو بھول چکے ہوں مگر مجھے اس کا ہر لفظ ازبر ہے۔"

ایک معصوم سی پانچ سال کی بچی اسپتال کے گیٹ سے داخل ہوتے دکھائی گئی پھر کوریڈور میں دکھائی دی اس کے بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ دیوار کے پاس نظر آئی اور اس وقت وہ بہت نڈھال اور خون میں لت پت تھی وہ آدمی اسے کمروں کی طرف لا رہا تھا پھر وہ آپریشن تھیٹر میں تھی جلی سرخی تھی' پانچ سالہ سنبل کے ساتھ گینگ ریپ ظالموں کا کچھ پتہ نہیں چل سکا سنبل کے پانچ آپریشن کیے بعد دیگرے کیے جائیں گے بچی دماغی طور پر تندرست نہیں وہ خوفزدہ ہے ابھی ان درندہ صفت لوگوں کے بارے کچھ نہیں بتا سکتی ہاں کچھ عرصہ بعد وہ ظالموں کو پہچان سکے ماہر نفسیات منیر سروسز اسپتال۔

اس دور کے وزیراعلیٰ اس کی عیادت کرتے ہوئے دکھائے گئے ایسے لوگوں کو فوری گرفتار کیا جائے جو بھی ملوث ہوا معاف نہیں کیا جائے گا عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

ہیڈنگ چلی اسپتال کے عملے کے ملوث ہونے کے شواہد ملے ہیں۔

ایک اور ہیڈنگ تھی سنبل کے ساتھ ظلم و بربریت کرنے والوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے رہا کردیا اور کہانی ختم۔

"سر! میں وہ بدنصیب سنبل ہوں جسے پانچ سال کی عمر میں درندگی کا نشانہ بنایا گیا میری زندگی کی خوشیاں چھین لی گئیں میری نظروں میں آج بھی وہ فلم چل رہی ہے' پوری جزئیات کے ساتھ مسز منیر ماہر نفسیات نے سچ کہا تھا کہ ایک دن میں ان کو پہچان لوں گی۔ سر میں اور میرا کزن آئس کریم لینے جارہے تھے کہ ایک گاڑی ہمارے پاس آکر رکی' ارے یہ بچی کتنی پیاری ہے۔ میں نے آواز سنی' یہاں آؤ میں رک گئی ڈرو نہیں آؤ نا آئس کریم کھانی ہے' ہم دونوں نے ہاں میں سر ہلائے جلدی سے گاڑی میں بیٹھو' ہم تمہیں اور بھی مزے کی چیزیں کھلائیں گے اور تمہارے پپا کے پاس چھوڑ آئیں گے' ہم آپ کے پپا کے دوست ہیں۔ میں اور میرا کزن گاڑی میں بیٹھ گئے پہلے ہم نے آئس کریم کھائی' یہ بچی بہت پیاری ہے اسے لے چلتے ہیں اس بچے کا کیا کریں' راستے میں میو اسپتال ہے وہاں اتار دیں گے جب ہم نے انجان راستے دیکھے تو ہم دونوں نے رونا شروع کردیا کہ گھر جانا ہے پتہ نہیں کیا ہوا' میں بے ہوش ہوگئی جب آنکھ کھلی تو میں کمرے میں تھی' میں نے کہا انکل مجھے گھر جانا ہے مگر جج صاحب! وہ تین انسان نہیں تھے' شیطان اور وحشی درندے تھے۔ میں اپنی امی پپا کو پکارتی رہی کسی نے میری پکار نہ سنی' کوئی میری مدد کو نہ آیا اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا' دوبارہ آنکھ کھلی تو امی بھی پپا تھے مگر مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا' لوگ آتے مجھے پیار کرتے' کھلونے دیتے' کھانے کی چیزیں دیتے میں نہیں جانتی کہ سب کیوں پیار کرتے تھے میں اسپتال میں کیوں تھی میں نے امی سے پوچھا۔

"امی مجھے کیا ہوا' اتنی کڑوی دوائی کیوں دیتی ہیں کبھی سوئی چبھوتی ہے نرس مجھے سارے جسم میں بہت درد ہوتی ہے۔"

امی بے اختیار رونے لگتیں اور "کہتیں بیٹی تم گر گئی تھیں لیکن اب تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی کہ تمہیں اتنی گہری چوٹ لگے۔"

اور پھر میں گھر آگئی امی کہتیں اب میں تمہیں

اسکول نہیں جانے دوں گی۔ پپا کہتے تم ہماری نظروں کے سامنے رہو گی' میں نے میٹرک پرائیویٹ کیا۔ امی ابو مجھے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑتے' میں سمجھتی وہ مجھے پیار کرتے ہیں۔ وہ تو انسانوں کے ڈسے ہوئے تھے اس لیے ان سانپوں سے مجھے بچانا چاہتے تھے۔ جج صاحب! اب اس ٹوٹے پھوٹے وجود کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ سب کے کہنے پر امی ابو نے مجھے ایف اے کالج سے کرنے کی اجازت دی لیکن پپا ہر کام چھوڑ کر خود کالج چھوڑ کر اور لے کر آتے اور یہ پیار کرنے والی ہستیاں مجھے چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئیں۔

چار مہینے پہلے کی بات ہے میں اپنی خالہ کے گھر گئی اپنا نام سن کر میں بے اختیار دروازے سے باہر رک گئی۔ خالہ میرے کزن سے کہہ رہی تھیں۔ سنبل مجھے بہت پیاری ہے مگر میں اس سے تمہاری شادی نہیں کر سکتی۔ میرے کزن کی آواز آئی' کیوں امی میں اس سے شادی کروں گا' اس میں برائی کیا ہے۔

''بیٹا! اس میں کوئی برائی نہیں مگر......''

''مگر کیا امی! آپ صاف بات کریں سنبل آپ کو بھی پسند ہے پھر اس انکار کی وجہ؟''

''اگر اس کی شادی کی گئی تو وہ زندہ نہ رہ پائے گی مر جائے گی یہ ڈاکٹر نے کہا تھا ہمیں اس کی زندگی عزیز ہے۔''

''یہ کس پاگل نے کہا تھا اور کب......؟''

''بیٹا! بحث نہ کرو میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ ڈاکٹر کی تمام رپورٹیں تمہاری خالہ نے سنبھال کر رکھی ہیں۔''

اور میں اپنے گھر آ گئی۔ امی کے لاکر کا لاک توڑا اس میں اخبارات اور سی ڈی پڑی تھی اور پھر مجھے اس سانحہ کا پتہ چلا جس نے میرے وجود کو خاکستر کر دیا میرا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا اور وہ لوگ مجھے یاد آ گئے جنہوں نے میری معصومیت کو داغدار کیا۔

جج صاحب! ڈاکٹرز کی رپورٹ کے مطابق میرے پانچ آپریشن کیے گئے پانچ سال کی عمر میں اور لکھا گیا اگر شادی کی گئی تو میرے لیے وہ خوشی کا پیغام نہیں موت کا پیغام ثابت ہو گی اور وہ گزرا ہوا واقعہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد آیا اور میں نے ان چہروں کو بھی پہچان لیا جو انسان کے روپ میں بھیڑیے ہیں آپ کا قانون تو مجھے انصاف نہ دے سکا مگر میں نے اپنے ایک قاتل کو پہچان لیا جو مسیحا کے روپ میں درندہ تھا۔ ڈاکٹر احتشام ان درندوں میں سے ایک درندہ تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں۔''

عدالت میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ روسٹرم کے پیچھے جج کا سر بھی جھکا ہوا تھا' ہجوم میں سے اچانک ایک عورت اٹھی اور سسکیاں لیتے ہوئے سنبل سے لپٹ گئی۔

''میری بیٹی مجھے معاف کر دو' میں اس درندے کی بیوہ ہوں' جسے تو نے کیفر کردار تک پہنچایا۔'' پھر وہ جج کی جانب پلٹی۔

''جج صاحب! میں اپنے بدبخت شوہر کا خون اسے معاف کرتی ہوں وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹی اور اگلے ہی لمحے اپنے بال نوچتے ہوئے قہقہے لگاتی ہوئی عدالت سے باہر کی جانب بھاگ گئی۔

صید صیاد

ادیب سمیع چمن

ایک عاشق نامراد کا قصہ' اس نے اپنی بے وفا بیوی کا شکار کرنے کا ایک خوب صورت منصوبہ تیار کیا تھا اور وہ کامیابی کے قریب بھی پہنچ گیا تھا مگر......

انتقام کے جذبوں سے گندھی ایک خوبصورت کہانی۔

یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ آج کسی کو قتل کرنے کے لیے جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بہت پرسکون اور خوش تھا۔ اس کے دل و دماغ میں کوئی خلش کوئی پچھتاوا اور کوئی ہلچل نہیں تھی اور نہ ہی اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے نہ ہی اسے کسی طرح کا کوئی خوف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا جیسے وہ کسی کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ کسی پکنک پر جا رہا ہے حالانکہ وہ اپنی خوب صورت و حسین بیوی کو قتل کرنے کے لیے جا رہا تھا اس کی کچھ وجوہات یہ بھی تھیں کہ اس نے بہت سوجھ بوجھ اور چالاکی سے ایک نہایت بے داغ پلان بنایا ہوا تھا اور اس پلان پر اس نے بڑے صبر و سکون سے کئی دنوں کی محنت سے اپنی دانست میں بہت محفوظ اور انوکھا پلان بنا رکھا تھا اور کسی کو بھی اس خفیہ پلان سے آگاہ نہیں کیا تھا اسے یقین تھا کہ یہ اس کا بہت خفیہ اور کارگر پلان ہے۔

اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے پستول پر رکھا ہوا تھا' پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ابھی کچھ سپیدی باقی تھی۔ اس نے سوچا ابھی کافی وقت باقی ہے' نسرین کو قتل کرنے کے لیے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت بہتر رہے گا چنانچہ اس خیال کے آتے ہی وہ رنبو ہوٹل کے قریب واقع بازار حسن کی طرف چل پڑا یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ روشنیوں کا ایک حسین شہر آباد نظر آ رہا تھا' اٹھلاتی ہوئی جوانیاں' ناز و ادا سے شائقین کے دلوں کو لبھا رہی تھیں مگر اسے ان حسیناؤں کی اداؤں اور حسن کے نظاروں سے کچھ لگاؤ نہیں تھا وہ تو محض وقت گزاری کے لیے ادھر نکل آیا تھا۔ وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ تو صرف اور صرف نسرین کو قتل کرنے کے خیالوں میں گم تھا' نسرین جو بے حد حسین و جمیل تھی اس نے جب پہلی بار اسے شادی کی ایک محفل میں دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا اس کا سراپا اس کے اوپر سحر طاری کر گیا تھا۔ اس کا چہرہ اور اس کا وجود تاج محل تھا' اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھیں شراب کے لبریز پیمانوں کی مانند تھیں۔ اس کی زلفیں ساون بھادوں کی سیاہ گھٹاؤں کا منظر دکھاتی تھیں وہ جب بھی اس سے نظریں ملانے کی کوشش کرتا' وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیتی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور تیزی سے شارٹ کٹ کے ساتھ پھول والی گلی میں مڑ گیا۔ موتیا چنبیلی اور گلاب کی مدہوش کن خوشبوؤں سے اس کی سانس مہکنے لگی۔ بازار حسن کی عقبی گلی میں اپنی من پسند حسیناؤں کے لیے خریداروں کا ہجوم لگا رہتا تھا وہ ہوٹلوں کی جن قطاروں سے ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ پہلے اس نے چند لمحے کھڑے ہو کر جائزہ لیا' دائیں جانب بالکل کونے میں ایک ٹیبل بالکل خالی نظر آ رہی تھی۔

ہوں...... یہ ٹیبل بھی مناسب رہے گی' وہ یہی سوچ کر اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا' پہلے اس نے ادھر اُدھر کا جائزہ لیا اور بڑے پرسکون انداز کرسی پر بیٹھ گیا اس نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا پھر کوٹ کی دوسری

جیب سے سگریٹ کے پیکٹ سے نئی تازہ سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگا کر سلگا ہی رہا تھا کہ چائے آ گئی۔ گولڈ لیف کے پیکٹ میں صرف تین سگریٹ تھے اس نے ایک سگریٹ سلگا کر باقی دو سگریٹ دیکھتے ہوئے پیکٹ بند کر کے جیب میں رکھ لیا چائے کی چسکیوں کے ساتھ اسے نسرین کے ساتھ بیتے لمحات اور گزرے دنوں کی یادیں سینما اسکرین کی طرح نظروں کے سامنے لہرانے لگیں۔ ماضی کے اوراق خود بخود پلٹنے لگے تھے۔

کسی طرح اس نے موقع پا کر بڑی ہمت کر کے نسرین کو پرپوز کرتے ہوئے گلاب کی ادھ کھلی کلی کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس کی حالت کتنی عجیب سی ہو رہی تھی اس کا دل اس کے خیال سے بھی دھڑک رہا تھا کہ اگر نسرین ناراض ہو گئی اور اس نے کسی سے شکایت کردی تو شادی کی اس محفل میں وہ ایک تماشہ بن سکتی ہے اور نسرین نے انکار کرتے ہوئے اس کی محبت کا گلا گھونٹ دیا پھر اس کی ناراضگی کیا رنگ اختیار کر سکتی ہے؟ کیا وہ اس بے رحمی اور شکست کا غم برداشت کر سکے گا؟ کیا وہ اس بھری شادی کی محفل میں خود کو تماشہ بنتا ہوا دیکھ سکے گا مگر اسے حوصلوں نے سہارا دے دیا۔ محبت میں امتحان نہ ہوں تو وہ محبت بھی نہیں، ایک مفاد ایک غرض ہوتی ہے کیا ہوا اگر وہ تماشہ بنا دے گی، کیا وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دے گی۔ کیا ہوا اگر وہ اسے ذلیل کروا دے گی، ہو جائے کچھ لوگ یقیناً اس کے بھی طرفدار ہوں گے اور بھری محفل گواہ بھی ہو جائے گی کہ میں نے اس کو پسند کیا ہے اور محبت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ وہ بھی جہاں جائے گی میری محبت اس کا تعاقب کرتی رہے گی، اس کو بھی سکون اور چین نہیں ملے گا، ڈرو نہیں محبت کرنے والے کسی بھی انتقام، کسی بھی رسوائی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ زندہ باد اے محبت زندہ باد کا گیت گنگناتے ہوئے اس نے قدم بڑھا دیئے اور جیسے ہی وہ اس کے قریب سے گزری اس نے اس کا بازو تھام کر گلاب کی مہکتی کلی کا تحفہ اس کے آگے کرتے ہوئے آئی لو یو کہتے ہوئے اس کے حسین نازک ہاتھ میں تھما دی۔

نسرین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ......آپ......یہ کیا......یہ......'' اس نے پہلے حیرت سے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے شکریہ کہتی ہوئی تیز قدموں سے بھیڑ میں گم ہو گئی لیکن پھر حالات اس کے حق میں ہو گئے، کچھ ملاقاتوں کے بعد نسرین کی اس کے ساتھ شادی ہو گئی۔

اس کی صرف ایک بوڑھی ماں تھی اور اس کا دنیا میں کوئی بھی نہ تھا، وہ تو تنہا اور اکیلا ہی تھا۔ نسرین سے شادی کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی، اسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کا اصل مقصد تو اب نظر آ رہا ہے۔ شادی سے وہ کتنا خوش تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا بھر کی تمام خوشیوں نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا ہو اور ساری کائنات اس کے سامنے رقص کر رہی ہے تب اس نے خود کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت عاشق سمجھ لیا تھا۔ وہ یقین کر چکا تھا کہ اب ہم دونوں زندگی بھر کبھی جدا نہیں ہو سکیں گے۔

لیکن وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے وہ کسی کے غم، کسی کی خوشی کی پروا ہی نہیں کرتا ہے۔ حسرتیں خون کر دیتا ہے اور محبت کیا چیز ہے، یہ تو سگے خون کے رشتوں کو بھی پل بھر میں جدا کرا دیتی ہے، یہ ہی مراد کے ساتھ ہو گیا تھا، حالات نے اپنا رخ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ وقت کی آندھی نے اس کے محبت کے تاج محل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا، تقدیر کے اجالوں کو حالات کے اندھیروں میں روندھ ڈالا تھا۔ کل تک جس نسرین کو وہ اپنی متاع حیات اپنی زندگی کا حاصل سمجھ چکا تھا آج

اس کو ہی قتل کرنے جا رہا تھا اس نے چائے پیتے ...ئے ہوٹل میں لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا، جو آٹھ ...ا رہی تھی۔ کہیں گھڑی غلط تو نہیں احتیاط کے طور پر ...اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا بھی جائزہ ...ا نہیں بالکل ٹھیک ہے اس نے خود کلامی سے کہا۔

موسم نہایت سرد ہوتا جا رہا تھا شاید آسمان پر بادل ...ی چھا رہے تھے، ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں سے بچنے ...ے لیے اس نے صبح سے ہی اوور کوٹ پہن لیا تھا، سر ...فلٹ ہیٹ کے ساتھ گرم مفلر سے آدھا چہرہ اور ...انوں کو ڈھانپ رکھا تھا، سردیوں کے دن جلد ڈھل ...جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ جنوری کا مہینہ تھا، اس وقت ...ات کے آٹھ بج چکے تھے گویا نسرین کو قتل کرنے میں ...ابھی اس کے حساب سے ایک گھنٹہ باقی تھا، وہ ...ایا۔ بے وفا، دغا باز عورت اب تیری زندگی کا ...ف اور صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے پھر وہ ...خود مسکرانے لگا۔ ایسی مسکراہٹ جس کے اندر کسی ...ان کے قتل کا شیطانی منصوبہ گردش کر رہا تھا۔

''سنا تم نے نسرین صاحبہ! بے وفا، اب تم ان شاء اللہ اس دنیا میں ایک گھنٹہ کی مہمان ہو یعنی صرف ساٹھ ...۔ اس ایک گھنٹہ میں خوب دل بھر کر حسن کی ...ش کر لو، خوب روپ سنگھار کر لو اور اپنی اداؤں کی ...ت وصول کر لو اور اپنی عیارانہ جوانی سے لطف اندوز ...او اس کے بعد تمہارا یہ ٹھکرایا ہوا مراد تمہیں اس دنیا ... دوسری دنیا ابدی دنیا میں پہنچا دے گا، ہاہاہا......'' وہ ...ہی ہلکی ہلکی ہنسی سے خود کو خوش کر رہا تھا۔ ہوٹل میں ...انی گہما گہمی تھی، شور اتنا کہ کانوں پڑی آواز بھی سنائی ...ہیں دے رہی تھی۔ وہاں مراد کی خود کلامی اور اس کے ...ے دبے قہقہوں کو بھلا کون سن سکتا تھا؟ پھر خود سے ...ا ہوا، اس وقت آٹھ بج کر بتیس منٹ ہوئے ہیں، ...ٹھیک نو بجے یہاں سے چلوں گا تقریباً بیس منٹ کے بعد تمہارے کمرے میں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے اس وقت تم اپنے فلیٹ میں بالکل تنہا ہو گی۔ نو بجے بجلی بھی جا چکی ہو گی۔ میں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر تمہارے کمرے میں آ جاؤں گا اور پھر میرے پستول کی بے آواز گولی تمہیں ابدی نیند سلا دے گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور پھر اونچے اونچے پلازوں کے فلیٹوں میں کسی کو کسی کی خبر بھی کیا ہوتی ہے۔ تمہیں ابدی نیند سلا کر اس شہر سے فوراً لاہور واپس اور لاہور سے اگلے روز امریکہ چلا جاؤں گا۔ پرسوں کی میری فلائٹ بک ہو چکی ہے اور امریکہ میں بھلا کس کی ہمت ہے جو مجھے کچھ کہے یا گرفتار بھی کر سکے۔

تھوڑی دیر کے بعد ھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر پینتالیس منٹ پر پہنچیں تو وہ تیزی سے اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر چائے کے پیسے ادا کیے اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ سردی کی وجہ سے آبادی کی سڑک ویران نظر آ رہی تھی یہاں ٹریفک برائے نام ہی ہوتا ہے۔

نیچے کی سڑک فلائی اوور بن جانے کی وجہ سے ویران اور سنسان ہی رہنے لگی تھی، اسٹریٹ لائٹیں بھی بند پڑی تھیں اور ہر طرف دور تک اندھیرا خوف برسا رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ دھرم داس پلازہ کی پرانی عمارت کو آسانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس پرانی پلازہ جیسی عمارت سے وہ پہلے ہی سے خوب واقف تھا نیچے ٹوٹا ہوا لکڑی کا ادھورا سا دروازہ جو بوسیدہ ہو کر آدھے سے زیادہ بکھر چکا تھا اس کی پانچویں منزل کے فلیٹ نمبر 12 میں اس وقت نسرین موجود تھی۔ یہاں پرانی عمارت ہونے کی وجہ سے نہ کوئی سیکورٹی تھی نہ ہی کوئی چوکیدار ہوتا تھا ویسے بھی یہ پہلے لاجنگ اور مسافر خانہ کے طور پر استعمال ہو چکی تھی اب اس میں زیادہ تر مسافر لوگ ہی ٹھہرتے تھے قتل...... پہلی بار اس کا دل دھڑکا اور اسے خوف سا محسوس ہوا جو کئی روز سے

اپنی بیوی کو قتل کرنے کا پروگرام بنارہا تھا اور اب کچھ اضطراب سا محسوس کررہا تھا اور اس کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کی کنپٹیاں جلن پیدا کررہی ہیں شاید اس لیے بھی کہ آج صبح ہی سے وہ قتل وہ بھی جان سے زیادہ عزیز بیوی کے قتل کی اسکیم کا وقت قریب آ گیا تھا۔

"مجھے کیا ہورہا ہے" چلتے چلتے وہ ایک بار پھر خود سے بڑبڑانے لگا تھا۔ "مجھے گھبراہٹ کیوں ہورہی ہے؟ لیکن نہیں، چاہے کچھ بھی ہو مجھے کسی خوف اور کسی گھبراہٹ کی ہرگز پروا نہیں ہے۔ میں آج اسے یقیناً قتل کردوں گا۔ نہیں تو ٹھیک ساڑھے دس بجے لائٹ آجائے گی اور وہ اپنے عاشق کے ساتھ جاچکی ہوگی۔ اس کی موت ہی میرے سینے میں دہکتی آگ کو ٹھنڈا کرسکتی ہے۔" یہ سوچتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر پھر یاد آیا کہ سگریٹ تو ہوٹل ہی میں ختم ہوگئے تھے۔ چنانچہ وہ پان سگریٹ کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ دکان پر مالک بھی اندھیرے کا لیمپ جلا کر خالی بیٹھا ہوا نظر آیا اس نے پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر گولڈ لیف کا پیکٹ طلب کیا۔ دکاندار سے بقایا پیسے لے کر وہ دھرم داس پلازہ کی طرف چل پڑا۔ سگریٹ جلانے سے قبل اس نے پتلون کی ہپ پاکٹ سے ایک خالی ڈبی نکال کر اس میں سے ایک چٹکی کوکین ہونٹوں میں دبالی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں خود سے کہا۔

"ٹھیک ہے اب اس کے اثر سے مجھ پر کوئی خوف اور کوئی گھبراہٹ اثر انداز نہیں ہوں گے اور میں آسانی سے اسے قتل کرکے فرار ہوجاؤں گا۔" نئی سگریٹ جلاتے ہوئے اس نے احتیاطاً مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ دھرم داس پلازہ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تیسری منزل کے کمرہ نمبر 12 پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے دروازہ کو دھکیلا، دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا اسے کمرے میں کیروسین لیمپ کی روشنی نظر آرہی تھی اس نے کمرے کے دروازے کے اوپری حصہ کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا تو نسرین سنگھار میز پر بیٹھی اپنی آرائش میں مصروف تھی۔

وہ خود سے مسکرادیا اسے معلوم تھا کہ وہ یہ سب بناؤ سنگھار کیوں اور کس کے لیے کررہی ہے؟ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ٹھیک دس بجے اس کا عاشق جواد آئے گا تو یہ اس کے ساتھ ایک شادی پارٹی میں جائے گی۔ اسے بڑا لطف آنے لگا کہ جب جواد آئے گا تو اسے محبوبہ کی لاش ملے گی اور پھر وہ پاس پڑے ہوئے پستول کو دیکھے گا تو پولیس اسے ہی رنگے ہاتھوں پکڑے گی اور وہی قاتل کہلائے گا اور وہ ٹیلی فون بوتھ سے پولیس کو خفیہ نام کے ساتھ نسرین کے قتل کی اطلاع کردے گا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا جیسے ہی اندر داخل ہوا تو نسرین کو آہٹ ہوئی اس نے چونک کر دیکھتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔

"تم......" خوف اور تنہائی کی وجہ سے نسرین کے ہاتھ سے کنگا چھوٹ کر گر پڑا اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "ظالم انسان...... تم...... تم یہاں کیسے...... نکل جاؤ...... دفع ہوجاؤ میرے کمرے سے ورنہ ابھی پولیس کو فون کرکے تمہیں گرفتار کروادوں گی۔"

"تم مجھے گرفتار کروادو گی مجھے...... جو آج بھی تمہارا شوہر ہے اور جس کے تم نکاح میں ہو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں کس کا انتظار ہے اور یہ سب بناؤ سنگھار تم کس کے لیے کررہی ہو؟ جواد کے ساتھ شادی کی پارٹی میں جاؤ گی، ہیں نا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جواد ابھی دس بجے تمہیں لینے آجائے گا۔ تمہیں مجھ کو دیکھ کر کیوں تعجب ہورہا ہے نسرین بیگم! کیا تمہیں اپنے عاشق سے خوف نہیں، میں جو تمہارا شوہر ہوں، مجھ سے خوف ہے؟۔"

"لیکن میں تم کو چھوڑ چکی ہوں اور تم بھی مجھے طلاق دے چکے ہو اس وجہ سے میں نے جواد سے شادی کرلی ہے اب تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں رہا سمجھے، اگر ذرا بھی شرافت ہے تو یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ جواد آگیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" نسرین نفرت بھرے جملے اگل رہی تھی۔

"خوب، بہت خوب، مجھے اس حرام زادے سے ڈرا رہی ہو جس نے میری شرافت اور دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تمہیں ورغلایا، مجھ سے بدظن کیا، میں نے اس پر رحم کھا کر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا سارا بزنس اس کے حوالے کردیا تھا جس کو میں نے دوست سے زیادہ بھائی تصور کیا تھا اس نے میرے ہی خنجر گھونپا ہے اور تم...... تم نے تو عورت کی وفا کو دھوکہ دیا، کیا کمی تھی مجھ میں تمہیں ہر طرح پیار دیا تھا، تمہاری ہر خواہش ہر خوشی پوری کردی تھی مگر تم نے...... اس کو اپنی عزت اپنی عصمت سب کچھ بیچ دی اور رات کی تاریکی میں جب میں شہر سے باہر تھا دو لاکھ روپے اور زیورات لے کر اس کمینے جواد کے ساتھ بھاگ گئیں۔ تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہوا تھا مجھے سب علم تھا مگر میں مصلحتاً خاموش تھا مگر جب مجھے علم ہوا کہ تم نے کئی راتیں میری بیوی ہوتے ہوئے اس کے ساتھ بسر کی ہیں تو پھر کون شوہر ہوگا جو یہ بے غیرتی برداشت کرے گا۔ میری ذرا سی غلطی سے تم اور جواد فرار ہوگئے تھے، تم نے سمجھا ہوگا کہ کراچی اتنا بڑا شہر ہے، میں تمہیں لاہور سے یہاں کیسے تلاش کروں گا، مگر ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ دیکھو میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔" نسرین کی حالت غیر ہوچکی تھی اس سردی میں اسے پسینے آگئے تھے، اضطراب کے باعث اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔

وہ ڈر خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، مراد کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک سے اس پر لرزہ طاری ہورہا تھا اس نے ڈری ڈری آواز سے کہا۔

"تم...... مجھے تم سے خوف آرہا ہے پلیز تم چلے جاؤ۔ میرا وعدہ ہے میں جواد کو چھوڑ دوں گی اور تمہارے پاس واپس چلی آؤں گی اور وہ دو لاکھ میں نے نہیں جواد نے تمہارے حساب سے چرا کر نکالے تھے۔ اس نے مجھے بہکا دیا تھا مراد...... پلیز مجھے معاف کردو، میں آج بھی تمہاری ہوں۔ مجھے چاہو تو ابھی اپنے ساتھ لے چلو۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"سنو نسرین بیگم! جس طرح شیر جھوٹا شکار نہیں کھاتا۔ میں تو ایک انسان ہوں، ایک مرد ہوں۔ تم مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو کہ تم...... جس نے اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے ایک غیر مرد کے ساتھ تعلقات استوار کرلیے اور اس کی راتیں گرماتی رہیں، میں بے غیرت بن کر...... پھر تمہیں قبول کرلوں گا ہاہاہا...... میرے سینے میں تو انتقام کی آگ جل رہی ہے۔ تم نے میرے ساتھ ناقابلِ برداشت سلوک کیا نسرین! اب میرے سینے کی آگ تبھی بجھے گی جب تمہیں قتل کردوں گا اور پھر تمہارے حرام زادے عاشق جواد کو بھی موت کی نیند سلادوں گا یہ میرا آخری فیصلہ ہے سنا تم نے...... تمہاری زندگی کے بس اب چند منٹ ہی باقی رہ گئے ہیں۔" نسرین غصہ سے پھٹ پڑی۔

"تو تم...... تم مجھے مارنے کے لیے آئے ہو؟ ظالم بے رحم انسان! تم میرے ہوتے کون ہو، تمہارا اور میرا رشتہ تو کبھی کا ختم ہوچکا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے اپنے پرس میں رکھا ہوا پستول نکال کر مراد پر تان لیا۔ "چلے جاؤ یہاں سے ورنہ......"

"ورنہ کیا...... تم مجھ پر گولی چلاؤ گی تمہارے تو اپنے ہاتھ کانپ رہے ہیں اس سے پہلے کہ تم مجھ پر فائر کرو میرے پستول کی خاموش گولی تمہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کردے گی۔" نسرین کے ہاتھ

لرزنے لگے۔ مراد نے تیزی سے لپک کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لی۔

"چلو یہ اچھا ہوگیا اب میں تمہیں تمہارے ہی پستول سے ہلاک کروں گا تاکہ پولیس کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ تک نہ ہوسکے گا۔" اس نے ہاتھوں میں پہنے دستانوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر تمہارا عاشق جواد بھی تمہارا قاتل ٹھہرایا جائے گا۔ دیکھا تم نے میرا کام کتنا آسان کردیا ہے۔" نسرین کی آنکھیں پھٹنے لگیں وہ سماجت کے لہجے میں بولی۔

"خدا کے لیے رحم کرو اور مجھے معاف کردو' واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی' خدا کے لیے قدم روک لو مراد!"

"نہیں...... ہرگز نہیں اک بے وفا اور ہرجائی عورت کا مرجانا ہی بہتر ہے۔" پھر اس نے پستول کی لبلبی دبادی' نسرین کی چیخ بلند ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی مگر یہ کیا جیسے ہی جانے کے لیے کسی نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ مراد نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح اچانک اس پر حملہ کرے گا۔

اس نے پوری قوت سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور آنے والے کو دھکا دیا' کافی دیر دونوں گتھم گتھا ہوتے رہے' آنے والا ایک لحیم شحیم طاقت ور نوجوان ہوٹل کا بیرہ اکبر خان تھا۔ مراد نے جیب میں پڑا ہوا پستول نکالنے کی کوشش کی تو اکبر خان نے اس کی گردن میں اپنا بازو سختی سے حمائل کرکے اس کو بے بس کردیا اور اس پر گھونسوں لاتوں کی بوچھاڑ کردی۔

مراد لڑکھڑاتا ہوا بھاگنے کی کوشش کرنے لگا تو دوسرے رہائشی لوگ جو شور سن کر اوپر سے جھانک کر دیکھ رہے تھے' تیزی سے وہاں پہنچ کر مراد کو بے بس کردیا۔ ادھر ہوٹل والے نے گشت پر موجود پولیس موبائل کو روک کر مختصر حالات پولیس کو بتائے تو پولیس نے تیزی سے مورچہ بندی کرتے ہوئے مراد کو گرفتار کرکے نسرین کی لاش کو تحویل میں لے لیا۔ لائٹ آچکی تھی' شکاری خود شکار ہوگیا تھا' وقت مقررہ پر جب جواد نسرین کو لینے کے لیے پہنچا تو اس کے تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مراد سب کرگزرے گا' پستول کیوں کہ جواد کا تھا اور مراد کے ساتھ جواد ایک فریق بھی تھا' پولیس نے جواد کو بھی شامل تفتیش کرتے ہوئے موبائل میں بٹھالیا اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال پہنچادی۔

مراد کی تمام پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی' اس نے نسرین کو قتل تو کردیا مگر وہ اس کے خون کے الزام سے نہ بچ سکا۔

اس پر نسرین کے قتل اور ہوٹل کے بیرے کے اقدام قتل کے تحت دو دو مقدمے درج ہوچکے تھے عدالت میں کیس چلنے کے کچھ عرصہ بعد اسے سزائے موت اور اقدام قتل کے جرم میں دس سال قید بامشقت اور پچاس لاکھ جرمانہ کی سزا سنادی گئی تھی اس کی اپیل بھی خارج کردی گئی اس کو رہ رہ کر اپنے آپ پر پچھتاوا ہورہا تھا۔ کاش وہ اپنے مسئلے کو قانون کا سہارا اور مدد لے کر حل کرنے کی کوشش کرتا۔

کاش...... وہ جان سکتا کہ شکاری خود بھی شکار ہوجاتا ہے' کاش وہ سوچ سکتا کہ قانون سے ٹکرلینا اتنا آسان کام نہیں۔

ایک ستارہ

وقار الرحمن

جب کسی گہری اندھیری شب میں کہیں ایک ستارہ آکاش پر چمکتا ہے' مجھے ستارہ کی یاد آتی ہے' میرے خیالوں میں اس کی یادوں کے چراغ ہمیشہ جھلملاتے رہیں گے۔

محبت کے متلاشی دیوانوں کے لیے بطور خاص

وہ بہت خوب صورت تھی' ایک نوخیز کلی کی طرح۔ اس کے چہرے کی جلد' سپید گلاب کی پتیوں جیسی تھی کہ اس پر نظر نہ ٹھہرتی۔ چہرے کو بغور دیکھنے پر بھی کہیں' کسی نشان کا گماں نہ گزرتا۔ اس کا حسن' جیسے ایک ستارہ' ظلمت شب میں آکاش پر چمکتا ہو۔ جو کوئی اسے ایک نظر دیکھ لیتا پھر دیکھتا ہی رہ جاتا۔

ستارہ' نام تھا اس کا' وہ شہر کی ایک بڑی شاہراہ پر واقع ایک معروف بینک میں جاب کررہی تھی۔ خاں صاحب اس بینک کے منیجر تھے۔ وہ کھلے دل کے مالک تھے' ہر وقت ہنستے مسکراتے نظر آتے ہر ایک سے محبت سے پیش آنا' ان کی سرشت میں شامل تھا۔ ان کے ہاں گرما گرم چائے کی پیالی کے ساتھ' تازہ تازہ لطیفے سننے کو ملتے۔ دفتر میں ہر وقت قہقہوں کی برسات ہوا کرتی' ہمہ وقت وہ اپنے گرد دوستوں کی محفل سجائے رکھتے۔

میں بھی ان کے مداحوں میں سے تھا' ہمارے درمیان تکلف نام کو نہ تھا۔ ان کی پوسٹنگ حال میں اس بینک میں ہوئی تھی' پہلے وہ میکلوڈ روڈ برانچ میں تھے' جہاں پر میرا اکاؤنٹ ایک عرصہ سے چل رہا تھا جب ان کی تبدیلی مال روڈ برانچ میں ہوئی تو انہوں نے مجھے فون پر یاد کیا' کہنے لگے۔

"یار کسی روز ملنے کو آؤ۔" بہت دنوں تک کئی مصروفیات اس ملاقات میں رکاوٹ بنتی رہیں بالآخر ایک روز خاں صاحب سے ملنے کا ارادہ لیے ان کے بینک کا رخ کیا۔

بینک کے مین دروازہ سے ہال کمرے میں داخل ہوکر راہداری سے گزرتے ہوئے ان کے دفتر کی طرف بڑھا۔ دفتر کے بائیں ہاتھ ایک خوش شکل لڑکی کو بیٹھے پایا' جو اپنے کام میں مصروف تھی۔

جونہی میری نظر اس کے چہرے پر پڑی' میرے قدم رک گئے۔ میرے اس لڑکی کے پاس ایک لمحہ رکنے' اس کو ایک نظر دیکھنے کے منظر کو خاں صاحب نے دیکھ لیا تھا۔ وہ دفتر کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ تپاک سے ملنے کے بعد میرا ہاتھ تھامے دفتر میں داخل ہوئے۔ اپنے پاس بیٹھنے کو کہا پھر میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولے۔

"آخر ہماری محبت آپ کو یہاں کھینچ ہی لائی۔" ان کلمات کی ادائیگی کے ساتھ حسب معمول خاں صاحب کا ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا پھر گپ شپ کے ساتھ چائے کا دور چلا تو کہنے لگے۔ "ایک ہلکا پھلکا اکاؤنٹ میرے پاس بھی کھول دیں کہ ملاقات کا بہانہ بنا رہے' آنا جانا لگا رہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکرائے پھر

ذرا میری طرف جھکتے ہوئے راز دارانہ لہجے میں بولے۔

''آپ اس لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے کہیں پسند تو نہیں کرلیا اسے؟'' پھرانہوں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا' جونظریں جھکائے اپنے کام میں منہمک تھی۔

''پسند یاناپسند کی بات نہیں ہے پہلے یہ بتائیں یہ محترمہ ہیں کون؟'' میں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کا نام ستارہ ہے' بہت اچھی لڑکی ہے اس سے آگے باقی بات آپ کسی وقت خود کرلیجیے۔'' میں نے جانا' خاں صاحب بات کو بخوبی ٹال گئے تھے وہ اس کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے گریزاں نظرآئے۔

خاں صاحب کے پاس بیٹھے کافی دیر ہوچلی تھی ان سے اجازت چاہی تو کہنے لگے۔

''آپ آئے ہیں تو مجھے میکلوڈ روڈ پر گزرا وقت یادآنے لگا ہے'یار کیادن تھے وہ بھی۔''

''جی ہاں ٹھیک کہا آپ نے' واقعی وہ بہت اچھے دن تھے۔'' میں نے ان کی تائید کی تو بولے۔

''یار یہاں آنے میں بخل نہ کرنا' اب آپ کو بلانے کے لیے مجھے فون نہ کرنا پڑے۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی' میں ان شاء اللہ جلد آنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔'' خاں صاحب سے جلد ملنے کے وعدے کے ساتھ اجازت چاہی اور ستارہ کی میز کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے دفتر کو چل دیا۔

دو ہفتے بعد میں نے خاں صاحب کے پاس اپنا اکاؤنٹ کھلوادیا۔اب ایک تسلسل سے ہال برانچ میں جانا رہتا۔کبھی کام کی نوعیت ایسی ہوتی کہ خود جانا ہوتا' کبھی ستارہ کی کشش مجھے لے جاتی۔ایک روز ایک کام سے ہال برانچ جانا ہوا۔

اس دن یہ خواہش دل میں جاگزیں تھیں کہ اگر موقع میسر آیا تو ستارہ سے ملوں گا اور یہ بات جاننے کی کوشش کروں کہ وہ بینک کی سروس میں کیوں دلچسپی رکھتی ہے۔ بینک میں داخل ہوا تو راہداری سے گزرتے' سیدھا ستارہ کی میز کے سامنے جاکر رکا۔ میں نے دیکھا اس وقت اس کے پاس زیادہ کام نہ تھا۔ وہ ایک فائل کی ورق گردانی کررہی تھی شاید اسے کسی ضروری کاغذ کی تلاش تھی۔

السّلام علیکم کہنے کے بعد میں بلاجھجک اس سے مخاطب ہوا۔

''مس ستارہ! آپ ایسا حسین چہرہ'اس جگہ پر کچھ سمجھ نہیں پایا۔'' اچانک میری طرف سے ایک غیرمتوقع سوال پاکر حیران ہوتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔اس کے ہنستے چہرے پر یکسر تبدیلی کے آثار ہویدا ہوئے۔وہ اداس نظرآنے لگی تھی۔آہستگی سے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''بیٹھیے۔''

''جی' بہت شکریہ۔'' کہتے ہوئے میں اس کے سامنے رکھی ہوئی نشست پر بیٹھ گیا۔میں نے اس کی طرف دیکھاوہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

وہ اپنی نشست کو سیدھا کرتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئی' کہنے لگی۔

''میرے ابو سرکاری ملازم تھے' وہ ایک اعلیٰ عہدے پرفائز تھے وہ ہم سب بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہمارے لیے ان کے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل

کریں تاکہ معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرسکیں' وہ ہمارا مستقبل تابناک دیکھنے کے خواہاں تھے۔گھر کا نظام بہت اچھا چل رہا تھا' ہم ایک آسودہ حال زندگی بسر کررہے تھے کہ ایک دن......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے اس کی طرف دیکھاوہ خاموش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''مس ستارہ! پلیز کہیے آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔'' میں نے اسے بات جاری رکھنے کو کہا۔وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''ایک دن ہم پر قیامت گزر گئی۔ ہمارے پیارے ابو ایک اندوہناک حادثہ میں ہم سے جدا ہوگئے۔ ان کے جانے سے ہماری دنیا اندھیر ہوگئی' ہم بے آسرا بے سہارا ہوگئے۔'' کرب سے اس کی زباں لڑکھڑانے لگی' زیرلب الفاظ ٹوٹنے لگے تھے۔اس کا دکھ میرے دل میں سرایت کرنے لگا' شدت غم نے مجھے گھیر لیا تھا۔وہ تھوڑی دیر بعد رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

''ہم چار بہن بھائی ہیں' میں ان میں بڑی ہوں۔ ہم اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں رہتے ہیں۔'' وہ مجھ سے ایسے مخاطب تھی جیسے ہم پرانے شناسا ہوں۔

یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دے گی جو شاید وہ پہلے کسی سے نہ کہہ پائی تھی۔ میں اس کی باتوں میں اپنا پن محسوس کرنے لگا تھا اور وہ میرے چہرے میں جھلکتے خلوص کو دیکھ رہی تھی۔وہ اپنی روداد کہتے ہوئے بولی۔

''اس دوران ہمارے چچا ہماری مدد کو آئے لیکن میں ارادہ کرچکی تھی کہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا بوجھ خود اٹھاؤں گی۔ کالج کے زمانے میں حصول تعلیم کے ساتھ میں اسپورٹس میں بھی حصہ لیتی تھی۔ایم اے انگلش کے ساتھ اسپورٹس میں میرا نام میرے کام آیا' مجھے بینک میں جاب مل گئی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''مس ستارہ پلیز حوصلہ نہ ہاریے۔'' میں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹشو پیپر سے بھیگی آنکھیں صاف کرنے لگی تھی۔

''معاف کیجیے' میں نے آپ آزردہ کردیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں خاموشی سے اٹھ کر خاں صاحب کے پاس چلا گیا' میں خود بھی افسردہ ہوگیا تھا۔خاں صاحب میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ستارہ سے مل کرآئے ہیں اور افسردہ ہیں۔'' میں نے ستارہ کی کہانی من وعن کہہ دی۔وہ سن کر خاموش ہوگئے' تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔

''ستارہ ایک خوددار لڑکی ہے' کیا کہیں گردش زمانہ اس کو یہاں لے آئی۔ وگرنہ یہ جگہ اس کے شایان شان نہیں۔'' میں خاموش رہا' خاں صاحب کی بات نے بھی مجھے رنجیدہ کردیا تھا۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خاں صاحب سے اجازت چاہی اور پریشاں خاطر رہنے دفتر کو چل دیا۔

ستارہ کی کہانی' ستارہ کی زبانی سننے کے بعد مجھے اس سے ہمدردی ہوچلی تھی۔وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ نہایت شائستہ اور کم آمیز لڑکی تھی۔ میں اس کی ذہانت' متانت اور اس کے سراپا سے بہت متاثر تھا۔اب میں کبھی کبھی اس کو اپنانے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

جاپانی ساخت کی نئی موٹر سائیکلوں کی فروخت میرا کاروباری سلسلہ تھا۔ میں اپنے برانڈ کی سیل بہتر بنانے کی غرض سے بینک کی مختلف برانچوں میں جایا کرتا تھا۔ بینک کے اسٹاف کے افراد سے رابطے میں رہتا' وہ بینک سے موٹر سائیکل کی خرید کے لیے قرضہ حاصل کرتے تھے جو میرے لیے بہترین خریدار ثابت ہوئے۔

اکثر لوگ مجھے بینک کی مختلف برانچوں میں پاکر بینک کا ملازم تصور کرتے تھے حالانکہ اس میں کوئی صداقت نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بینکوں میں' بینک منیجر' سیکنڈ آفیسر اور دیگر اسٹاف ممبرز سے گہرے مراسم کی وجہ سے میں نصف بینکنگ کو سمجھنے لگا تھا۔

میں اکثر کسی نہ کسی برانچ میں' کسی نہ کسی اسٹاف ممبر کی میز پر بیٹھا اس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ مال برانچ میں اکثر میرا جانا رہتا۔ میں جب اس بینک کے ہال کمرے میں داخل ہوتا' اکثر نظریں میرا پیچھا کرتیں لیکن میں ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھا ستارہ کی میز کے پاس جاکر رکتا۔ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہرتا۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا' خیریت دریافت کرتا پھر خاں صاحب کے پاس چلا جاتا۔

ایک روز ستارہ کے پاس بیٹھے میں ایک ڈیمانڈ ڈرافٹ کے پیپرز چیکنگ مشین سے ڈرافٹ کی رقم کا اندراج کررہا تھا کہ ایک خیال گزرا۔ سوچا آج اس سے دل کی بات کہہ دوں۔

''مس ستارہ!'' میں اس سے مخاطب ہوا۔

''جی۔'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان میں کہا۔

''کہیے! کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اس نے دلچسپی ظاہر کی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان خاموش رہی۔

''آپ کچھ کہنے لگے تھے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی میں پھر بھی خاموش رہا۔

اس اثنا میں ایک صاحب ستارہ سے ڈیمانڈ ڈرافٹ بنانے کا تقاضا کرنے لگے۔ اب میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا' بادل نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان کہی بات دل میں لیے خاں صاحب کے پاس چلا گیا۔ خاں صاحب مجھے اپنے سامنے پاکر بولے۔

''دنوں بعد آتے ہیں' جلدی جلدی آیا کریں۔''

''خاں صاحب آپ سے ملنے کو کس کافر کا جی نہیں چاہتا۔ جب بھی آپ سے ملنے کا ارادہ کرتا ہوں' کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی ہے۔ ویسے بڑا ہی کم ظرف اور کم نصیب ہوگا' وہ شخص جو آپ کے ساتھ گزرے لمحات کو فراموش کردے۔ قسم لے لیں میں تو آپ سے ملنے کے مواقع ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔'' خاں صاحب مسکرائے۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپسی کے لیے اٹھنے لگا تو بولے۔

''اے میاں کہاں جاتے ہیں' چائے تو پیتے جائیں۔''

''آج چائے کی معذرت ہے' مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' کہتے ہوئے رخصت چاہی اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

خاں صاحب میری ستارہ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کو محسوس کررہے تھے لیکن خاموش تھے۔ بے تکلف ہونے کے باوجود وہ ستارہ کے بارے میں

محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ وہ میرے ساتھ اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی خیال آرائی نہ کرتے بس وہ تھوڑی سی دیر کو میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرادیتے تھے۔

اب میکلوڈ روڈ برانچ میں خاں صاحب کی جگہ بٹ صاحب نے چارج لے لیا تھا' ان کی پوسٹنگ یہاں پر شادمان برانچ سے ہوئی تھی۔ میرے ان کے ساتھ گھریلو مراسم تھے۔ چند برس پہلے ان کی والدہ محترمہ نے میرے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی تھی۔ میں نے ستارہ کے روبرو دل میں نہاں اپنی آرزو کے اظہار کی کوشش تو کی تھی لیکن شومئی قسمت بات لبوں پر آتے آتے رہ گئی تھی۔ میں اظہار نہ کرپایا تھا اس لیے اب اس نازک پہلو پر بات کرنے کے لیے بٹ صاحب کو ترجیح دی۔

ایک روز میں ان کے گھر چلا گیا' ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کردیا کہ میں ستارہ سے شادی کے بارے میں سوچتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہے' ویسے بھی میں اب اس کو سمجھ چکا ہوں' میرا دل گواہی دیتا ہے وہ میرے لیے بہترین رفیق حیات ثابت ہوگی۔

میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے' پھر کہنے لگے۔

''ہاں! میں بھی ستارہ کو جانتا ہوں' وہ بہت اچھی لڑکی ہے اگر بات بن جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس اثناء میں بھابی چائے کی ٹرالی لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ اب بٹ صاحب نے ان کو بھی اس گفتگو میں شریک کرلیا تھا۔

وہ ہمارے پاس بیٹھ گئیں' جب انہیں ہمارے درمیان ہونے والی بات کا علم ہوا تو بٹ صاحب سے کہنے لگیں۔

''آپ مسز فیاض سے بات کریں' وہ بینک میں ایک بااثر خاتون ہیں وہ اس سلسلے میں ہمارے لیے معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔'' بیگم صاحبہ سے صائب مشورہ پاکر بٹ صاحب بولے۔

''میں آج ہی مسز فیاض سے رابطہ کرتا ہوں۔'' بھابی مسکرائیں' کہنے لگیں۔

''بٹ صاحب جلدی کیجیے' کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' بھابی کی سفارش پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس گفتگو کے بعد میں خاصا مطمئن تھا۔

حرف حرف موتی

☆ اپنے آپ کو اعلیٰ ظرف بناؤ۔ ایک سایہ دار درخت کی طرح جو خود تو دھوپ میں جلتا رہتا ہے مگر دوسروں کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتا ہے۔

☆ باہم تعلق میں رویے الفاظ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

☆ رشتے تب تک اہم نہیں ہوتے جب تک ہم انہیں اہم نہ سمجھیں۔

☆ محبت ان سے رکھو جو نیکی کرکے فراموش کردیں اور کوئی قصور دیکھیں تو اسے معاف کریں۔

☆ آنکھوں کی حیاء دل کی سرکشی کو سنبھال لیتی ہے۔

☆ مسکراہٹ ایسا فن ہے جو آپ کی مقبولیتمیں اضافہ کرتا ہے۔

☆ زندگی میں قول وفعل میں تضاد رکھنے والا شخص کبھی آپ سے مخلص نہیں ہوسکتا۔

☆ جہاں بھی جاؤ اپنی خوشیاں چھوڑ آؤ تاکہ لوگ ہمیشہ تمہیں یاد کریں۔

(زین الدین.....کراچی)

میں نے خوش دلی سے بٹ صاحب اور بھابی کا شکریہ ادا کرتے' رخصت چاہی اور مستقبل کی خوشیوں کا تصور لیے واپس چلا گیا پھر میں بے چینی سے بٹ صاحب کے فون کا منتظر رہا۔

دو روز بعد بٹ صاحب کا فون آیا' کہنے لگے۔

''تھوڑی دیر کے لیے آجائیں' آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' میں نے محسوس کیا آج ان کی آواز پر جوش نہیں تھی۔

وہ دھیرے سے بولے تھے' ان کے اس لہجے میں بات کرنے سے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے تھے۔ مجھے اس بات کا ادراک بخوبی ہو چلا تھا کہ آج بٹ صاحب سے ہونے والی ملاقات کا رنگ کیا ہو سکتا ہے پھر بھی میں نے اپنی سوچ کو مثبت رکھا۔

میرے دفتر سے بینک کا فاصلہ پانچ منٹ کا تھا' جب میں بینک پہنچا وہ میرے منتظر تھے۔ ٹیبل پر چائے لگ چکی تھی' کہنے لگے۔

''بیٹھیں' پہلے چائے لیں پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا' وہ سنجیدہ تھے۔ چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''مسز فیاض سے میرا رابطہ ہوا تھا' لیکن آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

کہنے لگے۔ ''مسز فیاض نے مجھے بتایا کہ مس ستارہ کی والدہ سے بات کرنا لاحاصل ہے' کیوں کہ ستارہ اپنے عم زاد سے منسوب ہو چکی ہے۔'' یہ خبر سنتے ہی میرے چہرے پر اداسی چھا گئی' میں خاموش ہو گیا تھا۔ بٹ صاحب مجھے مغموم پا کر بولے۔

''میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن یہ جان رکھیں کہ یہ جہاں' یہ عالم دنیا' کارخانۂ قدرت ہے۔ ضروری نہیں یہاں انسان کی ہر آرزو پوری ہو جائے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں وہ اس سے بہتر کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''بٹ صاحب یہ سب آپ کی محبت ہے' جو آپ کی زباں سے ایسے خوب صورت الفاظ سننے کو ملے آپ کی پرخلوص کاوش کے نتیجے میں اگر کامیابی نصیب نہیں ہوئی تو بھلا اس میں آپ کا کیا دوش...... یہ سب قدرت کے رنگ ہیں۔'' میں نے احسان مندی سے ان کی طرف دیکھا۔

اب میرا بٹ صاحب کے پاس بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا' میں نے ان سے اجازت چاہی اور بجھے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ واپس دفتر چلا آیا۔

اب میرا مال برانچ میں جانا کم ہو گیا تھا' پھر بھی گاہے بگاہے وہاں چلا جاتا تھا۔ خاں صاحب سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتے۔

''آپ نے تو یہاں آنا ہی چھوڑ دیا ہے' ہمیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ ہم سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے؟''

میں بھلا ان کی اس بات کا کیا جواب دیتا کسی نہ کسی مصروفیت کا بہانہ بنا دیتا لیکن میری بہانہ سازی سے ان کی تشفی تو نہ ہو پاتی' وہ خاموش رہ جاتے تھے۔

ایک روز خاں صاحب سے ملنے کے لیے بینک گیا جب میں ستارہ کی میز کے قریب سے گزرتے ہوئے خاں صاحب کے دفتر میں داخل ہونے لگا تو ایک مانوس آواز میری سماعت سے

ٹکرائی' کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا ستارہ اپنے ہاتھوں میں کارڈ تھامے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں رک گیا تو وہ مسکرا کر کارڈ میری طرف بڑھا کر بولی۔

''میری شادی ہے آپ آئیے گا ضرور۔'' میں نے اس کو شادی کی مبارک باد اور کارڈ وصول کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے دیکھا آج وہ بہت خوش تھی' مجھے کارڈ دے کر وہ اپنی نشست پر چلی گئی اور میں خاں صاحب کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ سرخ رنگ کارڈ میرے ہاتھوں میں پا کر خاں صاحب مسکرائے' کہنے لگے۔

''ستارہ نے دیا ہے' ہاں بھئی اگلے ماہ اس کی شادی جو ہے۔'' پھر کہنے لگے۔ ''دعوت ملی ہے تو ضرور آئیے گا' اس ہنگامے میں ہم بھی کہیں ایک طرف بیٹھ کر گپ شپ لگائیں گے۔'' پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا لیکن آج میں اس قہقہے میں شریک نہ ہو سکا تھا۔

ستارہ سے کارڈ وصول کرتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کو میری ناکام آرزو کا علم نہیں تھا ورنہ اس کو اس بات کا علم تھا کہ اس نے مجھے کس ویرانے میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔

ماہ ستمبر کے ایک اداس دن ستارہ کی شادی ہو گئی جس دن اس کی شادی تھی اس روز میری حالت دیدنی تھی۔ میرے اندر خوشی اور اداسی کا عجب امتزاج تھا' کبھی خوشی سے دل کھل اٹھتا' کبھی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔ مجھے اس کیفیت سے باہر آنے میں ایک عرصہ لگا۔

اب میں نے مال برانچ جانا چھوڑ دیا تھا' اس دوران خاں صاحب مجھے یاد کرتے رہتے۔

خوشبو ہے ان باتوں میں

حسن' خوشبو نغمہ اور زیب و آرائش الگ الگ نام ہیں لیکن حقیقت صرف ایک ہے یعنی عدل و اعتدال۔

(ابوالکلام آزاد)

خاموشی اختیار کر کے دوسروں کی نگاہ میں احمق بننا' بہتر خاموشی توڑ کر احمقی کا ثبوت دینے سے بہتر ہے۔

(آسکر وائلڈ)

جو مسائل انسان نہ حل کر سکے قدرت انہیں حل کرتی ہے۔

(ڈاکٹر علامہ محمد اقبال)

علم کو روٹی کمانے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ علم اپنا صلہ ہے۔

(حکیم اقلیدس)

دوسروں کی خوشی اور آسودگی پر حسد نہ کرو۔ اس لئے کہ ان کی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔

(حضرت ادریس علیہ السلام)

لگن کے بغیر کسی میں بھی عظیم ذہانت پیدا نہیں ہوتی۔

(ارسطو)

(صبا نواز بھٹی...... چک نمبر 11' سانگھڑ)

خیریت دریافت کرتے اور نہ آنے کا شکوہ کیا کرتے۔ ایک دن کہنے لگے۔

''آپ ستارہ کی شادی پر بھی نہیں آئے' میں آپ کو تلاش ہی کرتا رہا۔'' میں ان کے اس سوال کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکا تھا' خاموش رہا۔ میں ان سے ملنے کا وعدہ تو کر لیتا تھا لیکن اسے پورا کرنا مشکل تھا' مختصر یہ کہ میں ان کے پاس نہ جا سکا تھا۔

تین ماہ بعد...... ایک روز میں خاں صاحب سے ملنے چلا گیا' خاں صاحب مجھے دیکھتے ہی بولے۔

''میں ابھی آپ کو فون کرنا چاہ رہا تھا' اچھا ہوا

جو خود ہی چلے آئے۔'' پھر کہنے لگے۔ '' کیسے کہوں بات کچھ ایسی ہے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولے۔

'' کیا ہوا خاں صاحب؟'' میں نے متجسس ہوتے ہوئے پوچھا۔

کہنے لگے۔'' ستارہ شادی کے چار ماہ بعد ہی چل بسی۔''

'' کیا کہہ رہے ہیں خاں صاحب؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

یہ خبر میرے لیے ناقابل یقین بھی تھی اور ناقابل فہم بھی۔

'' ٹھیک کہہ رہا ہوں میرے دوست۔'' انہوں نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'' اسے کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

'' اس کو کینسر تھا' بلڈ کینسر۔'' یہ کہتے ہوئے خاں صاحب کی آواز بھرا گئی تھی' دھیمی آواز میں بولے۔ '' اللہ مغفرت کرے' جانے والی بہت اچھی تھی۔'' میں نے آبدیدہ ہوتے ہوئے خاں صاحب سے کہا۔

'' کیا ایسے چہرے بھی مٹی کے نیچے چلے جاتے ہیں؟'' دفتر میں خاموشی چھا گئی۔

میں اس کی شادی کے روز اس بات پر نہ رویا تھا کہ وہ مجھے نہ مل سکی تھی لیکن آج یہ خبر پا کر غم کے گہرے بادل چھا گئے۔

برسات ہونے لگی' تن من بھگونے لگی۔ اب میرا خاں صاحب کے پاس بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ ان سے اجازت لے کر' یاس میں ڈوبا' دفتر سے باہر نکل آیا۔ ستارہ کی میز کے سامنے سے گزرتے اس کی خالی نشست کو حیرت سے دیکھتے بینک کے مین دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھول کر جب میں سیڑھیاں اترنے لگا تو یاد آیا کہ میں نے اس کو آخری بار ایک ماہ پہلے ان ہی سیڑھیوں پر دیکھا تھا۔

دسمبر کا ایک سرد دن تھا' سردی اس دفعہ دسمبر کے اوائل ہی میں عروج پر تھی۔ ٹھنڈی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں بینک کے مین دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا' میں نے دیکھا۔ ستارہ گہرے براؤن رنگ کی شال اوڑھے اپنے میاں کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی میرا دل بیٹھنے لگا وہ کملائی گئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے قریب پا کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی لیکن وہ ڈوبتی نظروں سے مجھے دیکھتے سیڑھیاں اترتی گئی۔

میں سوچنے لگا' اسے کیا ہو گیا یہ ستارہ کا چہرہ تو نہیں۔ اس کو ایک نظر دوبارہ دیکھنے کی خواہش کے باوجود میری نظریں اس کی طرف نہ اٹھ سکی تھیں۔ بہر کیف' آمنے سامنے پاس آتے ہوئے قریب سے گزرتے' قربت کے لمحوں نے ہمارے درمیان فاصلے اور بڑھا دیئے تھے۔ میں بینک کے مین دروازہ کے اندر داخل نہ ہو سکا تھا' الٹے قدموں واپس چلا آیا۔

میں نے سیڑھیوں سے اتر کر انہیں تلاش کیا' وہ دونوں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دور جا چکے تھے۔

ہماری راہیں جدا تو پہلے ہی ہو چکی تھیں لیکن فاصلے صدیوں پر محیط ہو جائیں گے' اس کا تو گماں بھی نہ تھا۔

قسط نمبر 14

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ ہنر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ اتنی جلدی یہاں پولیس آ جانے کی صرف دو وجوہات ہو سکتی تھیں یا تو پولیس ان کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی یا پھر مہر سکندر اور پولیس کے درمیان پہلے ہی رابطہ تھا۔ جسپال نے مہر سکندر کے چہرے پر دیکھا، جہاں خباثت بڑھ گئی تھی۔ اس نے ان تینوں کی طرف دیکھا اور پرجوش لہجے میں بولا۔

''بدر تو پھر کیا کہتے ہو؟''

''میں تو کہتا ہوں، ہمیں جانے دو۔'' بدر نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس پر مہر سکندر بولا۔

''پولیس آ گئی ہے، اس کے ساتھ جانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ، اگر پولیس کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو رُکنا پڑے گا، پھر میں تجھے تحفظ دوں گا اور یہ تحفظ میری شرائط پر ہو گا، بولو کیا کہتے ہو، جانا ہے یا رُکنا ہے؟''

ایک دم سے خاموشی چھا گئی، جسے لمحہ بھر بعد تانی نے اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں توڑا

''یہ پاگل ہیں، انہیں کیا سمجھ مہر جی، آپ میرے ساتھ بات کریں۔''

مہر سکندر نے تانی کی طرف خوشگوار حیرت سے دیکھا، پھر ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''کہا نا یہ لڑکی زیادہ سمجھ دار ہے۔ چل لڑکی تیرے صدقے انہیں معاف کرتا ہوں، انہیں لے جا اندر اور سمجھا، میں پولیس والوں کو واپس بھیجتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے مہر صاحب!'' تانی نے کہا اور جسپال کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب چل دی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بدر کو پکڑا اور چلتی چلی گئی۔ تبھی انہیں مہر سکندر کی آواز آئی، وہ اپنے اس ملازم کو کہہ رہا تھا

''انہیں کہو، واپس جائیں، جب میں انہیں بلاؤں، تبھی آئیں۔''

''جی سائیں۔''

وہ تینوں ڈیرے کی پچھلی طرف بنے لان میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ان سے کافی دور سیکورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ بظاہر وہاں سے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن جسپال اور تانی یہاں سے نکل جانے کا راستہ سوچ چکے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں گے۔ بدر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''تانی! کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں۔''

''میں دشمن کو معاف کر سکتی ہوں، مگر منافق اور دھوکے باز کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اس مہر سکندر نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔'' اس نے غصے میں کہا تو جسپال بولا۔

"ہمارے ساتھ نہیں، بدر کے ساتھ۔"

"لیکن اب تو ہمارے ساتھ ہو گیا نا۔" تانی نے دبے دبے جوش سے کہا تو بدر سرد لہجے میں بولا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔"

"تُو یہاں پر آیا ہی کیوں تھا، کوئی دوسری جگہ نہیں تھی کیا؟" جسپال نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کچھ چوہے ہیں، جنہیں بلوں سے باہر لانا ہے۔ یہ مہرل شاہ کے لیے ہی مجھ سے رابطے میں تھا۔ بڑی آفر کی تھی اِس نے لیکن اب اس نے گیم بدل دی ہے، اس کا مطلب ہے میرا شک درست تھا۔" بدر نے الجھتے ہوئے کہا۔

"شک مطلب، تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"اب مجھے سمجھ آ رہی ہے۔ وہ اب مہرل شاہ کے سامنے اچھا بن جائے گا کہ اس نے مہرل شاہ کی جان بچائی۔ اس احسان کے عوض وہ بہت ساری مراعات لے گا لیکن مجھے یہ نہیں لگتا...... ابھی اسے مزید سمجھنا ہوگا۔" بدر غصے میں بولا۔

"تم جتنا مرضی سمجھ لو، وہ مہرل شاہ کے ساتھ جو بھی کرے۔" تانی نے کہنا چاہا تو بدر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"ہاں وہ مہرل شاہ کے ساتھ جو کچھ بھی کرے، اسے مار دے یا اس پر احسان کرے، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کے دماغ میں کیا ہے، میں یہ بھی نہیں جانتا، مگر اتنا معلوم ہے کہ ہمارے بارے میں وہ اچھا قطعاً نہیں سوچ رہا ہے۔" جسپال نے کہا۔

"وہ جو سوچتا ہے، اسے سوچنے دو، ہم نے جو کرنا ہے، وہ ہم کریں گے، یہ اب مجھ پر چھوڑ دو۔" تانی نے کہا تو جسپال مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن بدر، تم اسے پہچان ہی نہ سکے کہ یہ کیسا بندہ ہے؟"

"یہ اب تک میرے ساتھ ٹھیک چل رہا تھا اور ہم یار وہ منافقت ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔ خیر دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"وہ بلوچ، وہ کدھر ہے، اس کا کچھ پتہ ہے کہ نہیں؟" جسپال نے کہا۔

"اگر ابھی تک ہم ہیں تو وہ بھی ہوگا۔" بدر نے غصے بھری بے بسی سے کہا تو چند لمحوں کے لیے ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ اندر سے ایک ملازم آیا اور انہیں لے کر پھر سے اندر چلا گیا۔ مہر سکندر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ان تینوں کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا بلکہ انہیں چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو یہاں پابند نہیں کیا جا سکتا۔ تم یا تو مر جاؤ گے، یا پھر میرے بندوں کا خون خرابہ کر کے نکلنے کی کوشش کرو گے۔ مگر میں کہتا ہوں تم معزز مہمانوں کی طرح یہاں رہو، مجھے وزارت ملنے تک انتظار کرو، مہرل شاہ کو مارنے کی ضد نہ کرو۔ یا پھر اسے چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

"جیسے آپ کہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔" تانی نے کہا اور گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ملازم کی طرف دیکھا۔ جس نے ان دونوں کی جانب بڑھتے ہوئے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ بدر اور جسپال اس کے ساتھ چل دیئے۔ جبکہ تانی خود جا کر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ مہر سکندر ایک دم سے خوش ہو گیا۔ اس نے بڑے پیار سے تانی کے دائیں گال پر ہاتھ پھیرا اور پھر پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"تم بہت سمجھ دار ہو، جب تک ادھر رہو، ہمارے ساتھ عیش کرو اور جب جانا چاہو تو......"

اس پر تانی نے تڑپ کر کہا۔

"نہیں، میں کہیں نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کے

ں رہنا چاہتی ہوں اور اگر آپ نہ بھی رکھیں تو کم از کم ں دونوں سے میری جان چھڑوا دیں، میں ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں ان سے بہت دور چلے جانا ہتی ہوں۔"

"کیا مطلب......؟" مہر سکندر نے چونکتے ہوئے چھا تو وہ رُو دینے والے انداز میں بولی۔

"میں ان سے بہت دور چلے جانا چاہتی ہوں، ایسی گہ۔ جہاں ان کا سایہ بھی نہ پڑے۔ بس آپ میری اتنی کر دیں، میری ان سے جان چھڑوا دیں، تا کہ میں ان ے آزاد ہو جاؤں۔"

"جیسا تم چاہو، ویسا تو میں کروں گا ہی، لیکن ایسا وں، کیسے تم ان کے ہتھے چڑھ گئیں؟" مہر سکندر نے ی سے پوچھا تو وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے، میں آپ کو پھر بعد میں ناؤں گی۔" تانی نے روہانسہ ہوتے ہوئے کہا تو وہ پیار سے بولا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے، ابھی تم فریش ہو جاؤ۔ آرام کرو میرے بیڈ روم میں پھر بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک دم سے تیار ہو گئی۔ تبھی اس نے دور کھڑے اپنے ایک ملازم کو اشارے سے بلایا اور ںی کو اپنے بیڈ روم میں لے جانے کو کہا۔ تانی مسکراتی ںی اس کے ساتھ چل دی۔ مہر سکندر اس کی طرف لچائی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ مہر سکندر کے ڈیرے پر سکوت طاری تھا۔ جسپال اور بدر نجانے کہاں تھے۔ بلوچ کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ سیکورٹی گارڈز کے سوا کوئی دوسرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مہرل شاہ کا بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ڈیرے پر ہی ہے یا اسے وہاں سے کہیں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہاں پر ایسا سکوت طاری تھا، جیسے یہاں کبھی کوئی ہنگامہ ہوا نہیں تھا۔ ایسے وقت میں تانی مہر سکندر کے بیڈ روم میں تھی۔ وہ خوب سوئی تھی۔ اسے

کچھ دیر پہلے جگا کر بتا دیا گیا تھا کہ مہر صاحب آنے والے ہیں۔ وہ تیار ہو جائے۔ یہ پیغام دینے والا اس کے لیے کپڑے اور کافی کا سمیٹکس بھی رکھ گیا تھا۔ تانی انہیں چند لمحے دیکھتی رہی اور نیند کا خمار اتارتی رہی، پھر کپڑے اُٹھا کر ملحقہ باتھ روم میں چلی گئی۔

کافی وقت گذار کر جب وہ بیڈ روم میں آئی تو وہی سناٹا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود کو سنوارتی رہی۔ جب تیار ہو چکی تو اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ انہی لمحات میں دروازے پر دستک ہوئی اور وہی ملازم اندر آ گیا

"مہر سائیں آپ کو باہر یاد کر رہے ہیں۔"

"اچھا میں آتی ہوں۔"

"آپ کو کیا پتہ کہ کدھر جانا ہے، میں لے چلتا ہوں نا آپ کو۔" اس نے مودب سے لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ وہ اسے باہر لان میں لے گیا، جہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مہر سکندر بید کی کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد بھی ایسی ہی کرسیاں پڑی تھیں۔

"آؤ، آؤ سوہنا، آؤ، بیٹھو۔" اس نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کے ساتھ ہو کے بیٹھ گئی اور بڑی ادا سے بولی۔

"میں نے سوچا تھا کہ آپ اُدھر بیڈ روم میں ہی آؤ گے۔"

"جلدی کاہے کی ہے، ابھی بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، کوئی تعارف کرتے ہیں، اب دیکھو نا سوہنا، مجھے تمہارے نام ہی کا پتہ نہیں ہے۔" اس نے سوقیانہ انداز میں کہا۔ تانی نے ایک ادا سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تانی نام ہے میرا اور میں بھارت کے شہر ممبئی سے تعلق رکھتی ہوں۔"

اس کے یوں کہنے پر مہر سکندر ایک دم سے چونک گیا اور سیدھے ہوتے ہوئے بولا۔

"تم انڈیا کی ہو، ممبئی سے، میرا مطلب ہے، وہاں سے کہاں؟"

"ہم وہاں جوہو کے علاقے میں رہتے تھے۔ میری قسمت خراب کہ میں کمانے کی غرض سے دوبئی چلی گئی۔ میں بہت اچھی کمپیوٹر گرافکس ہوں۔ بس وہیں ان کے ہتھے چڑھ گئی، یہ مجھے یہاں لے آئے۔" تانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"غیر قانونی طور پر لائے ہوں گے نا۔" اس نے تصدیق چاہی۔

"بالکل، یہ جسپال ہے نا اس سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ ہم کافی ملتے تھے کبھی کسی پارک میں، کبھی کسی ہوٹل میں خوب موج کرتے تھے، ایک رات اس نے مجھے ایک فیری میں لے جانے کی آفر کی کہ وہاں ہلا گلا کریں گے، کھائیں پئیں گے، موج کریں گے۔ میں اس کے ساتھ فیری میں چلی گئی۔ وہ رات تو موج میں گزری، لیکن صبح ہوتے ہی ماحول بدل گیا تھا۔ میں کراچی میں تھی اور تب سے ان کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ آپ مجھے ان سے کسی طرح......" اس نے کہنا چاہا تو مہر سکندر اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"اب تم میری پناہ میں آگئی ہو، اب یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تم یہ بتاؤ، تمہارے کاغذات، مطلب پاسپورٹ وغیرہ کدھر ہیں؟"

"وہیں دوبئی میں ہیں۔" تانی نے تیزی سے کہا۔

"مطلب اب اگر تم دوبئی جانا بھی چاہو تو غیر قانونی طور پر جانا ہوگا۔" مہر سکندر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے، مجھے وہیں جانا ہے۔ لیکن میں بہت جلد وہاں سے بھارت چلی جاؤں گی۔" تانی نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

"یار تم تو بڑے کام کی چیز ہو۔ اگر ہم تمہیں بھارت ہی پہنچادیں تو؟"

"اس کا کیا فائدہ ہوگا، میرے سارے کاغذات تو؟"

"اوئے چھوڑ وان کو، یہ سب بن جاتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" تانی نے پوچھا۔

"ابھی ممکن کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپ جیب سے سیل فون نکالا اور چہرے پر خبیثانہ مسکرا کر پوچھا۔

"دوبئی کا کوئی فون ہے تو بتاؤ، وہاں سے سار کاغذات منگوا لیتے ہیں۔ کوئی دوست، سہیلی، کوئی کی دوست؟"

بلا شبہ وہ اس کے بیان کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ تا نے ایک لمحہ کو اپنے ماتھے پر انگلیاں پھیریں اور کرتے ہوئے ایک نمبر بتایا۔ مہر سکندر نے وہ نمبر ا کیا اور پش کر دیا۔ دوسری طرف کال جانے لگی۔ ر ہوتے ہی اس نے اسپیکر آن کیا اور اور فون اسے تھما دوسری طرف سے کوئی مرد ہیلو ہیلو کہہ رہا تھا

"میں تانی بات کر رہی ہوں، تم احسان الحق با رہے ہو نا۔"

"ہاں ہاں، میں احسان الحق ہی بات کر رہا ہو مگر تم بتاؤ تم کہاں ہو، کدھر غائب ہو، یہ نمبر تو پاکستان ہے۔ کیا تم بھارت چلی گئی تھیں، یہ کیا چکر ہے؟"

"میں بہت بری طرح پھنس چکی ہوں۔ وہ بھی نا، میں کیا بتاؤں، قید میں ہوں۔ ایک در بندے سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ اسی کے فون بات کر رہی ہوں۔ تم ایک کام کر دو پلیز۔" تانی نے گیر لہجے میں کہا تو اس نے پوچھا۔

"بولو، بتاؤ۔"

"کسی طرح میرے فلیٹ چلے جاؤ اور مالنی میرے کاغذات لے کر مجھے پوسٹ کر دو۔ یہاں سے نکلنا ہے۔ میں پھنسی ہوئی ہوں۔" تانی بتایا تو دوسری طرف سے پوچھا گیا

"اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔ اپنا ایڈریس بتا

ری طرف سے پوچھا گیا تو تانی نے مہر سکندر کو ے سے پوچھا کہ کیا بتاؤں۔ اس نے بات کو گول جانے کا اشارہ کیا تو وہ بولی۔

"میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتی، جب تم کاغذات لو تو اسی نمبر پر رابطہ کرنا۔" تانی نے کہا

"او کے۔ میں آج تو نہیں کل جا سکوں گا۔" اس نے کہا تو تانی بولی۔

"جیسے بھی ہو پلیز میرا یہ کام کر دینا۔" یہ کہہ کر اس الوداعی کلمات کہے اور فون بند ہوگیا۔

مہر سکندر کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ اسے آگیا تھا کہ تانی نے جو بھی کہا ہے وہ سچ کہا ہے۔ لیے وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"خیر تم ادھر رہو میرے پاس، کرلیں گے سب کچھ، ان سب سے جان چھڑاتے ہیں تو پھر سب ٹھیک جائے گا۔" مہر سکندر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"کن سے جان چھڑانی ہے مہر صاحب؟" تانی پوچھا۔

"او یہی جسپال اور بدر، میرا پلان یہ ہے کہ انہیں ختم یں تو ان کی سر دردی ختم، وہ ڈرائیور بے چارہ بھی ان ساتھ مارا جائے گا۔ رہا مہرل شاہ، تو دیکھتے ہیں اس ساتھ کیا سودے بازی ہوتی ہے یا اسے بھی مارنا "

"انہیں مار کر مہرل شاہ کو کیوں مارتے ہیں۔ پہلے ل شاہ سے سودے بازی......"

"نہیں، اس سے سودے بازی میں وقت لگے انہیں پہلے ہی ختم کرنا ہوگا۔" اس نے حقارت سے کہا تو تانی پر جوش لہجے میں بولی۔

"بس پھر تو میں آزاد ہوں گی۔ سکون سے ادھر وں گی۔ ویسے اب تک آپ نے ان کو ختم کیوں نہیں کیا؟" تانی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں دیکھوں، ان کا پیچھا کرنے والا ئی ہے کہ نہیں؟" مہر سکندر نے سکون سے کہا۔

"تو کوئی؟" تانی نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، کہیں بھی ہلچل نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کا ساتھی تھا بھی تو وہ زیر زمین چلا گیا ہے۔ مہرل شاہ کی تلاش بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے، وہ لوگ اور پولیس والے ہر جگہ تلاش کر رہے ہیں انہیں۔ ان میں سے کوئی چوہا بھی باہر نہیں نکلے گا۔ اور آج رات......" یہ کہتے ہوئے اس نے ان کے ختم ہو جانے کا اشارہ کیا۔ تانی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ اور مہرل شاہ ایک ہی جگہ قید ہیں؟ میرا مطلب ہے۔ اگر مہرل شاہ نے ان سے سودے بازی کر لی تو؟" تانی نے کہا تو وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"مہرل شاہ میرا مہمان ہے، وہ اوپر والے کمرے میں سکون سے سو رہا ہے۔ اسے یہی معلوم ہے کہ میں نے اسے جسپال اور بدر سے چھینا ہے اور اب تک یہاں چھپا کر رکھا ہے۔ اور وہ نیچے تہ خانے میں پڑے ہیں۔ خیر یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں، دیکھو، سورج ڈھل رہا ہے، تم آؤ، آج کی شام رنگین کریں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو تانی نے ایک ادا سے کہا۔

"مہر صاحب، میری شام تو اس وقت رنگین ہوگی جب میں جسپال کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں گی۔ بڑی رات پڑی ہے، آپ مجھے خوش کریں، میں آپ کو نہال کر دوں گی۔" تانی نے یہ لفظ اس طرح خمار بھرے انداز کہے کہ مہر سکندر بن پیئے ہی نشے میں آگیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو تانی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ دونوں چلے تو مہر سکندر نے تانی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

وہ دونوں ہی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں ایک ہی صوفے پر جُڑ کے بیٹھ گئے تو مہر سکندر نے اپنے ملازم سے کہا۔

"جاؤ، ان دونوں کو لے آؤ، ان کا کام ختم کریں لیکن لانا ذرا دھیان سے۔"

"جی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ وہ اس کی

طرف متوجہ ہوا۔تانی نے خمار آلود آواز میں کہا۔
"آئیں بیڈروم میں چلیں۔"
"ابھی چلتے ہیں، وہاں کچھ پینے کا تو بندوبست کرلیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دوسرے ملازم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"ہمارا پینے کا شربت ادھر بیڈروم میں رکھو، کچھ کھانے کا سامان بھی ادھر لے آؤ۔" وہ یہ کہہ کر باہر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جبکہ تانی کے اندر سنسنی پھیلنے لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ذرا سا وقت گذرا ہوگا کہ اندر ہی کے راستے سے جسپال اور بدر کو لایا گیا۔ان کے ساتھ چند لوگ اس طرح تھے جیسے وہ کوئی بہت خطرناک لوگ ہوں۔ ذرا سی کوتاہی سے وہ انہیں ختم کر سکتے ہیں۔تانی یوں مہر سکندر کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی، جیسے وہ خوف زدہ ہوگئی ہو۔جسپال اور بدر اسے یوں گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے وہ بہت زیادہ غضب ناک ہوں۔
"تم لوگوں نے جانا ہے نا یہاں سے،تو جاؤ۔" مہر سکندر نے ہتک آمیز انداز میں کہا تو جسپال بولا۔
"ٹھیک ہے، آؤ تانی چلیں۔"
"میں تمہارے ساتھ نہیں جانے والی ، یہ تمہاری فیری نہیں کہ تم مجھے اغوا کر کے کہیں بھی لے جاؤ، اب تو میں مہر سکندر کے ساتھ رہوں گی۔ یہ مجھے بھارت بھجوا دیں گے۔" تانی نے مہر سکندر کے ساتھ لگ کر کہا تو بدر نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا۔
"چلتی ہے یا......"
"نہیں نہیں بدر، لڑکیوں کے ساتھ ایسے بات نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پسٹل نکلا اور اسے تھماتے ہوئے بولا۔" تانی، تم جس طرح چاہو، انہیں ختم کرسکتی ہو۔انہیں ختم کرو اور چلیں بیڈروم میں......" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ اس کے حلق ہی میں رہ گیا، تانی نے پسٹل بائیں ہاتھ سے پکڑا اور دائیں ہاتھ سے مہر سکندر کی گردن کے قریب رگ پکڑ کر مسل دی۔ وہ وہیں سُن ہو کر بیٹھ گیا۔ تبھی تانی نے وہاں لوگوں کی طرف دیکھ کر پسٹل مہر سکندر کی کنپٹی پر رکھ کر غراتے ہوئے کہا۔
"کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا، ہلا تو میں اسے مار دوں گی۔فوراً مہرل شاہ کو ادھر لاؤ بدر، وہ اوپر ہے۔"
یہ سنتے ہی بدر نے ایک بندے کی گن پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سے چھین لی۔ان سب کو باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔ بدر تیزی سے اوپر کی طرف چلا گیا۔تانی نے پسٹل جسپال کی جانب اچھال دیا۔اس نے وہاں موجود چار بندوں کو گنیں رکھ دینے کا اشارہ کیا۔سامنے والے بندوں نے گنیں رکھ دیں اور سب پیچھے ہٹ گئے۔ جسپال نے مہر سکندر کو سنبھالا تو تانی بھی بدر کے پیچھے لپکی۔
وہ دونوں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔، بدر جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر گیلری میں گیا، اچانک سامنے ہی سے دو آدمی گنیں سنبھالے ہوئے آئے۔انہوں نے بدر کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ شاید انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ بدر کے پیچھے تانی بھی ہوگی۔تانی نے یکے بعد دیگرے فائر کردیئے۔ بدر جھک گیا، سامنے سے گولیاں اوپر سے نکل گئیں۔وہ دونوں رُک گئے۔کوئی بھی ان کے سامنے نہیں آیا تو وہ اکڑوں حالت میں آگے بڑھے۔ سامنے دو ہی کمرے تھے۔ کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے مہرل شاہ کو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔وہ سیدھے ادھر گئے۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اسے باہر آنے کو کہا جائے۔ انہوں نے دروازے کو چھید کر رکھ دیا۔اگلے ہی لمحے مہرل شاہ ان کے سامنے تھا۔اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ بدر نے اسے اشارے سے پیچھے چلنے کو کہا۔وہ سر جھکائے ان کے آگے لگ گیا۔وہ اسے لے کر نیچے آئے تو مہر سکندر ویسے ہی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ وہ ان سب کو لے کر باہر آگئے۔پورچ سے بھی آگے نکل کر جسپال نے سیکورٹی والوں سے کہا۔

"ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے، تم لوگوں نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اچھا کیا، اب بلوچ کو لاؤ، ورنہ اس کو مار دیں گے۔" بدر نے مہر سکندر کو ٹھڈا مارتے ہوئے کہا تو اس کی آہ نکل گئی۔
مہرل شاہ خاموشی سے زمین پر پڑا تھا۔ کچھ دیر ہی میں انہیں بلوچ دکھائی دیا۔ وہ ان کے قریب آیا تو جسپال نے اسے سامنے کھڑی فور وھیل لانے کو کہا جو مہر سکندر کی تھی۔ بلوچ نے اس کی جیب سے چابی نکالی اور ذرا سی دیر میں فور وھیل گاڑی ان کے پاس لے آیا، انہوں نے مہر سکندر اور مہرل شاہ کو جیسے ہی گاڑی میں ڈالا، وہاں موجود سیکورٹی والوں میں ہلچل مچ گئی۔ نزدیک والے تو کچھ نہیں کر سکتے تھے، ان کے پاس ہتھیار ہی نہیں تھے، مگر دور والوں نے ایک دم سے فائرنگ شروع کردی۔ بلوچ پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔اس کے ساتھ تانی بیٹھ گئی۔جسپال اور بدر نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ چند لمحے کے لیے سامنے سے مزاحمت کم ہوئی تو وہ دونوں گاڑی میں آبیٹھے، گاڑی چل دی۔ مہر سکندر اور مہرل شاہ ان کے پاؤں میں تھے اور وہ کھڑکیوں سے گنیں نکالے فائرنگ کرتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گیٹ پر تھے۔وہ تیز رفتاری سے سڑک پر چڑھے تو ان کے پیچھے گاڑیاں چڑھ دوڑیں۔
سپر ہائی وے تک وہ بیس منٹ کے قریب پہنچ گئے۔ جہاں ان کے انتظار میں ایک فور وہیل جیپ کھڑی تھی۔ان چاروں نے وہ گاڑی چھوڑی اور نیچے اتر آئے۔انہوں نے مہرل شاہ کو باہر نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ بدر نے گن سیدھی کی اور اس پر گولیاں برسانا شروع کردیں۔ وہ زیادہ وقت نہیں تڑپا، جلد ہی ساکت ہوگیا۔مہر سکندر یہ سب دیکھ رہا تھا لیکن کوئی بھی ردعمل ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔تانی نے اُسے کھینچ کر نیچے پھینکا اور اس پر فائرنگ کرنے لگی۔ ان دونوں کے مرتے ہی وہ چاروں فور وہیل میں بیٹھے تو اگلے لمحے وہ وہاں سے چل دیئے۔
آدھی رات سے قبل ہی وہ اس ٹھکانے پر پہنچ گئے، جہاں شاہد، سارہ اور معین الدین اور مراد کو چھپایا ہوا تھا۔ وہ پہنچے ہی تھے کہ سارہ ان کے پاس آگئی۔
"میرا تو دل دہل گیا تھا۔ ایک دم ہی غائب ہوگئے، کہاں تھے آپ لوگ؟" سارہ نے پوچھا۔
"اس وقت مجھے بہت کام ہیں، میں نے جانا ہے۔ ساری تفصیلات ان سے پوچھ لیں۔" بدر نے اٹھتے ہوئے کہا تو جسپال بولا۔
"کہاں جا رہے ہو، میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔تم اکیلے نہیں جاسکتے ہو۔"
"نہیں جسپال، یہ کام میرا ہے ، مجھے ہی کرنا ہوگا۔" اس نے سکون سے کہا۔
"ادھر بیٹھو، اور بتاؤ کیا کرنا ہے؟" تانی نے پوچھا۔
"مہرل شاہ مر گیا ہے ،یہی وقت ہے اس کے یہاں تسلط کو ختم کرنے کا اور پھر میں نے سوچ لیا ہے، جس جگہ بھی ان کا تسلط ہے وہ اب میرا ہوگا۔"
"تم کرلو گے؟" جسپال نے کہا۔
"ہاں اب کرلوں گا۔مہر سکندر کو میں نے سامنے لانا تھا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ سامنے آجائے، وہ اور مہرل شاہ دونوں مل کر اپنا نیٹ ورک چلا رہے تھے۔ وہ وزارت وغیرہ تو ساری کہانی تھی ، جھوٹ تھا سب۔ میں جانتا ہوں کہ مہر سکندر نے خود مہرل شاہ کو وزارت دلوائی ۔ وہ اگر کوئی اور بات کرتا تو شاید میں اس کے جھانسے میں آجاتا۔"
"کیا وہ اتنا ہی بے وقوف تھا؟" سارہ نے پوچھا۔
"نہیں وہ بے وقوف نہیں تھا، بس تانی کے حسن کے سامنے ہار گیا، عورت کا رسیا، عورت ہی کے ہاتھوں مرتا ہے۔" بدر نے کہا۔
"کیا وہ؟" سارہ نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔اس پر تانی ہنستے ہوئے بولی۔

"سارہ تم جانتی ہو کہ خدا نے عورت کو ایسی صلاحیت سے نوازا ہوا ہے کہ وہ مرد کی آنکھ میں اس کی نیت پڑھ لیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ میں نے اس بے غیرت کی آنکھ میں جیسے ہی یہ پڑھا تو وہ مجھے بہت آسان شکار لگا۔ میں نے اسے مارنے کا اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا۔ میرے اس فیصلے کو جسپال سمجھ گیا تھا۔"

"کیا کیا تو نے؟" سارہ نے پوچھا۔

"اسے بے وقوف بنایا، اسے یقین دلایا کہ میں ان دونوں کے چنگل میں پھنس گئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ساری تفصیل بتادی۔

"دوبئی میں فون، یہ سمجھ میں نہیں آیا؟" سارہ نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"یار، پوری دنیا میں نیٹ ورک ہے روہی کا۔ بدر جانتا ہے۔ یہ کوڈ ہیں ہمارے۔ جیسے ہی میں نے احسان الحق کہا تو سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ جو سپر ہائی وے پر فور وہیل ملی، یہ ہمارے نیٹ ورک ہی کا کمال ہے نا۔" تانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اُسے کیسے معلوم کہ تم لوگ کہاں ہو، ہم تو کل سے تلاش کررہے ہیں۔ ہمیں تو......" سارہ نے کہنا چاہا مگر تانی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ہمیں کیسے تلاش کرلیتے ہیں لیکن روہی والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ یہی تو ہمیں اعتماد ہے۔"

"عجیب بات ہے؟" وہ پھر الجھتے ہوئے بولی تو بدر نے اُٹھ کر تیزی سے کہا۔

"سارہ، تم تیار رہنا اور شاہد کو بتا دینا کہ وہ بھی تیار رہے ممکن ہے تم لوگوں کو یہاں سے فوراً نکلنا پڑے۔ شاید وقت نہ ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔" سارہ نے پوچھا۔

"سارہ میرے پاس تفصیلات کا وقت نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔

جسپال نے ایک طویل سانس لی اور کرسی پر پھیل گیا۔ تانی اٹھی اور سارہ کو لے کر اندر چلی گئی۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کھلی تو صبح کی نیلگوں روشنی کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے بستر پر نہیں رہا گیا۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں کاریڈور سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ میرے باہر آتے ہی، دونوں کتے بھاگتے ہوئے آئے اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ میں نے انہیں کچھ دور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئے۔ میں بھی وہیں بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گاؤں سے لے کر یہاں تک کا سارا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ کرنل سرفراز کی شخصیت اور اس کی باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں۔ ان کی یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ انسان اپنی راہ میں خود ہی رکاوٹ ہے۔ یہ کیسے ہے؟ اسی سوال کا جواب میں چاہتا تھا۔ اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے اس سوال کا جواب دے گا۔ میں اپنے طور پر بہت سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں تو یہی آیا تھا کہ انسان اپنی راہ میں کیسے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ تو وہی کرتا ہے جو وہ اپنے لیے بہتر سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ترقی کرے، وہ تو اپنی راہ کی رکاوٹیں دور کرتا ہے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ کرنل سرفراز کے ساتھ اس کا ملازم تھا۔ ملازم دو ٹرے اٹھائے ہوئے تھے۔ کرنل میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا تو اس کے ملازم نے ایک ٹرے ہمارے درمیان رکھی۔ ٹرے میں دو گلاس فریش جوس تھے۔ دوسری ٹرے میں کتوں کے لیے روٹیاں اور گوشت کے پارچے تھے۔ اس نے ٹرے میں گوشت اور روٹیاں کتوں کے آگے پھینکیں اور واپس پلٹ گیا۔ تبھی چند لمحے خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"جمال! تم نے کبھی زندگی کے بارے میں سوچا ہے، یہ کیسے ہمیں مل گئی، اور یہ سب کیا اور کیسے ہوا، کیا یہ سب کھیل تماشہ؟"

اس کے یوں کہنے پر میں چند لمحے سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سچ پوچھیں نا مجھے ایسی باتیں کرنے والا کوئی ملا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی میں نے سوچا ہے۔ مجھے تو بس زندگی مل گئی، ہوش آیا تو یہی پتہ چلا کہ میرے سر پر ذمے داریوں کا بوجھ ہے اور انتقام ورثے میں مل گیا۔ پھر کیا ہوا، یہی جو آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے کیا پتہ زندگی کہاں سے آئی اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ یہ زندگی کیا ہے، کیا کھیل تماشہ ہے؟"

"دیکھو، یہ جو سب کچھ دکھائی دے رہا ہے، یہ ایک ہمارے ہونے سے ہے۔ مطلب انسان کے ہونے سے ہے، اگر اس کائنات میں انسان نہیں ہے تو یہ کائنات بھی نہیں ہے۔ اسے کون دیکھ رہا ہے، اس کے معلوم رکھ رہا ہے، اسے تسخیر کون کر رہا ہے؟" انہوں نے مہذب سے کہا۔

"ظاہر ہے یہ انسان ہی ہے۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"انسان کو اللہ پاک نے جوڑے سے بنایا۔ انسان کی ابتدا کیا ہے۔ ایک قطرہ جو باپ کی پشت سے اچھلتا ہوا نکلتا ہے۔ دراصل اس قطرے میں ایک پوری صورت پڑی ہوئی تھی، جس نے وجود میں آنا ہوتا ہے۔ ماں کے وجود میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب وہ ایک صورت میں آتا ہے، تب اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ ایک وقت تک وہ بے روح رہتا ہے۔ صورت پاتے ہی اس میں روح آتی ہے۔ اس میں بھی پوری حکمت ہے۔ خیر، ایک مرحلے عمل کے بعد جب وہ ماں سے الگ ہوتا ہے تو اس دنیا میں آجاتا ہے۔ وہ اپنا ایک پورا وجود، پوری ایک صورت رکھتا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ، جیسے ہی وہ صورت دنیا میں آئی تو اس کے ساتھ کیا تبدیلی ہوئی" کرنل نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بہتر سمجھتے ہیں، آپ ہی مجھے بتائیں۔" میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"جب وہ صورت اس دنیا میں آئی تو سب سے پہلے اس نے اپنی والدہ کو مقام ماں پر فائز کردیا۔ باپ کو باپ ہونے کا مقام مل گیا۔ کسی کا بھتیجا، بھانجا، بھائی، بیٹا، اس کے آنے کے ساتھ ہی رشتے ظاہر ہوگئے۔ اگر وہ نہیں تھا تو یہ سارے رشتے کہاں تھے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تھے۔ کوئی رشتہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اس دنیا میں انسان کے پہلے سانس کے ساتھ ہی ظہور ہونا شروع ہوگیا۔ اس نے ذرا ہوش سنبھالا، اس نے آسمان کو دیکھا، آسمان ظاہر ہوگیا، چاند کو دیکھا، چاند ظاہر ہوگیا، سورج، مٹی درخت سب، جسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ آشکارا ہوتے جاتے ہیں۔ کائنات کھلتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے اندر تبدیلیاں ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اب اس کے دیکھنے کے دو راستے ہیں، ایک باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ ایک کائنات اس کے اندر ہے اور دوسری کائنات باہر موجود ہے۔"

"اور میرا خیال ہے اسی کائنات سے وہ دنیا کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بالکل، دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اس کی اندر جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اسی سے اس کے خیال بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"کیا اسے خبر نہیں ہوتی؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو، ایک قطرے سے وجود بن جانا، اور پھر اس دنیا میں آکر اس کا وجود پروان چڑھنا۔ یہ فطری عمل ہیں۔ ایک خاص وقت پر آکر اس میں تبدیلیاں آنا شروع ہوجاتی ہیں۔ وہ وجود چاہے مرد کا ہے یا عورت کا۔ اس سے پہلے وہ معصوم ہوتا ہے۔ کوئی شریعت اس پر لاگو نہیں ہوتی۔ آخر یہ کیسی تبدیلی ہے جو اس پر شریعت کے احکامات لگ جاتے ہیں؟ مطلب وہ کوئی

ایسی قوت ہے جس کی حفاظت کے لیے یہ سارا انتظام ہے۔ یہ تبدیلی بڑی اہم ہے اور......‘‘ اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں، یہی تو سمجھنا چاہوں گا۔‘‘ میں نے جلدی سے کہا تو وہ بولے۔

’’وہ ہے اس کے اندر کی تخلیقی قوت۔ انسان زندگی پاتا ہے ایک قطرے سے اور پھر ویسا ہی قطرہ جب اس کے اپنے اندر پیدا ہوتا ہے تو ایک نئی زندگی دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ ایک بیج بار آور ہو کر کتنے ہی نئے اشجار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ کوئی معمولی صلاحیت ہے۔ یہ بہت بڑی صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کی حفاظت کے لیے، اس کے پیدا ہوتے ہی۔ اسی کے ساتھ ہی شریعت لاگو ہو جاتی ہے۔ نگاہ سے لیکر شرمگاہ کی حفاظت تک کے احکامات آ جاتے ہیں۔ یہ زندگی ہے۔ جو ربّ تعالیٰ نے دی۔ اس کی پوری پوری حفاظت کے لیے۔‘‘

’’مطلب، جس وقت صورت سامنے آ گئی تو اس کے ساتھ ہی سارا عمل شروع ہو گیا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’بالکل، جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ صورت کے وجود میں آتے ہی تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ اصل میں صورت کا ظہور ہی مقصد تھا، جس میں سے ہر چیز دیکھی جاتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی رشتے ظاہر ہوئے۔ اسی سے حضرت آدمؑ کے بارے میں معلوم ہوا۔ یعنی ہم اس صورت سے آدمؑ کو دیکھ سکتے ہیں۔ آدمؑ سے لیکر یہ صورت اور اس صورت سے آدمؑ تک۔ پورا سلسلہ جڑ گیا۔‘‘

’’صورت کے ظہور کا اصل مقصد؟‘‘ میں نے پوچھا۔ تو وہ بولے۔

’’وہ صورت آئینہ ہے، سبھی اسی میں اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ باپ اس میں اپنا باپ ہونا دیکھ رہا ہے۔ ماں اس میں اپنا مقام دیکھ رہی ہے۔ سارے تعلق اسی میں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ اب وہ صرف اپنا وجود اور صورت ہی نہیں لے کر آیا۔ بلکہ خیال بھی لے کر آیا۔ وہ وجود ایک خیال تھا، ایک خیال میں پڑا تھا۔ صورت میں ظہور ہوا۔ تب اس میں انفس و آفاق پیدا ہو گئے۔ اس میں فکر سوچ پیدا ہو گئی۔ ارد گرد کی پہچان آ گئی۔ اب اس کی پرورش دو طرح سے ہونا شروع ہو گئی۔ بدنی اور فکری۔ یہ سب زندگی سے ہے۔‘‘

’’مطلب یہ سارا کچھ زندگی سے ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں‘ اور اب ایک بہت اہم بات بتانے جا رہا ہوں، ممکن ہے تمہاری سمجھ میں نہ آئے، لیکن غور کرو گے تو سمجھ میں آ جائے گی۔ جس طرح میں نے بتایا کہ انسان ایک قطرے سے پیدا ہوا اور پھر وہ ویسا ہی قطرہ لوٹا دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ ساری صلاحیتیں اس میں قدرت نے رکھی ہیں۔ ابھی وہ عالم اِمکاں میں ظاہر نہیں ہوا۔ ابھی وہ زوجیت کے معاملے میں نہیں آیا، اس کے بیوی، بچے نہیں، اکیلا ہے۔ اس کے اندر کیا تھا، کیا ہے اور کیا ہوگا۔‘‘

’’یہ تو ہے۔‘‘ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

’’زندگی سدا سے تھی اور سدا رہے گی لیکن تمہیں اس کا احساس اس لیے نہیں ہے کہ یہ حقیقت تم سے اوجھل ہے۔ تم خود اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔‘‘

’’بالکل، مجھے بتایا ہی نہیں کسی نے۔‘‘ میں نے اعتراف کر لیا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولے۔

’’اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ تو باتیں دو ہی ہونگی۔ ایک بات تو یہ ہوگی کہ تم میری بات مان جاؤ گے اور دوسری یہ کہ نہیں مانو گے۔ ماننے اور نہ ماننے کی آخر کوئی نہ کوئی تو وجہ ہوگی نا۔‘‘ اس نے میری طرف دیکھ کر اپنی بات کی تائید چاہی۔

’’جی بالکل، ایسا ہی ہے، ویسے یہ وجہ ہے کیا؟‘‘ میں نے گہری سانس لے کر کہا تو وہ بولے۔

’’کسی بات کو ماننے اور نہ ماننے کا معیار انسان کے اندر لاشعوری طور پر بنتا چلا جاتا ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر معیار بنتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے اس کی توجہ باہر کی دنیا میں ہے۔ وہ باہر دیکھ رہا ہے باہر ہی کے حالات اس کا معیار بناتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے اندر کیا کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اندر جھانکتا ہی نہیں کہ وہ معیار، جس پر اس نے فیصلے کرنے ہیں، وہ درست بھی ہیں یا نہیں؟‘‘

’’مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میرے اندر جو معیار ہیں درست ہیں یا غلط؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں‘ یہی تو بات ہے کہ ہم سوچیں، اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ جو کچھ میرے اندر ہے، وہ کیا ہے میں اپنے اندر کیا کچھ لیے پھرتا ہوں؟‘‘ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے، پھر کہتے چلے گئے۔ ’’جمال، یہ ساری باتیں تو بعد کی ہیں، پہلے کی بات تو یہ ہے کہ زندگی کہاں سے آئی؟ زندگی کو دیکھتا کون ہے؟ کیسے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟‘‘

’’ظاہر ہے، زندگی کو زندہ لوگ ہی دیکھتے ہیں۔‘‘ میں نے تیزی سے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیئے اور بولے۔

’’بالکل۔ زندگی کو زندہ لوگ ہی دیکھیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ اصل میں زندگی ہے کیا۔ اسی طرح زندہ ہی یہ دیکھ پاتے ہیں کہ مردہ کون ہے؟ مثال کے طور پر سامنے اگر ایک لاش پڑی ہے۔ اس میں سب باتیں وہی ہیں، جو زندہ کی ہوتی ہیں، ایک روح ہی نہیں ہوتی، جو بذات خود دکھائی نہیں دیتی۔ کیا کوئی مردہ آ کر گواہی دے گا کہ یہ مرا ہوا ہے یا زندہ بتائے گا کہ یہ اب محض جسد خاکی ہے، یہ زندہ نہیں۔‘‘

’’ہاں یہ بات تو سمجھ میں آ گئی، اصل میں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔‘‘ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

’’میں کہنا یہ چاہتا ہوں، جب باہر کی دنیا کے بارے میں ہم کوئی بھی فیصلہ اپنے اندر پڑے معیار سے کرتے ہیں، تو کیا ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ہم اس معیار کو پرکھ لیں کہ وہ کیسا ہے؟ درست بھی ہے یا غلط؟‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں بولا۔

’’وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیسے، کیسے پرکھیں؟‘‘ میں نے پوچھا تو گویا ہوا

’’ظاہر ہے اس کے لیے بھی ہمیں کوئی نہ کوئی معیار، کوئی کسوٹی تو لینا ہوگی۔ جس سے ہم اپنے اندر کو پرکھ سکیں۔ کسی بھی چیز کے بارے میں ہم فیصلہ کر سکیں کہ وہ ہمارے لیے درست ہے یا غلط۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکے، پھر بولے۔

’’یہ بات اپنی جگہ، لیکن اس سے پہلے ہم یہ غور نہ کر لیں کہ انسان کے اندر وہ کون سی چیز ہے، جس کی وجہ سے یہ ساری کشمکش ہے؟‘‘

’’میرے خیال میں تو وہ روح ہے، جو انسان میں موجود ہے تو وہ زندہ ہے، اس میں کشمکش ہے، یہ ہنگامے ہیں، وہ دیکھ اور بول سکتا ہے۔‘‘ میں نے جوش سے کہا۔

’’رُوح...... چلو ایک لمحے کو مان لیتے ہیں کہ اس میں روح ہے، لیکن اس میں کوئی کشمکش نہیں ہے، وہ دیکھ اور بول بھی نہیں سکتا اور پھر ہم روح کی بات کیوں کریں جسے ہم نے دیکھا نہیں۔ جس پر ہم بات نہیں کر سکتے، وہ کیسی ہے۔ ہم تو اس پر بات کرتے ہیں، جو دکھائی دیتی ہے۔‘‘ وہ بولے تو میں نے ہولے سے کہا۔

’’روح کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ روح جب نہیں ہوتی تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔‘‘

’’اگر میں یہ کہوں کہ روح کے بغیر بھی انسان زندہ رہتا ہے تو کیا تم مان لو گے۔ وہ بھی جسمانی لحاظ سے، میں کوئی روحانی بات نہیں کر رہا ہوں۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’دیکھو، ہمیں وہاں سے غور کرنا ہوگا، جب انسان محض ایک ایسے قطرے کی صورت میں ہوتا ہے جو باپ کی پشت سے نکلتا ہے اور وہ ماں کے رحم میں جاتا ہے تو نمو پاتا ہے۔ اس کی افزائش شروع ہو جاتی ہے، اس کا وجود ظاہر ہوتا ہے پھر ایک وقت کے بعد اس میں روح

آتی ہے۔ پہلے دن سے لے کر روح آنے تک وہ کون سی شے ہے، جس سے ایک قطرہ پورا وجود، پوری صورت بن جاتا ہے، روح تو بعد میں آتی ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اسے جان سمجھ لو۔ یعنی یہ گوشت پوست، بنا روح کے بھی پروان چڑھتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا، پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا "روح ہوتے ہوئے بھی، انسان، انسان نہیں رہتا، حیوان بن جاتا ہے، اس پر کبھی غور کیا تم نے؟"

"ہاں اس کی تو مجھے کافی سمجھ ہے۔ انسان کس قدر درندگی پہ اتر آتا ہے، حیوانیت ہی کا روپ ہے نا یہ۔" میں نے کہا تو میری آنکھوں کے سامنے کئی سارے منظر گھوم گئے۔

"میرا سوال ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، جبکہ رَبّ تعالیٰ نے تو اسے احسن تقویم پر پیدا کیا۔ اسے بہت اچھا بنایا۔ اس خالق کا شاہکار ہے یہ انسان۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"آپ بتائیں، یہ کیا تبدیلی ہے؟" میں نے دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"انسان میں تخلیق کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک بیج لگایا تو اس سے درخت بن گیا۔ جس سے ہزار ہا نئے بیج بن جاتے ہیں۔ اس تخلیقی صلاحیت کے ساتھ رَبّ تعالیٰ نے اس کے وجود میں بہت کچھ رکھ دیا، جس کا خود انسان کو ادراک نہیں، آہستہ آہستہ وہ اپنے بارے میں جانتا چلا جا رہا ہے۔ یہ اسی وقت جانتا ہے جب وہ اپنے بارے میں جانے گا کہ اس کے اندر کیا پڑا ہے۔"

"اسے کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے اندر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ ماں کا دودھ کیسے پیتے ہیں؟ پرندے کو کس نے اڑنا سکھایا؟ یا مچھلی کو کس نے تیرنا بتایا۔ یہ جبلت ہے انسان کی۔ جب اس پر کوئی موقعہ آتا ہے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے تو اس معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو میں الجھتے ہوئے بولا۔

"بات آپ نے اندر کے معیار سے شروع کی اور کہاں تک لے آئے۔ کہیں ہم اُلجھ تو نہیں گئے؟"

"نہیں اُلجھے نہیں، بلکہ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ آدمی، انسان سے حیوان کیسے بن جاتا ہے۔" انہوں نے سکون سے کہا۔

"وہ تو آپ نے بتا دیا کہ اس کے اندر کے معیار سے۔" میں نے انہیں یاد دلایا تو وہ ذرا سا مسکرا دیئے اور بولے۔

"ہاں، اس کے اندر کا معیار ہی سے، لیکن یہ نہیں سمجھو گے کہ یہ اندر کا معیار بنتا کیسے ہے؟"

"جی یہ تو سمجھنا چاہوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"چلو، یہ بات آج رات ہی کو سہی۔ سکون سے سمجھاؤں گا۔ فی الحال، تم اندر جا کر دوا کھا لو اور آرام کرو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی اور تمہیں یہ بھی بتانا ہے کہ انسان اپنی راہ میں رکاوٹ کیسے ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا کاندھا دبایا اور ہاتھ پکڑ کر اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ گیا تو وہ مجھے اندر کی جانب لے کر بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

صبح کی نیلگوں روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی بدرو واپس پہنچا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی سب کو اکٹھا کر لیا۔ جسپال نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کدھر تھے تم؟"

"یہ جو کراچی شہر ہے نا، اس میں جو بھی مہرل شاہ کا حصہ تھا، وہ سب چھین لیا ہے میں نے۔ یہ سب دو نمبر دھندے ہیں۔" اس نے کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"لیکن کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا تھا؟"

"نہیں، یہ میرا اور میرے لوگوں کا مسئلہ تھا، وہ ×

گیا۔ خیر، تم لوگ سنو......" اس نے کہا پھر شاہد کی طرف دیکھ کر بولا، "شاہد! تمہارے لیے اب یہاں پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ سکون سے زندگی گزارو۔ اپنا بزنس سنبھالو، اپنے باپ کی خدمت کرو۔ جسپال اور تانی جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ پورا ہوا۔"

"اور اب......؟" جسپال نے پوچھا۔

"اب تم لوگ آرام کرو۔ جب جانا چاہو، چلے جانا۔" اس نے اطمینان سے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو سارہ نے کہا۔

"شاہد، چلیں پھر اپنے گھر؟"

"ظاہر ہے اب تو جانا ہی ہوگا۔" اس نے کاندھے اُچکا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تو نکلو پھر، ناشتہ وہیں چل کر کریں گے۔" تانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے بنگلے کے لیے نکل چکے تھے۔

☆......☆......☆

ڈنر کیے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں بیڈ پر آ کر لیٹ تو گیا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یہی کرنل سرفراز کی باتوں پر سوچتا چلا جا رہا تھا۔ پہلی بار مجھے ایسی سوچوں سے واسطہ پڑا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتانا چاہ رہا ہے۔ آخر وہ مجھ سے چاہتا کیا؟ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کرنل تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ وہ سامنے دھری میز پر رکھ کر بولا۔

"ساری بتیاں بجھا دو اور میرے سامنے آ کر بیٹھو۔"

میں نے ویسا ہی کیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اس نے ماچس کی تیلی جلائی تو کمرے میں روشنی ہو گئی۔ جلتی ہوئی تیلی سے اس نے سامنے رکھی موم بتی روشن کر دی۔ پتہ نہیں وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ موم بتی جلا کر اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"جمال! یہ شمع کیسی ہے۔ اس کا شعلہ کدھر ہے؟"

یہ عجیب سا سوال تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ شمع آپ نے میز پر لگائی ہے اور اس کا شعلہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔"

"جمال! یہ ایک چھوٹا سا تجربہ ہے۔ بہت چھوٹی کلاسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ میں اس سے تمہیں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں، میں جو بات بھی پوچھوں، تم اس کا جواب دیتے جانا، میں پھر تمہارے سارے سوالوں کے جواب تفصیل سے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا تو اس نے بیگ میں سے ایک عدسہ نکالا اور اسے شمع کے سامنے کیا۔ ایک مناسب فاصلہ دے کر اس نے میری توجہ دیوار کی طرف کی اور پوچھا۔

"وہاں پر شمع کیسے دکھائی دے رہی ہے۔"

"وہاں پر اُلٹی شبیہہ ہے، الٹ نظر آ رہی ہے۔"

میں نے جواب دیا تو اس نے ایک اور عدسہ نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ دیوار پر عکس سیدھا دکھائی دینے لگا۔ تو اس نے پوچھا۔

"اب شبیہہ کیسی ہے؟"

"اب شمع سیدھی دکھائی دے رہی ہے۔" میں نے جواب دیا تو اس نے وہ دونوں عدسے میز پر رکھ دیئے۔ پھر وہ اٹھا اور لائیٹ جلا کر کمرہ روشن کر دیا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھا اور بولا۔

"تمہیں ایمان مفصل آتا ہے؟"

"جی، گاؤں کے مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا تھا اور یاد بھی کروایا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے ایمان مفصل اسے سنا دیا۔ وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ میں سنا چکا تو

وہ بولا۔
"اس کا ترجمہ بھی آتا ہے؟"
"ہوسکتا ہے، پوری طرح یاد نہ ہو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کاش، مولوی صاحب، یہ سمجھا بھی دیتے کہ وہ کیا رٹا رہے ہیں۔ خیر، میں تمہیں اس کا ترجمہ سناتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رُکا اور پھر بولا۔
"اس کا ترجمہ ہے، میں ایمان لایا اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔"
"جی، ایسے ہی ہے۔" میں نے کہا تو بولا۔
"اب ذرا غور کرو، اس میں خیر اور شر، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کے معنی اور مطالب جو بھی لیے جائیں۔ بات دو متضاد چیزوں کی ہے۔ خیر، انسانیت کے لیے خیر تو رَب تعالیٰ چاہتا ہے، یہ پھر شر کیوں؟ خیر اور شر کا انسان کے اندر ہونا کیوں؟"
"یہ بات تو آپ ہی بتائیں نا۔" میں نے کہا۔
"دیکھو، فرشتوں کو کھانے پینے کی حاجت نہیں، انہیں رزق کے ذائقوں کے بارے میں کیا معلوم؟ بالکل اسی طرح، اگر ایک ہی شے کے بارے میں معلوم ہو اور دوسری کا پتہ ہی نہ ہو تو اس کا احساس کیا؟" انہوں نے کہا۔
"ہمیں اس شے ہی کا ادراک ہوگا تو ہم اس کے بارے جان پائیں گے۔" میں نے بتایا۔
"جی بالکل۔ اگر ایک چیز کا الٹ ہوگا تو ہی ہمیں درست کا احساس ہوگا۔ برائی کا احساس نہ ہو تو نیکی کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ خیر کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب اس کے مقابلے میں شر ہوگا۔ چونکہ انسان احسن تقویم پر پیدا ہوا ہے تو اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس رَب نے تو اس میں سب کچھ دے دیا۔ کیا اب انسان کا حق نہیں کہ وہ رَبّ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو دیکھے اور ان بارے میں پتہ کرے؟"
"ہاں جی یہ تو بنتا ہے کہ وہ اپنے اندر کے بار[ے] میں جانے کہ جو کچھ رَب تعالیٰ نے اسے دیا ہے، [جن] نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے، اس کے بار[ے] میں جانے۔" میں نے کہا۔
"تو پھر میرے بھائی، جو کچھ انسان کے اندر [ہے] اسے پہچاننے کا کوئی تو معیار ہوگا، کوئی کسوٹی، کوئی پیمانہ ہونا چاہیے نا؟"
"جی اسی کی وجہ سے تو خیر اور شر میں تمیز ہو [سکے] گی۔" میں نے کہا۔
"اب بات یہ ہے کہ ہم اگر مذہب کا پیمانہ [ہی] لے لیں تو ممکن ہے اس پر اختلاف ہو، لیکن اگر [ہم] انسان ہی کو سامنے رکھ لیں تو بات کچھ سمجھ میں آجا[ئے] گی کہ وہ باتیں جو انسان کی فلاح کے لیے ہیں وہ خیر [اور] جو فلاح کے لیے نہیں ہیں وہ شر۔" انہوں نے سمجھا[نے] والے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا، تب انہوں [نے] اپنی بات جاری رکھی، "دیکھو اگر ہم اس جلتی ہوئی [...] حقیقت مان لیں تو یہ دو عدد سے انسان میں شر اور خیر [کی] علامت ہیں۔"
"اوہ! تو آپ یہ سمجھانا چاہ رہے تھے۔" میں [نے] تیزی سے کہا تو وہ بولے۔
"ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔"
"جی کہیں، میں سن رہا ہوں۔" میں نے دھیمے انداز میں کہا تو وہ بولے۔
"دیکھو، اصل میں یہ دو سوچیں ہیں۔ ایک منفی [سوچ] اور ایک مثبت سوچ۔ اگر انسان کسی شے کو ایک ہی [نگاہ] سے دیکھے۔ ایک ہی سوچ کے ساتھ سوچے تو در[ست] نہیں ہوگی۔" انہوں نے دلیل دی تو میں نے پوچھا۔
"اگر مثبت سے بھی دیکھے تو بھی......"
"کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ مثبت ہے، جب [تک] منفی نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب تک منفی نہیں ہوگا [...] مثبت کا پتہ نہیں ملے گا۔" انہوں نے پھر یاد دلایا
"دونوں کے ہونے سے ہی صورت حال کا واضح پتہ ملے گا۔" میں نے مانتے ہوئے کہا۔
"یہ رَب تعالیٰ کی بندے میں بہت بڑی نعمت ہے کہ اس میں یہ دونوں چیزیں رکھ دی گئی ہیں اور اختیار انسان کو دے دیا کہ جو چاہو چُن لو۔" انہوں نے کہا تو میں نے بات سمجھنے کی خاطر کہا۔
"خیر اس کے اپنے لیے بہترین ہے اور شر انسانیت کے لیے قاتل ہے۔ اگر انسان شر کی نگاہ ہی سے اس کائنات کو دیکھتا ہے تو وہ انسانیت کا قاتل ہے اور اگر وہ فقط خیر ہی کو سامنے رکھے ہوئے ہے تو اسے کیا معلوم وہ کیا کر رہا ہے؟"
"میرے بھائی، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شر کی قوت جانے بغیر وہ خیر کو کیسے پہچانے گا؟ میں یہ نہیں کہتا وہ شر پیدا کرے پھر خیر کی طرف آئے، یہ تو بچکانہ بات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکے پھر بولے۔
"اصل میں انسان نے سب کچھ اُلٹ لیا ہوا ہے۔ اس نے مادیت ہی کو سب سمجھ لیا ہوا ہے۔ حالانکہ مادیت کچھ بھی نہیں۔ یہ جو سامنے ہے یہ سب میرے ہونے سے ہے، میں انہیں دیکھ رہا ہوں تو یہ ہیں، میں نہیں ہوں تو یہ کہاں ہیں۔ یہ مکان کیا ایسے ہی بن گیا۔ یہ پہلے کسی کی سوچ میں تھا۔ یہ سوچ منتقل ہوئی ہے۔ اصل میں بنیادی چیز ہی خیال ہے۔"
"یہ تو میں مانتا ہوں۔" میں نے بتایا۔
"تو اس پر سوچو، جو سوال ہو مجھ سے کرو۔ پھر میں بتاؤں گا کہ انسان اپنی راہ میں خود ہی رکاوٹ کیوں ہے اور کیسے ہے؟" انہوں نے سکون سے کہا تو میں نے سر جھکا لیا۔ میں اس پر سوچنا چاہتا تھا۔ بہت ساری سوچیں میرے اندر سر اٹھا رہی تھیں۔ میں خود یہ سب سمجھنا چاہتا تھا۔ شاید زندگی مجھے نئے پہلو دکھانا چاہ رہی ہو یا ایک نئی زندگی میرے سامنے وا ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

جسپال کافی دیر سے کاریڈور میں بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ شاہد گارڈز کے ساتھ شوروم کے لیے نکل گیا ہے۔ اس کا باپ معین الدین گھر پر ہی تھا۔ ایک دم سے سکون چھا گیا تھا، جس کی وجہ سے جسپال کو بے چینی ہو رہی تھی۔ سب کچھ اچانک کیسے ٹھیک ہو گیا۔ کیا پرسارام اور مہرل شاہ کا خاتمہ اتنا آسان تھا، وہ جس قدر طاقتور بندے تھے، مہر سکندر اپنا کھیل کھیل رہا تھا، وہ محض چٹکی میں ختم ہو گئے۔ کہیں نہ کہیں کچھ ایسا تھا، جہاں الجھن تھی۔ کیا شاہد اب محفوظ ہے، سارہ کے لیے کوئی خطرہ نہیں؟ کیا مہرل شاہ، مہر سکندر اور پرسارام کے لوگ ان کا پیچھا نہیں کریں گے؟ ان کے پیچھے تو حکومت کے لوگ تھے؟ کیا انہوں نے ذرا سا بھی ان لوگوں کو تلاش نہیں کیا؟ وہ کافی دیر سے اسی وجہ کو تلاش کر رہا تھا۔ ایسی کیا وجہ ہے کہ ہلچل نہیں ہوئی اور بدر نے بڑی آسانی کے ساتھ معاملہ حل ہو جانے کی نوید سنا دی۔ یہ آسانی اور سکون جسپال کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔
"کہاں کھوئے ہوئے ہو جسپال؟" تانی اس کے پاس آکر بولی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا، جسے اس نے جسپال کو تھمایا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب اس نے چائے کا سپ لے کر سوچتے ہوئے لہجے میں اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں اسے آگاہ کیا۔
"ممکن ہے جو تم سوچ رہے ہو، وہ جس قدر درست ہوسکتا ہے، اسی قدر غلط بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل تم مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتے ہو، ورنہ تمہیں احساس ہوتا کہ شہر اور علاقوں پر تسلط کے لیے یہ کیسے لڑتے ہیں۔"
"کیا بدر روہی سے تعلق رکھنے والا نہیں ہے؟ کیا وہ مجرمانہ زندگی گذار رہا ہے؟ اور وہ یہ جو کچھ کر رہا ہے سب ٹھیک ہے۔" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔
"بدر کا تعلق روہی سے ہے۔ وہ مجرم بھی نہیں ہے، لیکن اس شہر کا مزاج ایسا ہے کہ اس کے ساتھ ایسے چلنا پڑتا ہے۔" تانی نے سکون سے کہا۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟" اس نے کہا۔

"سنو، جس طرح ہر شہر کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ ماحول ہوتا ہے، اسی طرح وہاں کی زیر زمین دنیا کا بھی اپنا ماحول اور مزاج ہوتا ہے۔ جیسے ممبئی میں بھائی گیری چلتی ہے، وہ ماحول تم امرتسر میں نہیں پاؤ گے، لاہور اور کراچی کے انداز میں فرق ہے۔ ہاں بہت حد تک ممبئی اور کراچی کے مجرمانہ ماحول میں یکسانیت ہے۔ ایسا کیوں ہے، میں نہیں جانتی۔" تانی کہتے کہتے آخر میں اپنی بات گول کر گئی۔

"میں نے شہروں کے مجرمانہ ماحول پر کوئی تحقیق نہیں کرنی، تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو۔" جسپال نے اکتا کر اس سے پوچھا۔

"اس لیے کہ جو ہو رہا ہے اسے سکون سے دیکھو، جتنا کام ذمے لگا ہے اس پر غور کرو اور......" تانی نے کہنا چاہا تو جسپال نے غصے میں کہا۔

"بکواس کر رہی ہو تم، جس کام کے لیے ہم آئے تھے، وہ تو ہو چکا، اب یہاں کیوں پڑے ہیں۔ ایویں کہانیاں سنائے چلی جا رہی ہو مجھے۔"

"اوہ، تم تو ناراض ہو گئے یار۔ خیر، تم آرام کرو۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔" تانی نے اٹھتے ہوئے کہا تو ٹھیک اسی وقت جسپال کا فون بج اٹھا۔ اس نے سنا تو دوسری طرف شاہد تھا۔

"جسپال، میں یہاں شوروم پر آ تو گیا ہوں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" شاہد نے تشویش سے بتایا۔

"کیوں کیا محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے سیدھے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"صبح سے کئی مشکوک لوگ شاپ کا چکر لگا چکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک عورت نے تو مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا ہے کہ پرسارام کے گھر سے جو زیور نکلا ہے وہ دکھاؤ، وہ خریدار ہے۔" شاہد نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"بدر کو بتایا؟"

"ہاں، مگر وہ الجھا ہوا ہے، ابھی تک پلٹ کر جواب نہیں دیا۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں، تم گھبراؤ مت۔" جسپال نے ایک دم سے کہا اور اٹھ گیا۔

تانی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر جسپال نے بتایا تو وہ بولی۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ، میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔"

کہہ کر وہ تیزی سے اندر کی جانب چلی گئی۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا اور تیزی سے اس موجودہ صورت حال کے بارے سوچنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد تانی واپس آئی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"لو بھئی، تم جو سمجھ رہے تھے، بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ چلو راستے میں بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پورچ کی جانب چل پڑی۔ بلوچ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ شاہد کے شوروم کی طرف جا رہے تھے۔

"اب بتاؤ، کیا بات ہے؟"

"یہاں پر جو روہی کا نیٹ ورک ہے اس کے مطابق، بدر بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس نے جلد بازی کی اور مہرل شاہ کے سارے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انڈر ورلڈ کے لوگ اتنی جلدی مہرل شاہ کو نہیں بھولے اور نہ ہی اس کے لواحقین، وہ بدلہ لینے کو میدان میں اتر رہے ہیں۔ وہ لوگ......"

"یار تو کہانیاں مت سنا، اصل بات بتا۔" جسپال نے چڑتے ہوئے کہا۔

"جس عورت کے بارے میں شاہد نے بتایا ہے کہ وہ اس کے پاس پرسارام کے زیور اور جواہرات کا پوچھنے آئی تھی، وہ صرف ایک پیغام تھا، ایک تیسرا گروہ یا پھر وہی لوگ پوری طرح میدان میں آ گئے ہیں، وہ کون ہیں، کیا چاہتے ہیں، یہ پتہ کرنا ہے۔"

"کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ وہ بھی مرا ہوا۔" جسپال نے حقارت سے کہا تو تانی نے اس کی طرف دیکھا۔

...ہا۔

"جسپال، تم کچھ چڑچڑے نہیں ہو گئے ہو؟"

"ہاں، مجھے غصہ آ رہا ہے، پتہ نہیں کیوں یہاں ...ساتھ چوہے بلی کا کھیل، کھیلا جا رہا۔ شاید بلا ...مد۔ شاہد کے معاملات میں الجھایا جا رہا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا۔" تانی نے اعتماد سے کہا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا تو بلوچ ایک دم سے

"اگر آپ برا نہ منائیں تو میں کہوں؟"

"بولو۔" جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے یہاں کے انڈر ورلڈ میں کتنے برس ہو گئے ...، مجھے خود بھی نہیں معلوم، شاید بچپن سے ہی ہوں۔ ...ی عقل سمجھ کے مطابق، نہ مہرل شاہ کچھ تھا، اور نہ مہر ...بدر، کوئی تیسرا کھیل کھیل رہا ہے، اور اس کا سرا بدر ...ہاں سے ملے گا۔ وہ شاید دل میں کچھ لیے بیٹھا ہے۔"

"یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" تانی نے پوچھا۔

"اس لیے کہ جتنے بڑے یہ لوگ تھے، جتنے مضبوط، ...قدر خاموشی کا چھا جانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی ...اگر وہ جوان سے بھی مضبوط ہے۔ وہ میدان میں آ ...ہا ہے۔" بلوچ نے کہا۔

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" تانی نے پوچھا۔

"شوروم پر پہنچ کر میں کچھ بتا سکوں گا۔ بس کچھ دیر ...پہنچ جائیں گے۔" اس نے کہا اور اپنی توجہ سڑک پر ...دی۔

شاہد کافی حد تک پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ...ہی بدر بھی تھا۔ وہ دونوں پہنچے تو جسپال نے جاتے ...ہی پوچھا۔

"وہ عورت کون تھی؟"

"پتہ نہیں کون تھی، وہ صرف رابطہ نمبر دے گئی ہے۔ ...دوسرے لفظوں میں دھمکی......" بدر نے جواب دیا

"تم نے تو مہرل شاہ کا سارا کچھ سنبھال لیا ہے، پھر ...ن ہے، جانتے ہو؟" تانی نے پوچھا۔

"ہاں، جانتا ہوں۔ سالار صدیقی ہے۔ جس کی پشت پر نجانے کتنے سیاست دان ہیں۔ یہاں کے انڈر ورلڈ میں گولڈ کنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد، صرف اور صرف پرسارام کا سونا اور جواہرات وغیرہ حاصل کرنا ہے۔"

"اور اس کے علاوہ، مہرل شاہ کا بدلہ بھی۔" جسپال نے تیزی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ انہی کا آدمی تھا۔ اگر اب اس شہر میں رہنا ہے تو یا تو ان کی بات ماننا ہو گی یا پھر ان کا مقابلہ کرنا ہو گا۔" بدر نے کہا۔

"لاؤ، کہاں ہے اس کا رابطہ نمبر۔ میں بات کرتا ہوں۔" جسپال نے کہا۔

"ابھی ٹھہرو، میں نے اس سے بات کی ہے۔" بدر نے کہا تو جسپال نے پوچھا۔

"کیا بات کی ہے؟"

"یہی کہ میں اسے کچھ بھی نہیں دینے والا، ہمت ہے تو چھین لے مجھ سے۔" بدر نے کہا تو جسپال ایک دم سے خوشگوار انداز میں بولا۔

"میں نے بھی یہی کہنا تھا اور اب ایک کام کرو، پتہ کرو وہ کہاں ہے۔ اسے ہم خود ہی مل لیتے ہیں۔" جسپال نے کہا تو شاہد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ہم بات کو اتنا طول دیں گے۔ کیوں نہ خون خرابے کے بغیر ہم یہاں سے ویسے ہی چلے جائیں۔ وہ سارا سونا میں نے ڈھلوا کر محفوظ کر لیا ہے۔ کروڑوں کا سونا ہے اور جوہرات کی مالیت کا اندازہ نہیں، وہ بھی اتنے ہی کے ہوں گے۔ میرا خیال ہے، ہم دوبئی نکلتے ہیں اور......"

"کیا اس کی رسائی وہاں تک نہیں ہو گی؟" بدر نے کہا اور پھر جسپال کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ایسا کرتے ہیں، شاہد کو دوبئی بھیج دیتے ہیں، اس سارے سونے کے ساتھ اور ہم......"

"آج ہی، بلکہ ابھی۔" جسپال نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم سب اپنا اپنا پلان دے چکے؟" اچانک تانی نے کہا تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سب خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جب چند لمحے تک کوئی نہیں بولا تو اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا، "یہاں آنے سے پہلے میں اپنا پلان کر چکی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سارے معاملے کو اب میں دیکھوں گی۔ میں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" تانی نے کہا تو سب نے یوں تائید میں سر ہلا دیا جیسے وہ اس کی بات مان گئے ہوں۔ ان سب کو احساس ہو گیا تھا کہ آج کی رات بہت بھاری ہے۔

☆......☆......☆

وہ بہت گلابی شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں اور کرنل سرفراز دونوں لان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ جو کچھ کرنل نے مجھے بتایا تھا، اس پر بات ہو چکی تھی۔ تبھی چائے کا سپ لے کر انہوں نے کہا۔

"دیکھو، صورت کے ظہور کے ساتھ ہی اس میں دو طرح کی ڈویلپمنٹ ہوتی ہے۔ اس کی بدنی اور فکری ڈویلپمنٹ۔ جیسے کہ میں نے تمہیں سمجھا دیا کہ قطرے سے قطرے تک کا سفر ہو گیا۔ وہ لامکاں سے مکاں میں آ گیا۔ اب فکری ڈویلپمنٹ میں اس کے سامنے استاد آئے گا۔ وہ اس کی فکری پرورش کرے گا۔ یہ فکری پرورش ہے کیا؟ اصل میں ہوتا کیا ہے جسے ہم فکری ڈویلپمنٹ کا نام دیں گے؟"

"میرے خیال میں وہ خیر اور شر کی تمیز ہی ہے۔" میں نے بتایا۔

"بے شک تم بہت قریب پہنچ گئے ہو۔ ہے ایسا ہی۔ دراصل فکری ڈویلپمنٹ کا مطلب انسان میں "نگاہ" کا پیدا ہونا ہے۔" انہوں نے کہا۔

اور نگاہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ قوت اور صلاحیت جس سے اپنے ہونے کا مقصد معلوم ہو جائے، میں کیوں ہوں، یہ جو صورت مجھے ملی ہے، اس میں کیا ہے۔ کیونکہ صورت ہی سے کائنات ہے اور ساری کائنات اسی صورت میں پڑی ہے۔ یہ سب کچھ خیال میں تھا اور خیال ہی میں سب کچھ پڑا ہے۔ جیسے صورت سے آدم کا پتہ ملتا ہے اور آدم کا اس صورت سے۔ دنیا اور کائنات کے سارے فلسفے اسی ایک صورت میں سے ظاہر ہوتے ہیں۔"

"اور سب کچھ زندگی سے ہے۔" میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بھی سمجھ لو کہ زندگی کیا ہے؟" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے پھر بولے۔

"وہ کائنات جو چاہے اندر کی ہے یا باہر کی اسے تسخیر کرنے کا نام زندگی ہے۔ باہر کی کائنات اس وقت تسخیر ہوتی ہے جب اندر کی کائنات تسخیر ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم یہی سمجھ لو کہ اندر کی تسخیر کا نام ہی زندگی ہے۔ کیونکہ خیال ہی سے سب کچھ ہے۔ پہلے خیال ہے۔ خیال آئے گا تو ہی حقیقت بنے گی۔ اس کی اصل ارادہ ہے۔ انسان کے ارادے میں سب کچھ پڑا ہے، جو اس کائنات کو تسخیر کرنے کی اصل کنجی ہے۔"

"سو یہ ثابت ہوا کہ انسان کی وجہ سے ہی کائنات ہے۔ اسی کے ہونے سے سب ہے۔" میں نے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہے پھر باقی ماندہ چائے پی کر خالی پیالی ایک طرف رکھی اور بولے۔

"انسان تین طرح سے ڈیولپ ہوتا ہے۔ بدنی، روحانی اور فکری طور پر۔ بدن اس کا مٹی ہے مٹی سے پیدا ہونے والی چیزیں ہی اس کی بڑھوتری میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں۔ مٹی کی کچھ چیزیں اس کے لیے درست ہیں اور کچھ غلط۔ یہاں حلال اور حرام کا تصور ہے۔ اسی طرح روحانی طور پر اس کی عبادت اور نیکی اس کی روح کی پرورش کرتی ہے اور گناہ اس کی روح کو بیمار کر دیتا ہے۔ یہ پورا ایک عمل

ہے۔ جو بہر حال پھر کسی وقت صحیح اور علم و حکمت اس کی فکری ڈویلپمنٹ کرتا ہے۔ یہ سارا کچھ ملتا ہے تو اس میں نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ تب جا کر اسے پہچان ملتی ہے۔ یہی وہ سب کچھ ہے جو اس کے اندر کا معیار بناتا ہے۔"

"آپ کی یہ باتیں سن کر تو مجھے یوں احساس ہو رہا ہے جیسے میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک حیوانی زندگی گزار رہا تھا۔ پیدا ہوا۔ کھایا پیا اور مر گیا۔" میں نے اعتراف کیا

"یہ بھی تمہاری اپنی سوچ ہے۔ تم میں، مجھ میں ہر انسان میں وہ سب کچھ ہے جو اس کائنات کو تسخیر کرنے کے کام آ سکتا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اپنے آپ سے کتنا کام لے سکتے ہیں، خود کو کتنا تسخیر کرتے ہیں۔" انہوں نے سکون سے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے، کیسے تلاش کریں۔" میں نے پوچھا تو وہ بولے۔

"اپنی بدنی، روحانی اور فکری ڈویلپمنٹ کو درست سمت دے کر۔ اور پھر میں نے کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں کی۔ اسے تو آج کی سائنس بھی ثابت کر رہی ہے۔ جیسے ڈی این اے۔ کیا آدمؑ سے لیکر آج تک کے انسان کا ڈیٹا اس میں نہیں ہے۔ میں اس پر بھی یقین نہیں کرتا۔ مجھے اگر یقین ہے تو اس بات پر کہ ربّ تعالیٰ نے جو علم الاسماء دیا ہے۔ وہی دراصل تمام تر قوتوں کا منبع ہے۔ انسان اسی علم کو حاصل کرنے کی راہ میں خود ہی رکاوٹ ہے۔"

"کرنل صاحب، میرے جیسا انسان۔ جسے پتہ ہی نہیں ہے، اس کے اندر یہ سب کیسے پیدا ہو۔ وہ کیا قوت ہے جو اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے۔" میں نے سوال کیا تو وہ بولے۔

"شاید تم نے میری باتیں غور سے نہیں سنیں۔ نگاہ کیا ہے، یہی تو وہ چیز ہے جو اسے اچھے اور برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ نگاہ ہی اسے محبت کے بارے میں بتائے گی۔ ساری کائنات کا سلسلہ محبت کے دم سے ہے۔ محبت ادب سکھاتی ہے، ایک بات غور سے سن لو۔ انسان کی سب سے بڑی کرامت، اس میں محبت کا پیدا ہو جانا ہے۔"

"اور محبت کیا ہے؟"

"یہ مجھے بتانے کا حکم نہیں۔ جتنا بتانے کا حکم ہوا تھا بتا دیا۔ اب غور کرنا اور اپنے فکر سوچ کے مطابق عمل کرنا تمہارا کام ہے۔ جس نے تجھے اس راہ پر لگایا ہے، وہی تجھے سب بتانے کا بندوبست کرے گا۔ فی الحال تو اپنے بارے میں سوچ، تو کہاں کھڑا ہے۔ جو باتیں ہم نے کی ہیں۔ وہ تیرے اندر ہیں؟"

"یہ کیا کرنل صاحب۔ پیاس دے کر چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے تو ابھی......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

"ساتھ میں سب ہو گا۔ تو فکر کیوں کرتا ہے۔ ابھی تجھے بہت سفر کرنا ہے۔ اس سفر کو سر پر سوار مت کرو، بلکہ اس کا مزہ لو۔ لوگ زندگی کو سمجھنے میں ہلکان ہوئے پھرتے ہیں، جبکہ زندگی اپنا آپ سمجھانے کے لیے تیرے پاس چل کر آ چکی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اندر کی طرف چلے گئے۔ میں وہیں اپنی سوچوں میں کھو گیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا۔

☆......☆......☆

سورج مغرب کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔ کراچی پر شام اتر آئی تھی۔ وہ سب شاہد کے شوروم میں بیٹھے ہوئے تانی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دوپہر سے نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بلوچ تھا۔ شاہد، جسپال اور بدر شو روم میں بیٹھے بیٹھے اکتا چکے تھے۔ انہیں قطعاً معلوم نہیں تھا کہ تانی کہاں مصروف تھی اور کیا کر رہی تھی۔ اندھیرا جب پھیلنے لگا تو شاہد نے جسپال کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یار اب تو اس سے رابطہ کرو، وہ کہاں ہے اور کرنا کیا چاہ رہی ہے؟"

"تمہارے پاس فون ہے، تم پوچھ لو۔ مجھے اس سے رابطے کا کوئی شوق نہیں، وہ خود ہی فون کر لے گی۔" جسپال نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"دیکھو، خدانخواستہ اس کے ساتھ کچھ حادثہ بھی ہو سکتا ہے، وہ......" شاہد نے کہا تو جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔" لفظ جسپال کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا فون بج اٹھا۔ جیسے ہی اس نے اسکرین پر نگاہ ڈالی وہ چونک گیا اور بولا۔

"لو آ گیا اس کا فون۔" یہ کہ کر اس نے کال پک کر کے پوچھا۔

"کدھر ہو تم اور کیا کر رہی ہو؟"

"صرف دو گھنٹے مجھے مزید چاہئیں، اس کے بعد سب بتا دوں گی۔" اس نے جواب دیا

"تمہیں یہاں سے گئے ہوئے اب تک آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ یار اتنی دیر تک تو ہم کبھی نہیں بیٹھے۔ آخر تم کر کیا رہی ہو؟"

"سب کچھ میں بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال تم لوگ یہاں سے نکلو اور بنگلے پر آ جاؤ۔ دھیان رہے کہ تم لوگوں کی نگرانی ہو گی۔ میری بھی نگرانی ہوئی تھی۔ وہ لوگ ہمیں نگاہوں میں رکھے ہوئے ہیں۔"

"تم اس وقت بنگلے پر ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اب آ جاؤ تم لوگ۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

بنگلے تک پہنچتے ہوئے انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اگر انہیں پہلے سے نگرانی کے بارے میں معلوم نہ ہوتا تو انہیں نگرانی کا پتہ ہی نہ چلتا۔ دو گاڑیاں مسلسل ان کا پیچھا کرتی ہوئیں بنگلے تک آئی تھیں۔ جسپال کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ تانی کرنا کیا چاہتی ہے۔ وہ تینوں خاموشی سے آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ تبھی تانی اندر سے آئی اور ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"یہ سارہ کدھر ہے۔ باہر نہیں آئی ابھی تک؟"

"سارہ، مراد اور تمہارے ابو یہاں نہیں ہیں۔ وہ یہاں سے بہت دور نور نگر پہنچنے والے ہیں، وہ اس وقت بہاول پور سے نکل چکے ہیں اور نور نگر تک پہنچنے میں انہیں مزید ایک گھنٹہ لگے گا۔" اس نے سکون سے کہا تو شاہد ایک دم سے چونک کر یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے تانی پاگلوں والی بات کر رہی ہو۔

"تم...... تم نے انہیں کیوں بھیجا؟ وہ...... کن کے ساتھ گئے ہیں، راستے میں اگر......" غصے اور حیرت کے باعث شاہد سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"وہ تینوں اور تمہارا سونا اور جواہرات سب وہاں پر محفوظ ہیں۔ وہ سب ہمارے لوگوں کی حفاظت میں وہاں تک بائی روڈ گئے ہیں۔ سارہ نے میری بات مان لی اچھا کیا۔" تانی نے کہا۔

"وہ اب کہاں ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"بتایا نا، وہ بہاول پور کراس کر چکے ہیں۔ نور نگر میں ان کے پہنچنے کی اطلاع ہو چکی ہے، وہ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔" تانی بتایا تو بدر نے پوچھا۔

"ایسا تم نے کیوں کیا؟"

"ہاں یہ سوال تم نے ٹھیک کیا۔ اس کا سیدھا جواب تو یہی ہے کہ سونا اور جواہرات کے ساتھ سارہ لوگوں کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے۔ اور دوسرا جواب بھی سن لو، تم لاشعوری طور پر وہ کام کرتے چلتے جا رہے ہو، جو روہی والوں کو پسند نہیں ہیں۔"

"مطلب، روہی والوں کو پسند نہیں، میں نے کیا کیا ہے۔" بدر نے حیرت سے پوچھا۔

"تم عام جرائم پیشہ لوگوں کی مانند علاقے فتح کر رہے ہو، تاکہ جتنا زیادہ علاقہ تیرے پاس ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ تسلط رکھنا چاہتے ہو۔ دولت اور طاقت کے لیے تم وہ سب کرتے چلے جا رہے ہو، جو روہی والوں کا وطیرہ نہیں ہے۔"

"دولت اور طاقت کے بغیر کیا ہو سکتا ہے۔ یہاں رہ کر ان جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ان پر دبد بہ چاہیئے۔" بدر نے تیزی سے کہا۔

"لیکن منشیات کا کاروبار، ناجائز سمگلنگ، اور قتل، ہمارا کام نہیں ہے۔" تانی نے اس کے چہرے پر دیکھ کر کہا۔

"یہ سب کرنا پڑتا ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"مگر ہم نہیں کرتے، ہم صرف ان کا خاتمہ کرتے ہیں جو انسانیت کے دشمن ہیں۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"میں کیا کروں، طاقت کے بغیر......" بدر نے کہنا چاہا تو تانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں کیوں ہیں، صرف تمہیں یہ بتانا ہے کہ تمہارے بغیر بھی روہی والوں کے کام ہو سکتے ہیں۔ تم دولت اور طاقت کی ہوس میں وہ سارے اصول بھول رہے ہو، جو تمہیں بتائے گئے تھے۔ اسی لیے تمہیں دوبئی سے یہاں بلوایا گیا تھا۔" تانی نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔" بدر نے غصے میں کہا تو تانی سکون سے بولی۔

"دیکھو بدر، میں اس کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتی، یہ تیسری پارٹی کوئی اور نہیں۔ تمہاری ذاتی دشمن ہے۔ تم نے سونے اور جواہرات کی ڈیل اس سالار صدیقی سے خود کی؟"

"ہاں کی، میں سونے اور جواہرات سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"کس نے کہا تھا؟" تانی نے پوچھا۔

"وہ سونا اور جواہرات میرے تھے، وہ لوگ مجھے دے گئے تھے۔ میں جو چاہوں اس کا کروں۔" بدر نے جواب دیا

"اگر ہم میں سے کسی نے اس سے حصہ نہیں لیا تو تم بھی اس کے حقدار نہیں ہو۔ اگر ہو تو بتاؤ؟" تانی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" جسپال نے خاموشی توڑی تو تانی نے کہا۔

"اب جو کچھ کرنا ہے بدر ہی نے کرنا ہے، اگر وہ سالار سے جان چھڑا سکتا ہے تو ٹھیک، ورنہ ہم اس کا معاملہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔"

"اب ڈیل تو اس سے ہو نہیں سکے گی، اس لیے دشمنی تو ہو گئی اس سے۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے ڈیل کر لوں، مگر اب میرے پاس تو کچھ نہیں۔" بدر نے سکون سے کہا۔

"تو بس اس سے یہی کہو کہ اس نے اس ڈیل بارے شاہد سے کیوں بات کی۔ مان جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ آج رات اس کا کام کر دیتے ہیں۔" تانی نے کچھ اس طرح کہا کمرے میں موت کا سناٹا پھیل گیا۔ بدر نے چند لمحے سوچ کر فون نکالا اور سالار صدیقی کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ ذرا دیر بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے سالار ہی تھا۔ بدر نے غصے میں پوچھا۔

"تم میری نگرانی کیوں کروا رہے ہو؟"

"تم جانتے ہو، گولڈ میرے لیے نشہ ہے، جہاں یہ ہو گا، میں وہیں ہوں گا۔ تم میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ گولڈ مجھے دے نہیں دیتے ہو۔ مجھے سکون کیسے ملے گا۔ آج رات تم نے مجھے وہ گولڈ دینے کا وعدہ کیا ہے، تو نگاہوں سے دور کیسے کر دوں۔"

"لیکن تم بلاوجہ میری نگرانی کر کے خود کو مشکوک کر رہے ہو۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم مجھ سے ڈیل نہیں، گولڈ مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو؟"

"گولڈ لینا ہے میں نے تم سے۔ نگاہوں سے اوجھل کیسے کر دوں تمہیں۔ اور میں نے ہر صورت میں گولڈ لینا ہے تم سے، چاہے جس طرح دو۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں تم سے ڈیل نہیں کر رہا۔ میں وہ کسی......" بدر نے کہنا چاہا تو اس نے بات

کاٹتے ہوئے دھاڑ کر کہا۔

''اس کا انجام جانتے ہو نا تم؟''

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔ اگر کوئی خناس ہے تمہارے دماغ میں تو میں اسے نکال دوں گا۔'' بدر نے کہا تو دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ تبھی تانی نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں ۔اب نکلو یہاں سے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' بدر نے پوچھا۔

''گڈانی ۔اس کا معاملہ وہیں دیکھیں گے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دو فور وہیل جیپوں میں وہاں سے نکلے۔ شاہد کو انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی جب وہ گڈانی کے علاقے میں جا پہنچے۔ یہاں کلفٹن یا دوسرے ساحلی علاقوں کی مانند رونق نہیں تھی، کافی ویران علاقہ تھا۔ ساحل سے کچھ دور ہی انہوں نے گاڑیاں روک دیں۔ اندھیرا کافی تھا۔ تانی، بدر اور جسپال کے ساتھ چند آدمی تھے، جن کے ہاتھوں میں ٹارچ تھی۔ وہ سبھی ساحل کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ تانی اور بدر کے کاندھوں پر بڑے بڑے بیگ تھے۔ جنہیں وہ بہت حفاظت سے لے جا رہے تھے۔ ساحل کے ساتھ ہی ایک موٹر بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ جس میں وہ بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی موٹر بوٹ چل دی۔ کچھ دیر بعد ساحل سے کافی دور ایک چھوٹے اسٹیمر کی بتیاں دکھائی دینے لگیں، جو لمحہ لمحہ قریب آتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ اسٹیمر کے پاس پہنچ گئے تو ٹارچ ہی کی مدد سے ان کہ پہچان ہوئی۔ موٹر بوٹ سے اسٹیمر کی طرف جانے والے چھ لوگ تھے۔ وہ سبھی اوپر چڑھ گئے۔ وہاں اسٹیمر میں صرف تین لوگ تھے۔ اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد انہوں نے ان تینوں کو ایک طرف لے جا کر باندھ دیا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ تبھی ان میں سے ایک بندے نے ہمت کر کے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے تم لوگ، ہمیں باندھنے کا مطلب جانتے ہو کیا ہے؟''

''جانتے ہیں۔اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اسٹیمر سالار صدیقی کا ہے، جسے ہم نے بڑے طریقے سے کرائے پر حاصل کیا ہے ۔ اب ہم اسی اسٹیمر پر دوبئی جائیں گے، تمہیں کوئی اعتراض؟'' تانی نے حقارت سے کہا تو اس بندے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہ...... یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اور تم لوگ ٹھیک کر رہے تھے۔ ابھی تم نے سالار کو اطلاع نہیں دی کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ تاکہ وہ ہمیں قتل کر سکے۔'' تانی نے اس کی پسلیوں میں زور سے لات مارتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

تانی نے انہیں زیادہ وقت نہیں دیا، ان کے سروں پر پسٹل کے دستے مار کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ اس دوران بدر اور جسپال نے بیگ کھولے۔ اس بیگ میں چھوٹے چھوٹے کئی بم تھے۔ جنہیں وہ تیزی سے لگانے لگے۔ دس منٹ میں انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ سیڑھی کے ذریعے سمندر میں اُتر گئے۔ ان سے کافی دور موٹر بوٹ تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس بوٹ پر پہنچ گئے۔ وہ تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ وہ بوٹ میں لیٹ گئے۔ موٹر بوٹ چلانے والا، آہستہ آہستہ انہیں ساحل کی جانب لے جانے لگا۔

اس دوران ساحل کی طرف سے دو موٹر بوٹس تیزی سے اسٹیمر کی جانب بڑھنے لگیں تو تانی سمیت سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بدر نے اپنی جیکٹ کے اندر سے فون لیا جو پلاسٹک کے چھوٹے بیگ میں بند تھا۔ وہ بیگ ہٹا کر فون نکالا۔ فون بھیگنے سے محفوظ تھا۔ اس نے فون سے ساحل پر چھپے ہوئے لوگوں سے رابطہ کیا۔

''تم لوگوں نے سالار کو جاتے ہوئے دیکھا، وہ ان میں؟''

''جی تھا ان میں، ابھی یہاں سے گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ تیار رہو، ہم ابھی آتے ہیں لیکن یہ دیکھ لینا، ان کا کوئی آدمی یہاں پر نہ ہو۔'' بدر نے کہا تو دوسری طرف سے بتایا گیا

''جی ان کے دو آدمی ہیں یہاں پر، ان کے پاس گاڑیاں بھی ہیں۔ شاید وہاں ان کے لوٹنے کا انتظار کریں گے۔''

''انہیں ابھی کچھ نہیں کہنا۔ صرف ان پر نظر رہے۔ آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔ میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ساحل کی جانب بڑھ رہے تھے۔

تانی آنکھوں کے ساتھ نائٹ ٹیلی اسکوپ لگائے اسٹیمر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دوران خون تیز ہو رہا تھا۔ وہ دونوں موٹر بوٹس تیزی سے اسٹیمر کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ اب ان کی کامیابی کا امکان صرف یہی تھا کہ وہ لوگ اسٹیمر پر چڑھ جائیں۔ جبکہ وہ ایسا نہیں کر رہے تھے۔ نیچے سے ٹارچ کے ذریعے اشارہ دیا جا رہا تھا، مگر اوپر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہی اس پلان کا سب سے کمزور لمحہ تھا۔ تانی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بم پھٹنے میں چند منٹ رہ گئے۔ اوپر سے کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ سب تیزی سے اسٹیمر پر چڑھنے لگے۔ اب بم پھٹنے کا وقت منٹوں سے سیکنڈوں پر آ گیا تھا۔ اچانک اسٹیمر پر زوردار دھماکے ہونے لگے۔ چند دھماکوں کے بعد اسٹیمر میں آگ لگ گئی تو تانی نے ساحل کی طرف جانے کو کہا۔ یہ سب تیزی سے ساحل کی طرف گامزن ہو گئے۔ بدر نے فون نکالا اور ساحل پر اپنے لوگوں سے رابطہ کیا

''تم لوگوں نے دھماکے سنے ہیں؟''

''سنے تو ہیں، یہ کیا ہوا ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''میں آ کر بتاتا ہوں۔ وہ ساحل پر جو لوگ تھے، ان کی کیا پوزیشن ہے؟'' بدر نے پوچھا تو دوسری طرف سے بتایا گیا۔

''وہ ابھی تک وہیں ہیں۔''

''اگر ان پر قابو پا سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ ختم کر دو انہیں۔'' بدر نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی تانی نے اونچی آواز میں کہا۔

''شاید سالار بچ گیا، ایک بوٹ تیزی سے واپس آ رہی ہے۔''

''یقیناً وہ اسٹیمر پر نہیں گیا تھا۔ چلو جلدی سے ساحل پر پہنچو۔'' بدر نے کہا تو جسپال بھی اٹھ بیٹھا۔ وہ اب تک صرف تماشا دیکھ رہا تھا۔ بدر نے ساحل سے رابطہ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سالار کے آدمیوں سے کافی دور ساحل پر آ گئے ۔ موٹر بوٹ سے اترتے ہی وہ انتہائی تیزی سے اس طرف آ گئے جہاں سالار کے لوگ تھے۔

وہ سب گھات لگائے سالار کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی بوٹ ساحل پر آ لگی ۔ایک پنسل ٹارچ کی محدود روشنی میں وہ اپنی گاڑیوں کی طرف آ رہے تھے۔ وہ فون پر اونچی آواز میں کسی کو انتہائی غصے میں ہدایات دے رہا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں یہی سمجھ آ رہی تھی کہ وہ بندوں کی تلاش کرنے اور انہیں قابو میں کرنے کا کہہ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی گاڑی کے قریب آیا۔ ہر طرف سے کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ وہ روشنی میں نہایا درمیان میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو فائر ہوئے اور اس کی گاڑیوں کے ٹائر برسٹ ہو گئے۔

''سر پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھ جاؤ سالار، ورنہ ایسا ہی تمہارے ساتھ کریں گے، جیسا تیری گاڑیوں کے ساتھ ہوا۔'' تانی نے کہا تو سالار نے آواز کی سمت دیکھا اور سر پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ اگلے ہی لمحے تانی اور جسپال آگے بڑھے اور ان کی تلاشی لی۔ سالار کی جیکٹ سے دو پسٹل نکلے۔ اس کے ساتھیوں کے پاس سے جو اسلحہ ملا۔ وہ اکٹھا کر کے ایک

گاڑی میں رکھ دیا۔ تبھی بدر آگے بڑھا اور سالار کے سامنے جا کر بولا۔

"اب بتاؤ سالار، مرنے سے پہلے کا نشہ کیسا ہوتا ہے؟"

"تم نے مجھے دھوکے سے پکڑا اور ....." اس نے کہنا چاہا تو بدر نے کہا۔

"تمہارے منہ سے یہ بات نہیں سجتی سالار۔ تم نے ہمارے لیے جو جال بچھایا تھا، اسی میں پھنس گئے تو یہ دھوکا ہو گیا؟ یہ اسٹیمر کس کا ہے؟ ہم نے خود ساری معلومات تم تک پہنچائی اور تم ہمیں جال میں پھانسنے کے لیے، ہمارے ہی جال میں آتے چلے گئے، اور اب کسی چوہے کی مانند یہاں پڑے ہو۔" تانی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تو بدر سے ڈیل کی تھی، اپنا پیسہ لو اور گولڈ مجھے دو، بس۔" سالار نے کہا تو بدر بولا۔

"اور اس کے بعد......" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا، جب سالار نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولا۔

"اس کے بعد تم مجھے مار دیتے اور گولڈ تمہارا ہو جاتا۔ یہ اچھا ہوا کہ تم پھنس گئے۔ ورنہ مجھے زیادہ محنت کرنا پڑتی۔ مجھے میرے ساتھیوں کے سامنے مشکوک ہونا پڑا۔ بولو، کس سے ڈیل ہوئی ہے تمہاری؟" یہ کہہ کر اس نے زوردار گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔

"اگر مجھے یہاں سے جانے دو تو میں ساری بات بتا دیتا ہوں۔" سالار نے کہا۔

"بولو۔" بدر نے تیزی سے کہا۔

"تو سنو، مہرل شاہ اور مہر سکندر کے قتل کا بدلہ تم سے اس لیے نہیں لیا گیا کہ کچھ بیرونی طاقتوں نے انہیں روک دیا۔ کچھ سیاست دان ہیں جو ان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ گولڈ کا تو بہانہ تھا۔ اصل میں وہ تم اور تمہارے ساتھیوں تک پہنچنا چاہ رہے ہیں۔ ان کا کوئی کام یہاں نہیں ہو پا رہا ہے اور اب وہ تم لوگوں تک پہنچ چکے ہیں۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟" بدر نے پوچھا۔

"بھارت سے تعلق رکھتے ہیں اور دوبئی میں ان کا نیٹ ورک ہے۔ وہ زیادہ تر سیاست دانوں میں کام کر رہے ہیں۔" سالار نے کہا تو اچانک جسپال نے اونچی آواز میں بولا۔

"بدر، زیادہ باتیں نہ کرو۔ نکلو یہاں سے، ہم اب بھی محفوظ نہیں۔ وہ لوگ ہمیں گھیر سکتے ہیں۔"

"تمہارا یہ بندہ بہت سمجھدار ہے۔ لیکن ایسی سمجھداری کی کیا اوقات، جو بعد میں آئے۔ تم لوگ اب تک گھیرے جا چکے ہو۔ میں نے پہلے ہی ہر طرح سے تم لوگوں کا بندوبست کر دیا تھا۔" یہ کہہ کر سالار نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے تانی نے اپنا پسٹل سیدھا کیا اور سالار کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہر طرف سے فائرنگ ہوئی اور درمیان میں کھڑا سالار کا ہر بندہ گرتا چلا گیا۔

جسپال کا شک درست تھا۔ وہ لوگ جو انہیں گھیرنے والے تھے، ان سے کچھ فاصلے پر ہی تھے۔ اسٹیمر کے تباہ ہوتے ہی وہ لوگ حرکت میں آ چکے تھے۔ گڈانی کا علاقہ ان کے لیے جال ثابت ہو سکتا تھا۔ اب یہاں سے نکلنا ہی ان کے لیے سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس علاقے میں تانی کے ساتھ منسلک کچھ لوگ تھے، جو سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں یہ اطلاع تانی کو دے دی تھی۔ یہ اطلاع پاتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بولو کیا کرنا ہے اب، نکل چلیں یا ان کا مقابلہ کرنا ہے۔" تانی نے پوچھا۔

"یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔" جسپال نے کہا تو اس نے اگلے ہی لمحے کہا۔

"چلو، نکلتے ہیں۔ خواہ مخواہ الجھنے کی ضرورت نہیں بعد میں دیکھتے ہیں۔"

انہوں نے پلان طے کیا اور واپس سمندر کی جانب نکل پڑے۔ وہ زمینی راستے کی بجائے سمندری ساحل کے ساتھ کراچی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ وہ تینوں موٹر بوٹ میں بیٹھے تو ان کے ساتھی گاڑیاں وہاں چھوڑ کر اندھیرے میں نکل گئے۔

گہرا اندھیرا، نم دار تیز ہوا اور ساحل کے ساتھ سفر کرتے کرتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ ان کے درمیان خاموشی تھی۔ ان کی ساری توجہ وہاں سے نکل جانے میں تھی۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہونے کو تھا جب وہ ایک ویران علاقے میں آ کر رکے اور ساحل کے ساتھ بوٹ روک دی گئی۔ وہ بوٹ سے اتر کر خشک جگہ آ گئے۔ سامنے مٹی اور سرکنڈوں سے بنی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ اس جانب بڑھ گئے۔ وہاں ہر جانب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اچانک ان کے سامنے دو لڑکے آ کر رک گئے۔ وہ بدر کے آدمی ہی تھے۔ انہیں پہچان کر بدر بولا۔

"ہاں کہو، کیسی صورت حال ہے یہاں؟"

"ٹھیک ہے بھائی، اگر ابھی نکلنا ہے تو ایک چھوٹی گاڑی حاضر ہے، صبح تک تو بہت کچھ بندوبست ہو سکتا ہے۔" ایک لڑکے نے آہستہ آواز میں کہا تو بدر نے پوچھا۔

"دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے، تم بتاؤ، یہاں اردگرد کوئی ایسے لوگ جو اجنبی ہوں، یا ایسا ماحول جس میں کوئی مشکوک......"

"تھے ایسے لوگ اور وہ اب بھی ہیں۔ کافی ہلچل ہے ماحول میں بھائی۔"

"کتنے لوگ ہوں گے وہ سب؟" بدر نے پوچھا۔

"آپ ابھی ان کے بارے میں مت سوچیں۔ ماحول کافی سخت ہے، پولیس بھی ہے اُن کے ساتھ۔ اب پتہ نہیں وہ جعلی پولیس ہے یا......" اسی لڑکے نے کہتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہاں کوئی جگہ ہے کچھ دیر تک رہنے کے لیے؟" بدر نے پوچھا۔

"بہت، آپ آئیں تو سہی۔" اسی لڑکے نے کہا تو وہ ان کے ساتھ چل دیئے۔ وہ لڑکے انہیں ایک جھونپڑی میں لے گئے، جہاں زمین پر دری نما رلی بچھی ہوئی تھی۔ وہ اس پر بیٹھ گئے تو وہ لڑکا بھنی ہوئی مچھلی کے ساتھ تنوری روٹیاں لے آیا۔ وہ برتن ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"ہیں تو یہ ٹھنڈی۔ اگر کہیں تو گرم کر لاتا ہوں۔ ویسے کچھ دیر بعد گرما گرم چائے ضرور مل جائے گی۔"

"چل لا یار، یہ پیٹ کا دوزخ تو بھریں۔" جسپال نے کہا اور روٹیاں اپنے آگے رکھ لیں۔ جب تک انہوں نے کھانا کھایا، وہ لڑکا چائے لے آیا۔ وہ تینوں پینے لگے تو وہ لڑکا باہر چلا گیا۔ تانی کو وہ چائے اچھی نہیں لگی تھی اس لیے اس نے وہ پیالی ویسے ہی رہنے دی۔ وہ چائے پی کر تھوڑا تازہ دم ہوئے تو تانی نے لمبا لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"بدر! تمہارا فون کام کر رہا ہے یہاں؟"

"ہاں کر رہا ہے۔ کیوں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ جو ہمارے اردگرد ماحول بنا ہوا ہے اسے ختم نہ کر دیں؟" تانی نے عجیب سے لہجے میں کہا تو بدر نے پوچھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟"

"یہی کہ جو لوگ ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں، انہی پر وار کر دیں۔" اس نے سکون سے کہا تو جسپال تیزی سے بولا۔

"نہیں، میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا، ہمیں بہرحال یہاں سے نکلنا ہے۔ اب یہاں کے معاملات بدر خود جانے۔ ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

"مجھے اب نئے سرے سے سارا سیٹ اپ کرنا پڑے گا۔ میں مانتا ہوں کہ میں روہی والوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تو پھر فون کرو، ہمارے لیے پہلی فلائیٹ سے ٹکٹیں بک کروالو۔ ہمیں بھی اب نور نگر ہی

جاناہے۔"

"تو نکلیں پھر؟" بدر نے ایک دم سے کہا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی کار سے کراچی شہر کی طرف گامزن تھے۔ صبح کا نور چاروں جانب پھیل گیا تھا، جب وہ واپس بنگلے میں پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

اندھیرا کافی گہرا تھا۔ ہر طرف سکون تھا۔ شام ہوتے ہی کرنل سرفراز کہیں چلے گئے تھے۔ میں کافی دیر تک کاریڈور میں بیٹھا ان کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ان کی یہ بات کہ انسان کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اس میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بہت ہی پرکشش تھا اور اسی کی وجہ سے مجھے سوچنے کے لیے کافی راستے مل گئے تھے۔ ڈنر پر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اکیلا ہی تھا۔ ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور کرنل کی باتوں پر سوچتا رہا۔ مجھے ان باتوں کے سوچنے پر مزہ آ رہا تھا۔ یہ ذہنی مشقت مجھے خود اچھی لگ رہی تھی۔ میں بیڈ پر پڑا سوچتا رہا اور پھر نجانے میری کب آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں اٹھ کر کھڑکی میں چلا گیا۔ باہر گہرا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کافی دور کہیں کوئی گاڑی رکی ہے۔ میں نے پہلے تو اسے اپنا وہم خیال کیا، پھر یہ سوچا کہ شاید کرنل واپس آیا ہو۔

چند لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ اچانک اس گہرے سناٹے کو کتوں کی آواز نے چیر کر رکھ دیا۔ وہ بری طرح بھونکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا جس نے فضا میں سنسنی بھر دی۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ میرے اندر اچانک ہی جولانی بھر گئی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، جسے ہاتھ میں لے کر باہر نکلتا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں وہاں بیٹھا رہتا۔ میں کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک ملازم تیزی سے اندر آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولا۔

"کچھ لوگوں نے فارم ہاؤس پر چڑھائی کر دی ہے۔ وہ کون ہیں اس بارے میں نہیں معلوم، مگر باہر کچھ مشکوک لوگ ہیں۔"

"کتنے لوگ ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ابھی مجھے نہیں پتہ، مگر وہ دو گاڑیوں پر ہیں اور اندر آنے کی کوشش میں ہیں۔ ان کے بارے پتہ چل جاتا ہے ابھی۔" اس نے تیزی میں بتایا تو مجھے ایک دم سے خیال آیا۔ تب میں نے پوچھا۔

"یہ سب تمہیں کیسے پتہ اور ان کے بارے کیسے معلوم ہو جائے گا؟"

"آئیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ دو تین راہداریاں مڑنے کے بعد وہ ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ فارم ہاؤس کا کنٹرول روم تھا۔ اس میں چھ اسکرین لگے ہوئے تھے جن میں مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں دو اسکرین ایسے تھے، جن میں فارم ہاؤس کے باہر کے مناظر تھے۔ وہاں اچھی خاصی ہلچل تھی۔ فور وہیل جیپوں کے آگے چند لوگ متحرک تھے۔ وہ اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے۔ شاید وہ کتوں کی وجہ سے ابھی تک اندر داخل نہیں ہو پائے تھے۔ میں نے سارا ماحول سمجھا اور پھر اسی ملازم سے پوچھا۔

"یہاں پر اپنے بندے کتنے ہیں اور ہتھیار کہاں ہیں۔"

"ہم یہاں پر صرف چار بندے ہیں۔ تین ہم اور ایک بندہ باہر گیٹ والے کمرے میں ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ مجھے ہتھیار لا کر دو، باقی میں دیکھتا ہوں۔"

میرے یوں کہنے پر وہ مڑا اور اس نے دیوار میں لگی ایک الماری کے لوہے کے پٹ کھولے۔ اندر پڑا جدید اسلحہ دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ میں نے اپنی پسند کا پسٹل لیا۔ فالتو راؤنڈ اٹھائے اور باہر کی جانب جانے لگا تو

ملازم نے کہا۔

"سر! آپ کو اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے آپ باہر جائیں کوئی بات نہیں لیکن انہیں فارم ہاؤس کے اندر ضرور آنے دیں۔ پھر آپ دیکھیں ان کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔"

"کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔"

"سر! یہ جو کنٹرول روم میں بندہ بیٹھا ہے، یہ سب دیکھ لے گا۔" اس نے کہا تو مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی، میں اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر ملگجی روشنی تھی، جس میں صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے ان کی لوکیشن کے بارے میں اندازہ تھا اور دوسرا کتے ان کی سمت کے بارے میں نشاندہی کر رہے تھے۔ میں کاریڈور کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کتے بڑی زور سے بھونکنے لگے تھے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر کتوں کو خاموش کرایا تو باہر آنے والے لوگ الرٹ ہو جائیں گے۔ اور ایسا نہ کیا تو وہ باہر والے لوگوں کی گولی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ سو میں دم سادھے دیکھتا رہا۔ مجھ سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر ایک آدمی دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ وہ چند لمحے دُبکا رہا، پھر سر اٹھایا۔ اس نے باہر کچھ پھینکا، جس کے چند لمحے بعد دو آدمی اندر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی تین اور آ گئے۔ وہ چھ تھے۔ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ کافی حد تک پھیلے ہوئے تھے۔ کتے وہاں سے بھاگ کے دوسری جانب چلے گئے تھے اور وہ وہیں کھڑے ان پر بھونک رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک آدمی رُکا اور دوسروں کو رُک جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شاید اندر کی سُن گن لینا چاہتا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر جیسے ہی وہ اندر کی جانب آگے بڑھا اور میں نے فائر کرنے کے لیے پسٹل سیدھا ہی کیا تھا اچانک سرخ رنگ کی شعاعیں ان کی جانب بڑھیں۔ انہیں جیسے کرنٹ لگ گیا تھا۔ انہیں اپنا ہوش ہی نہیں رہا اور پہلے ہی ہلے میں تین گر گئے۔ دوسرے ابھی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ میں یکے بعد دیگرے ان پر فائر کرتا رہا۔ لیکن شعاعیں پہلے ہی اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ ملازم کیا کہہ رہا تھا۔ ان میں سے ایک واپس مڑا اور دیوار کود کر باہر جانا چاہتا تھا کہ میرے نشانے کا شکار ہو گیا۔

ایک دم سے سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کوئی کراہ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ تبدیل کر لی تھی اور کاریڈور کے دوسرے سرے پر چلا گیا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے سو فیصدی یقین تھا۔ اچانک دو آدمی اٹھے اور فائر کرتے ہوئے کاریڈور کی جانب بھاگے۔ وہ سامنے سے فائر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کاریڈور کی سیڑھیوں تک آ گئے۔ شعاعیں پھر نکلیں۔ مگر وہ اس کے اثر میں نہیں آئے تھے۔ میں نے ان کے نچلے دھڑ کا نشانہ لیا اور فائر کرنا شروع کر دیا۔ وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔ اچانک میرے سر کے اوپر سے ایک راکٹ فائر ہوا۔ وہ کسی نے چھت پر سے چلایا تھا۔ اگلے ہی لمحے باہر کھڑی گاڑی دھماکے سے پھٹ گئی۔ میں نے لمحہ بھر کی تیز روشنی میں ان بندوں کے بارے میں اندازہ کر لیا کہ کون کدھر ہے۔ دھماکے کے فوراً بعد ایک اور راکٹ چلایا گیا اور دوسری گاڑی بھی دھماکے سے تباہ ہو گئی۔ تبھی اندر سے ایک ملازم باہر آیا، اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس نے باہر آتے ہی کاریڈور میں سوئچ آن کر دیا۔ باہر لان میں دور تک روشنی ہو گئی۔ وہ چھ کے چھ وہیں پڑے دکھائی دیے۔

"وہ جو باہر ملازم تھا، اس کا کیا ہوا، اسے دیکھو۔"

"وہ محفوظ ہے اور رابطے میں ہے۔ وہ باہر والے اُس کمرے میں ہے۔" اس نے گیٹ کے ساتھ بنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس پر میں سر ہلا کر رہ گیا۔ تب اس نے کہا، "انہیں اٹھائیں، یا یہیں پڑا رہنے دیں؟"

"دیکھیں تو سہی یہ کون ہیں؟" میں نے صلاح دی

تو وہ محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ میں اس کے کور پر تھا۔ اتنے میں باہر والے کمرے سے بھی ملازم آ گیا۔ ان میں سے دو لوگ مر چکے تھے۔ جیسے ہی میری نگاہ کاریڈور کے ساتھ پڑے تین بندوں میں سے ایک پر پڑی تو میں چونک گیا۔ یہ وہی تھا، جس نے مجھے چند دن پہلے اغوا کیا تھا اور جس کی وجہ سے میں یہاں پر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میری تلاش میں ادھر آیا تھا۔ اس نے مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے ملازم سے اسے اٹھانے کو کہا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کا خون کافی حد تک بہہ گیا تھا۔ ایک ملازم نے اسے کاریڈور کے فرش پر لٹا دیا تھا۔

دو ملازموں نے مرے ہوؤں کو الگ کیا اور باقی تین باہر والے کمرے میں لے گئے۔ وہ میرے سامنے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں نے پانی اس کے منہ پر مارا تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اسے ہوش دلانے کے لیے اس کا منہ پکڑا، تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میری جانب خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر اٹکتے ہوئے بولا۔

"میں ...... میں ...... نے مان ...... لیا ...... تم خط...... طرناک...... ہو۔ بہت تلاش...... کیا میں نے ...... تمہیں اور...... اب۔" تکلیف کے باعث اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم بھارتی ہو اور تمہیں میرے قتل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں یہاں تک؟"

"میں ...... بھیجا...... نہیں گیا...... مجھے بلوایا...... گیا ہے۔ شاہنواز ...... کا پورا ایک گروہ ہے...... جو ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ تت ...... تیرے علاقے میں ہمارا ...... پورا نیٹ ورک...... چل رہا ہے۔ اس کی حفاظت...... تو ہم نے کرنی ...... ہے نا۔" یہ لفظ اس نے بہت مشکل سے کہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہچکیاں لینے لگا۔ میں نے پانی اس کے حلق میں انڈیلا ہی تھا کہ باہر کافی ساری گاڑیاں آن رکیں۔ ملازم تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ اگلے چند لمحوں میں کرنل سرفراز کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ وہ لوگ آتے ہی ان لوگوں کو اٹھانے لگے۔ میرے سامنے پڑا نوجوان میری جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"تم مجھے...... اپنے ہاتھوں سے...... مار دو۔ میں قید...... ہونا نہیں چاہتا۔"

"نہیں، تجھے کوئی بھی نہیں مارے گا۔ تم اگر علاج سے زندہ بچ گئے تو میں تم سے ملوں گا۔ جاؤ اب۔" میں نے کہا اور وہاں سے پلٹ کر اندر کی جانب چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ کرنل مجھ سے کوئی بات کریں، مگر وہ عجلت میں تھے۔ فوراً ہی واپس چلے گئے۔ میں آدھی رات گذر جانے کے بعد بھی یونہی جاگتا رہا۔ میرے حواس ہی نہیں، میرا اندر بھی جاگ گیا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یونہی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔

اس وقت صبح کی نیلگوں روشنی ہر جانب پھیل گئی تھی، جب کرنل واپس آیا۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آ کر بیٹھا۔ اس کے پیچھے ہی ملازم دو کپ چائے لے کے آ گیا۔ اس نے ہمارے درمیان کپ رکھے اور واپس مڑ گیا۔ تبھی وہ بولا۔

"وہ نوجوان جس کے حلق میں تم نے پانی ڈالا تھا، وہ رستے ہی میں مر گیا۔ اس کی لاش فی الحال میں نے مردہ خانے میں رکھوا دی ہے، پھر بعد میں دیکھیں گے۔ ویسے میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی کہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"میں مانتا ہوں چاہے جتنا جدید حفاظتی نظام ہو، جب تک بندے میں دل اور جگر نہیں ہوتا۔ وہ جدید نظام بھی بے کار ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے سنبھال لیا۔ لیکن جب میں آیا تو تم دشمن سے اتنا پیار

کیوں جتا رہے تھے؟"

"میں نے اس سے پیار نہیں کیا، بلکہ اس وقت وہ بے بس تھا۔ وہ چاہے دشمن تھا، لیکن بے بس انسان کے ساتھ اور میں کیا کرتا۔" میں نے اپنی طرف سے بہت مناسب جواب دیا تھا

"تم پہلے بھی ایسے ہی تھے یا یہاں پر کسی بات کا اثر لیا ہے۔"

"شاید پہلے ہی سے تھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے ہنس دیا

"خوب، کسی کے اندر کچھ ہو تو ہی باہر آتا ہے۔ انسان خود اپنے اعمال سے بتا دیتا ہے کہ اسے مٹی کیسی لگی ہے۔ مٹی بھی حلال اور حرام ہوتی ہے اور حرام مٹی منافق کو لگتی ہے۔ اس کے ساتھ پیار جتانا خود اپنے آپ کے ساتھ دھوکا ہے۔"

"یہ منافق کا پتہ کیسے چلتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"منافق ہوتا ہی وہی ہے جس کے بارے میں تب پتہ چلے، جب وہ منافقت کر جاتا ہے۔ میں نے تیئس برس تک ایک ایسے بندے کو پالا جو خود کو انسان ثابت کرتا رہا۔ لیکن بعد میں جب وہ منافقت کر گیا تو پتہ چلا کہ اسے مٹی ہی حرام لگی ہوئی تھی۔ بابا جی بلھے شاہ سرکار نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے نا کتے تیتھوں اتے۔"

"دوست اور دشمن کا پتہ اُسی وقت چلتا ہے۔ جب مشکل آن پڑے۔ ان کے بارے بندہ کلیئر ہو جاتا ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ لیکن منافق کی منافقت کے بعد بھی بندہ نہ سنبھلے تو وہ خطا کھاتا ہے۔ وہ پھر نہیں سنبھل سکتا۔"

"میں آپ کی بات یاد رکھوں گا۔" میں نے دل سے کہا تو وہ بولے۔

"آج تم نور نگر واپس جاؤ گے۔ پتہ نہیں آگے حالات کیا بنتے ہیں لیکن مجھے نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا کہ تم لوٹ کر یہاں ضرور آؤ گے۔" انہوں نے کچھ ایسے عجیب لہجے میں کہا کہ میں اندر سے بھیگ کر رہ گیا۔ اس لیے جلدی سے بولا۔

"یقین جانیں اگر نور نگر میں معاملات پھیلے نہ ہوتے تو میں یہیں رہ جاتا۔ بہت سکون ہے یہاں پر، میں یہیں رہنا پسند کرتا۔"

"لیکن تمہارے مقدر میں سکون نہیں ہے اور نہ ہی اس کی خواہش کرنا۔ خیر اب اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔ ڈرائیور تمہیں نور نگر چھوڑ آئے گا۔"

اس کے کہنے پر میں اٹھا تو وہ بھی اٹھ گیا۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگایا تو ایک لمحے کے لیے مجھے وہ وقت یاد آ گیا، جب میں گوپے میں بابا جی سے ملا تھا۔ ویسی ہی ٹھنڈک میرے اندر اتر گئی تھی۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مجھے کائنات میں پھینک دیا گیا ہو اور میں بے وزن ہو گیا ہوں۔ چند لمحے یہی کیفیت رہی۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے الگ کیا میں خود میں بہت بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اس تبدیلی کا پورا پورا احساس تھا۔ یہ کیا معمہ تھا، اس کی مجھے اس وقت سمجھ نہیں آئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں وہاں سے نکلا تو بہت زیادہ پرجوش تھا۔ وہ دونوں کتے میرے ساتھ گاڑی میں میرے ساتھ نور نگر جا رہے تھے۔ جنہیں میں کتے کہہ رہا تھا۔ وہ منافقوں سے زیادہ اچھے تھے، انہیں میں کیسے بھول جاتا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کا سورج اپنی دھوپ سمیت بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا، جب تانی اور جسپال، نور نگر کے قریب پہنچ گئے۔ دوپہر سے پہلے وہ بہاول پور ائیر پورٹ پر اترے تھے، جو انہیں ویران سا لگا تھا۔ شاید اس لیے بھی ویران لگا کہ وہ چھوٹا ائر پورٹ تھا اور بہت کم سواریاں اتری تھیں۔ وہ ائیر پورٹ سے باہر آئے تو سامنے سرمد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے سیاہ رنگ کی فور وہیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ بہت تپاک سے ملا، وہ دونوں سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ایک بندے کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا۔ وہ

جیسے ہی نورنگر کے قریب پہنچے تو ڈرائیور نے پوچھا۔

"اگر آپ کہیں تو نورنگر فون کر دیا جائے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔"

"تمہارے پاس نمبر ہے، اور کسے کرو گے فون؟" جسپال نے مسکرا کر پوچھا تو ڈرئیور نے سنجیدگی سے کہا۔

"سرو ہی کا مسلسل رابطہ ہے وہاں۔ اشفاق نامی ایک نوجوان ہے وہ۔ جمال کے بہت قریب ہے۔"

"تم گھر جانتے ہو؟" تانی نے پوچھا۔

"میں پہلے کبھی نہیں گیا لیکن پہنچ جاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ تانی محسوس کر رہی تھی کہ یہ کوئی ایسے سوال نہیں تھے جو پوچھے جائیں، بس یونہی وہ خاموش رہ رہ کے اکتا چکی تھی، دوسرا شاید اس کے اندر خوشی تھی کہ وہ جمال کے پاس جا رہی ہے۔ جمال کے تصور کے ساتھ ہی اسے سوہنی کا خیال بھی آیا۔ ایک وہی تھی جو جمال کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ پتہ نہیں مستقبل میں اس کے ساتھ کیسا رویہ اپنانا پڑے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ سوہنی بھی اس وقت نورنگر میں ہے۔ تانی نے سوچ لیا تھا کہ وہ ہر ممکن حد تک سوہنی کے ساتھ اپنا رویہ اچھا ہی رکھے گی۔ دونوں کے تعلق میں سوہنی کا رویہ ہی بنیاد ثابت ہوگا۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ وہ نورنگر گاؤں کے داخلی راستے پر آ گئے۔ جہاں اشفاق عرف چھاکا اپنے ساتھ چند لوگوں کو لیے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا تو ڈرائیور نے جیپ روک دی۔ چھاکا آگے بڑھا اس نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تانی اور جسپال' میرے گاؤں نورنگر میں خوش آمدید۔ جی آیاں نوں۔"

"ہمیں پہچان لیا تم نے ؟" جسپال نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دوستوں کی خوشبو، دور ہی سے آ جاتی ہے۔ اور تم دونوں تو پھر اپنے ہو۔ آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اپنی بائیک پر جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے جیپ اس کے پیچھے لگا دی۔ ان کے سفر کا اختتام جمال کے گھر کے سامنے ہوا۔ وہ جیپ سمیت اندر چلے گئے۔

جمال اور اس کی ماں سامنے ہی صحن میں نیم کے درخت تلے چارپائی پر بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھا۔ پہلے اس نے جسپال کو سینے سے لگایا اور پھر تانی سے گلے ملا۔ جسپال نے آگے بڑھ کے اماں کے قدموں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ماں نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا اور سر پر پیار دیتے ہوئے دعائیں دینے لگیں۔ تانی ماں سے گلے ملی اور پوچھا۔

"اماں جی، یہ سوہنی کدھر ہے؟"

"وہ ابھی کچھ دیر پہلے حویلی گئی ہے، ادھر کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنا ضروری تھا۔ تم لوگ بیٹھو، میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔"

"ہاں اماں یہ کام تو کرو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" جسپال نے کہا اور چارپائی پر پھیل گیا۔

"یہ سارہ بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔" تانی نے پوچھا۔

"وہ حویلی ہی میں رہتی ہے۔" جمال نے کہا۔ پھر جو ان میں باتیں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھیں۔ جمال نے کرنل سے ہونے والی باتوں کو گول کر دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ باتیں ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتا تھا۔ اس نے جسپال کی روداد سنی۔ اس دوران کھانا بھی کھا لیا گیا۔ مغرب کے بعد تک سوہنی واپس نہیں پلٹی تو وہ سب حویلی کی طرف چل دیئے۔ اماں گھر پر رہی۔ کچھ دیر بعد وہ سارے حویلی کے ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ایک طرف جمال، جسپال اور چھاکا بیٹھا ہوا تھا تو دوسری جانب سارہ، تانی اور سوہنی تھی۔ ان کے درمیان کھانے پینے کی بہت ساری نعمتیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ باتوں میں مگن تھے۔ تبھی جسپال نے ایک نئی بات چھیڑی

"یار جمال! ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم کبھی ملیں گے اور اس طرح ایک چھت تلے اکٹھے ہوں گے۔ یہ رَبّ کی کیا مرضی ہے یار؟"

"وہ تم نے سنا نہیں ہے کہ بندہ ہی بندے کی دوا ہوتا ہے۔ میں اکیلا تھا۔ جنہیں اپنا دوست خیال کرتا تھا، وہ سب منافق نکلے۔ پر رَبّ کی اپنی مرضی ہے۔ میرے ساتھ ہر خیال کا بندہ آتا چلا گیا۔ میں جو خود کو بڑا کمزور سمجھتا تھا، آج بہت حوصلہ مند ہوں۔ میں نے یہ جان لیا ہے کہ وقتی شکست، ایک بہت بڑی فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اگر نیت درست ہو۔" جمال نے جواب دیا

"ہاں' یہ تو ہے۔ میرے خیال میں اب سکون چھا گیا ہے۔ دور دور تک تیرے دشمن نہیں ہیں۔ میں اب واپس کینیڈا چلا جاؤں۔ کیونکہ پھر وہیں سے انڈیا جا سکوں گا۔"

"کیوں، ہر پریت کی بہت یاد آ رہی ہے نا۔" تانی نے کچھ ایسے کہا کہ سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ تبھی جمال بولا۔

"جسپال، اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ تم جاؤ، تمہارے بھی اپنے تیری راہ تک رہے ہیں۔ جہاں تک دشمنی ختم ہو جانے کی بات ہے، ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ پتہ ہی اب چلا ہے کہ دشمن اور دشمنی ہوتی کیا ہے۔ مجھے اپنی ذات کے لیے نہ پہلے کچھ چاہیے تھا اور نہ اب چاہتا ہوں۔ جو انتقام میں نے، لینا تھا وہ لے لیا۔" وہ کہہ چکا تو اس پر اچانک سوہنی نے کہا۔

"مایوس ہو گئے ہو جمال؟"

لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ اس نے چونک کر سوہنی کی جانب دیکھا۔ کچھ دن پہلے وہ اس راہ سے دستبردار ہو جانے کا کہہ رہی تھی اور اب اس نے جس طرح یہ سوال کیا تھا اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ نہیں چاہتی۔ یہ تضاد، کیوں؟ یہی سوال اس کے ذہن میں پھیل گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو سوہنی؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ بڑے سکون سے بولی۔

"ضروری نہیں ہے کہ ہم بڑھ کر لوگوں کو اپنا دشمن بنائیں، ہمیں اپنا کام کرنا ہے، بہت کام کرنا ہے۔ ہم ساری دنیا کو ٹھیک نہیں کر سکتے تو نہ سہی لیکن اپنے آپ کو تو ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔" جمال نے پوچھا تو وہ اسی سکون سے بولی۔

"ہمارے اپنے مقاصد ہیں۔ ان کی راہ میں کوئی بھی آیا تو وہ ہمارا دشمن ہوگا۔ ابھی ہم نے کیا کچھ نہیں کرنا، کیا تمہیں یاد نہیں تم نے میرے ساتھ کیا کیا وعدے کئے ہوئے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اس ملک میں انسانیت کے سب سے بڑے قاتل یہاں کے جاگیردار اور وڈیرے ہیں۔ اور اب ان کے ساتھ وہ نو دولتیئے بھی شامل ہو گئے ہیں، جو انہی غریب عوام کا لہو چوس کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں؟ سارے کے سارے سیاست دانوں کا روپ دھار کر ایوانوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اس عوام کے ساتھ؟ کبھی سوچا؟ سارا ملک شاید ہم ٹھیک نہ کر سکیں، مگر جہاں تک ہماری دسترس ہے، ہم ان کے لیے کچھ کریں گے، چاہیے اس کا طریقہ کوئی بھی ہو۔ یہ جو ہمارے ارد گرد لوگ ہیں، جو ہمارے اپنے ہیں، کیا ان کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے۔ شاید یہاں پر شاہ اتنا ظالم نہ ہو مگر شاہ کے مصاحب زیادہ ظالم ہیں۔"

سوہنی جس طرح جذباتی انداز میں یہ سب کہتی چلی جا رہی تھی، جمال کے ہونٹوں پر اسی طرح مسکراہٹ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ چکی تو اس نے کہا۔

"جیسے تم کہو، میں تو پہلے ہی تم سے یہی کہتا تھا۔"

"تو پھر سنو' ہمارے سب سے بڑے دشمن وہ بے غیرت سیاست دان ہیں جو عوام کو بے شعور رکھے ہوئے ہیں۔ عوام کو الف بے پڑھنے کی تو اجازت ہے لیکن شعور سے بے بہرہ کئے دے رہے ہیں۔ چند لوگوں کو خوش کرنے اور انہیں نوازنے والا کوئی بھی دستور ہو، ہم اسے نہیں مانتے۔ یہیں اس علاقے کے سیاست دانوں سے آغاز کرنا ہوگا۔"

”ہوگیا۔“ جمال نے ایک دم سے کہا تو ماحول میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ یہ خاموشی کچھ طویل ہوئی تو سوہنی نے اس کی طرف دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولی۔

”اب آپ چاہیں تو آرام کریں۔“

اس کے یوں کہنے سے سبھی اٹھ گئے۔ جب سارے کمروں میں جا کر لیٹ گئے تو سوہنی نے جمال کو لیا اور گاؤں والے گھر میں آگئی۔

☆......☆......☆

میں اور سوہنی چھت پر کھڑے دور اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ میں اس سے پہلے آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے ساتھ آ کر کھڑی ہوگئی، شاید میرے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے چہرے ہی پر دیکھ رہی تھی۔

”اتنی بڑی تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں سوہنی؟“

”میں نے بہت سوچا ہے۔ جمال، تم ٹھیک ہو اور میں غلط تھی۔ زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے، ابھی ہے، ابھی نہیں ہوگی۔ کون اس بارے میں حتمی بات کر سکتا ہے۔ جس دن میں تمہیں ان راستوں سے لوٹ آنے کا کہہ رہی تھی، ضد کر رہی تھی تم سے، اس وقت مجھے ادراک نہیں تھا کہ سانپ تو سانپ ہی ہوتا ہے، اس کا بچہ بھی سانپ ہی ہوتا ہے۔“

”کہیں تم شاہ زیب کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”میں وقاص پیرزادہ کی بات کر رہی ہوں۔ وہ محض دشمنوں ہی سے نہیں ملا، بلکہ اپنی قوت بڑھانے کے لیے اس نے نجانے کن کن لوگوں سے ساز باز کر لی ہے۔ اس کا پہلا ٹارگٹ میں ہوں۔ اب یہ مت سمجھنا کہ جب مجھ پر پڑی ہے تو میں تمہیں اس کے خلاف اکسا رہی ہوں۔ بلکہ......“

”اصل بات بتاؤ، کہانیاں چھوڑو۔“ میں نے اکتا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”یہ پیرزادہ وقاص اور چوہدری شاہنواز بہت عرصے سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہیں۔ اس کا تمہیں علم ہی ہوگا۔ شاہنواز جب سے خفیہ والوں کے ہتھے چڑھا ہے وقاص نے اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ ایک طرف خود بھارتی لوگوں کی مدد کر رہا ہے تو دوسری جانب یہاں پر بھارتی لوگوں کا نیٹ ورک اس کے ساتھ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب اور ملک سجاد نے بھی اس سے دوستی کر لی ہے۔“

”یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے سوہنی، ایسا انہوں نے کرنا ہی تھا، لیکن تم ان کا ٹارگٹ کیسے ہو؟ یہ بتاؤ۔“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”میں نے تعلیم کے ذریعے لوگوں میں شعور پھیلانے کی مہم کا جیسے ہی آغاز کیا تو یہاں پر میری زبردست مخالفت ہوئی ہے۔ پہلے تو میں سمجھ ہی نہیں سکی لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پورے علاقے کے وہ شہ زور جو یہاں میلے میں میدان جیتتے رہے ہیں۔ وہ اب پیرزادہ وقاص کے ذاتی ملازم ہیں اور اسی کی ایما پر یہاں کے بہت سارے لوگ بھی ایسی تعلیم کی مخالفت کر رہے ہیں، جو یہاں کے سرکردہ ہیں۔ وہ اس تعلیم کو مذہب کے خلاف کہہ رہے ہیں۔“

”تمہارے نصاب میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے وہ......“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ میں نے تو صرف ایک بات کو، بلکہ ایک آیت کریمہ کو سامنے رکھا ہے اور وہ ہے۔ تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ میرا سارا انصاب اسی بات پر ہے۔“

”تو پھر میں دیکھ لوں گا سب کو۔ ایک صرف ہمارا دین ہے جس میں عورت اور مرد دونوں کی تعلیم فرض قرار دی گئی ہے۔ جتنا حق کسی مرد کا ہے اتنا ہی کسی عورت کا حق بھی ہے۔ تم گھبراؤ مت، تیرا اور میرا دشمن ایک ہی ہے۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا

”علاقے میں منفی پروپیگنڈا پھیل رہا ہے۔“ اس

نے کہنا چاہا تو میں نے بتایا۔

”یہ منافق لوگوں کا ہتھیار ہے، انہیں سے بچنا ہے، لیکن جب سامنے حق آجاتا ہے تو یہ لوگ کسی خارش زدہ چوہے کی مانند چھپ جاتے ہیں۔ حوصلہ اور اپنی نیت درست رکھو۔ ربّ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔“

”اب مجھے حوصلہ آ گیا ہے جمال اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ ربّ میرے ساتھ ہے۔“ اس نے جذب سے کہا تو میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہ گیا، تبھی اس نے یوں کہا جیسے اسے یاد آ گیا ہو۔ ”سارہ، اس کا بیٹا مراد اور سسر یہاں پر ہیں۔ میں نے انہیں حویلی میں رکھا ہے۔ ان کے بارے میں کیا ارادہ ہے۔“

”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے واقعتاً کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بہت بڑی دولت اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ دو دن ہوئے وہ یہاں کے بارے باتیں پوچھ رہی تھی۔ یہاں کا سارا سیٹ اپ اس نے دیکھا تو اس نے اپنی ساری دولت اس سیٹ اپ میں لگانے کے لیے میرے سامنے ڈھیر کر دی اور اس نے یہیں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“

”نہیں، وہ دولت ہماری نہیں ہے اور میرے خیال میں وہ یہاں رہ بھی نہیں سکے گی۔ خواہش اور فیصلے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بس اس کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے۔ اسے بہت عزت اور احترام دینا۔“ میں نے اسے سمجھایا تو بولی۔

”جیسے تم کہو۔“

اس نے کہا تو ہم میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے ایسے ہی تنہائی کے لمحوں میں وہ میرے ساتھ لگ کر سکون محسوس کیا کرتی تھی۔ آج اس نے میرے وجود کے لمس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مجھ سے فاصلے پر ہی کھڑی رہی۔ کچھ لمحے یونہی گذر گئے تو میں نے کہا۔

آؤ چلیں، مجھے چھاکے سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے آگئی۔ ہم دونوں چھت پر سے نیچے آگئے۔

چھاکا باہر والے کمرے میں، میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر میری جانب کروٹ لے لی، میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”چھاکے، اپنے علاقے کی صورت حال کیا ہے؟، کچھ پتہ بھی ہے یا......“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا۔

”پتہ ہے، سب پتہ ہے، اگر شاہنواز پکڑا گیا ہے تو اس کے حواری کیا چپ بیٹھے ہوں گے۔ وہ پہلے سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ تمہارے خلاف اس قدر زہر اگلا جا رہا ہے کہ لوگ تم پر اعتماد ہی نہ کریں اور اس وقت اس کا سب سے زیادہ فائدہ پیرزادہ وقاص لے رہا ہے۔“

”کیا کر رہا ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”چوہدری شاہ دین اور چوہدری شاہ نواز کو وہ اس علاقے کا نجات دہندہ بنا کر پیش کر رہا ہے اور تجھے، ڈاکو، جو عزت دار لوگوں سے ان کی حیثیت چھین رہا ہے۔ قاتل، چور اور ڈاکو، جو اس علاقے پر غنڈہ گردی سے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اور بس۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا عجیب ہو رہا تھا، جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت دکھ ہو رہا ہو۔

”یہ تو ہوتا ہی ہے، مخالف پھول برسانے سے رہے، وہ تو آگ ہی اگلیں گے۔ خیر تم اس کو اپنے ذہن پر مت سوار کرنا۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

”ایک اور بڑا کھیل دکھا رہا ہے وہ۔ ایک پیر صاحب نجانے کہاں سے لایا ہے، وہ لوگوں میں عجیب باتیں کر رہا ہے۔ انہیں خوف زدہ کر کے نجانے کس دین کی تبلیغ کر رہا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولا تو میں ہنس دیا۔

''ایسا ہوتا ہے، ہمارے ہاں ابھی بہت سارے لوگ ضعیف الاعتقاد ہیں۔ ایسے لوگوں کی باتوں میں زیادہ آجاتے ہیں۔ کہا نا تم فکر نہ کرو۔ ربّ تعالیٰ بہتر کرے گا۔''

''تم آگئے ہونا۔ یہ بات انہیں معلوم ہوگئی ہوگی اور تم بچ جانا، وہ سیدھے سبھاؤ تم سے مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ کوئی سازش بنائیں گے، دھیان رکھنا۔'' اس نے تیزی سے یوں کہا جیسے یہ بات اسے ابھی یاد آئی ہو۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر اسے سو جانے کا کہہ کر باہر والے کمرے سے اندر آگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔

اگلی صبح میں، جسپال اور تانی ڈیرے پر چلے گئے۔ بھیدے نے پہلے سے کہیں زیادہ مویشی پال لیے تھے۔ چھاکا اس کے ساتھ کاروبار کرنے لگا تھا۔ ہم وہاں دھری ہوئی چارپائیوں پر جا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بھیدے سے وہاں کا حال احوال لے رہا تھا کہ باہر گیٹ پر ایک کار آکر رکی۔ چند لمحوں بعد علاقے کے وہ معززین اندر آگئے جو ہر سال میلہ منعقد کرواتے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ میرے پاس یوں آئے تھے۔ میں نے انہیں احترام سے بٹھایا اور تپاک سے ملا۔ وہ سات لوگ تھے۔ بھیدے کو مزید چارپائیاں نکال کر لانا پڑیں۔ وہ سب بیٹھ گئے، حال احوال بھی ہو گیا تو ان میں سے ایک بزرگ نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''بیٹا! ہم سب علاقے کے بزرگ تیرے پاس خود چل کر آئے ہیں۔ تم سے ایک درخواست کرنا تھی، اگر تم قبول کرلو تو۔''

''آپ کیسی بات کر رہے ہیں، آپ اپنے آپ کو میرا بزرگ بھی کہہ رہے ہیں اور ایسی بات بھی، میں سمجھا نہیں یہ کیا ہے؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! نجانے کب سے ہر سال مسافر شاہ کے میدان میں میلہ لگتا آرہا ہے۔ لیکن پچھلے سال نہیں لگا۔ اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو۔ اسی وجہ سے درخواست پڑ رہی ہے۔'' اس بزرگ نے اپنا لہجہ حد درجہ ... بناتے ہوئے کہا تو مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک طرح میں بات تو سمجھ گیا تھا لیکن ان سے پوری بات کہلوا... کے لیے میں نے کہا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہ ر... ہیں اور میں بھی نہیں جانتا کہ پچھلے برس میلہ کیوں نہ... لگا تھا۔''

''تم ہی تھے بیٹے، جس کی فائرنگ نے میلہ اُجاڑ... تھا۔ پتہ ہے چار بندے مرے تھے پیرزادہ وقاص ... اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تو اب یاد بھی نہیں ... سارے تم سے ڈرتے ہیں اور پھر اس میں ناچنے والی ... لڑکی تیرے گھر آگئی، جس کی وجہ سے چوہدری شا... دین کے ساتھ تمہاری مخالفت چلی، ایسے میں ... بھلا کیا لگتا۔ چوہدری شاہ دین بھی گیا، اور اس کا بیٹا بھی، جسے تم نے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہی لوگ ... ہوتے تھے میلہ لگوانے والے۔ اب وہ نہیں تھے ... تمہارا ڈر تھا، میلہ کیسے لگتا؟''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میلہ میرے ... کی وجہ سے نہیں لگتا اور اب چوہدری نہیں ہیں تو میلہ نہیں لگتا۔ یہی بات ہے؟'' میں نے تصدیق چاہی ... اس بزرگ نے سر ہلا کر کہا۔

''ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔''

''کیا میں نے کسی کو روکا میلہ لگانے سے؟ ا... معاملے میں کسی سے بات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، چاہے نہ ہوئی ہو، لوگ تو تمہارے نام ... کانپتے ہیں۔ ایسے میں میلہ کہاں لگے گا اور پھر چوہدری کی حویلی پر اب وہ سوہنی مائی کا قبضہ ہے۔ اس لیے......'' بزرگ نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہو... کہا۔

''بزرگو! اس نے قبضہ نہیں کیا، اپنا حق لیا ... ہے وہ۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سوہنی مائی، اسی شاہ...

...ی بیٹی ہے۔ اس کا اپنے باپ شاہ دین کے ساتھ جھگڑا ...، میرا نہیں تھا۔ شاہ زیب اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ... در ہے، کسی کے خوف سے نہیں۔'' میں نے کہا تو ... دوسرے بزرگ نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

''چلیں، ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں اور ماننے بغیر ... کیا کر سکتے ہیں اور پھر ہم یہاں بحث تو کرنے آئے ... ہیں، سیدھے سیدھے تم سے بات کرنے آئے ہیں ... ہم میلہ لگوالیں؟''

''میں کون ہوتا ہوں اجازت دینے والا، کیا پہلے ... کی اجازت سے میلہ لگتا تھا؟'' میں نے بات کو کسی ... نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ بڑا اوچھا وار کیا تھا مجھ پر۔ ... یہ وہ بہت سوچ سمجھ کر آئے تھے۔

''دیکھو، بات پھر وہیں آجائے گی کہ پچھلے میلے میں ... تمہاری وجہ سے......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے بات ... کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا میں نے ہنگامہ کیا تھا؟ میں نے پیرزادہ ... قاص سے کہا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو ہتھیار دے کر ... یہاں لائے اور ہنگامہ کرے۔''

''تم بھی تو ہتھیار لے کر آئے تھے بیٹا۔'' تیسرے ... نے کہا۔

''تو آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''ہم کچھ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہم تو یہ ... چاہتے ہیں کہ اس بار میلہ لگے اور تمہاری نگرانی میں ... لگے۔'' ایک بزرگ نے کہا تو دوسرا فوراً بولا۔

''نگرانی میں نہیں بلکہ تم خود میلہ لگواؤ، انتظام ہم کر ... دیں گے۔ علاقے کے شہ زوروں میں بہت مایوسی پھیل ... رہی ہے۔ وہ سب سارا سال تیاریاں کرتے ہیں۔''

''آپ سب میرے بزرگ ہیں، یہ میں نے پہلے ... ہی اقرار کرلیا ہے، آپ اس طرح نہ کریں، میں بہت ... چھوٹا سا بندہ ہوں، میری کیا جرات کہ میں علاقے کے ... خلاف ہو سکوں۔ آپ جو چاہیں سو کریں، آپ کو پورے ... علاقے نے اختیار دیا ہوا ہے۔ مجھ سے جو خدمت چاہیں وہ میں حاضر ہوں۔'' میں نے انتہائی انکساری سے کہا۔

''دیکھو! سیدھی سی بات ہے، علاقے کے لوگوں کو تمہاری طرف سے ہی خوف ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری مرضی ہوئی تو میلہ لگ جائے گا ورنہ......'' اُن میں سے ایک بزرگ نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ورنہ میلے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم میلے کی حفاظت کا ذمہ لو تو ہم میلے کا انتظام کرتے ہیں۔'' ایک نے کہا تو میں چونک گیا۔ لیکن بڑے تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ سیدھے سیدھے مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہیں کہ میں ہی میلے کو اجاڑنے کا سبب ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ مجھے آپ الجھن میں نہ ڈالیں، میں اگر ذمہ داری لے لوں تو وہاں کوئی بھی اپنا کام کر جائے۔ بات تو مجھی پر آئے گی اور اگر میں ذمہ داری نہیں لیتا تو کوئی اپنا کام کر گیا تو پھر بھی مجھی پر بات آئے گی۔ آپ لوگ میرے خیر خواہ ہیں یا دشمن بن کر آئے ہیں۔ کس نے بھیجا ہے آپ کو؟'' میں نے ایک دم سے کہا تو ان میں ایک دو مسکرا دیئے۔ میں نے ان کی توقع کے مطابق بات کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ تبھی کچھ دیر خاموشی کے بعد ایک بولا۔

''دیکھو۔ ابھی کچھ وقت ہے تم کل تک سوچ لو ٹھنڈے دل سے۔ ہم پھر آجائیں گے۔ اب میلہ ہونا یا نہ ہونا تمہاری مرضی پر ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اب ہم چلتے ہیں۔'' ایک نے کہا تو سبھی اٹھ گئے، انہوں نے میری ہاں یا نہ، نہیں سنی اور خاموشی سے ہاتھ ملا کر باہر چلے گئے۔ وہ جب چلے گئے تو جسپال نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تیرے خلاف کافی نفرت پھیلی ہوئی ہے

یہاں پر اور یہ 'کھچرے بابے' تجھے پھنسانے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کس کے کہنے پر کر رہے ہیں۔ بڑی زبردست پلاننگ کی ہوئی ہے انہوں نے۔ علاقے کے لوگوں میں جان بوجھ کر نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔" میں نے کافی حد تک دکھ سے کہا تو تانی تڑپ کر بولی۔

"تو پھر کیا ہوا جمال، نفرت ہی ہے نا۔ ہم اسے محبت میں بدل دیں گے۔ یہی بابے تمہارے گن گائیں گے۔ میں کہتی ہوں لگائیں میلہ اور پھر دیکھتے ہیں کون سے دشمن ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

"دشمن بھی سامنے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ بولی۔۔

"اب وہ آئیں نا تو کہہ دینا، ہم میلہ کروائیں گے۔"

"او تانی تُو یہ سب جذباتی انداز میں کہہ رہی ہے۔ دیکھ رہی تھی کہ وہ سب سوچ کر آئے ہیں۔ یہاں مقامی ہی نہیں، باہر کے لوگ بھی اپنا کام دکھائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ساری کالک میں اپنے منہ پر تھوپ لوں۔ مجھے انہی لوگوں میں رہنا ہے، انہیں میں کام کرنا ہے۔ میں یہاں نفرت نہیں محبت چاہتا ہوں۔ میں آج جا کر پیرزادہ وقاص کو گولی مار دوں۔ کیا سمجھتی ہو، میرے بارے میں افواہیں یقین میں نہیں بدل جائیں گی؟"

"تو پھر کیا کریں؟" اس نے اُکتاتے ہوئے کہا تو میں نے سکون سے جواب دیا

"بتانے والے خود ہی بتا دیں گے۔ دیکھتے ہیں، وہ کب اور کیسے بتاتے ہیں۔"

"چلو جی قصہ ہی ختم، ویسے یار یہ تیرا میلہ ہوتا کب ہے۔" جسپال نے پوچھا۔

'کیوں، تو کیوں پوچھ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر جلدی ہو جائے تو میں ادھر رہوں، اور اگر ... ہو تو چلا جاؤں۔ یا پھر جو بھی فیصلہ کرنا ہو جلدی کر لو، مجھے کچھ جلدی ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ میں ایک دم سے ہنس دیا۔ اس نے بڑی گہری چوٹ ... تھی۔

"جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال سکون کے یہ دن گذار دو۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"تم اسے سکون کہتے ہو، ادھر ہر پریت میری ... تک رہی ہوگی۔" جسپال نے حسرت سے کہا۔

"یار تمہیں واقعی اُس سے محبت ہو گئی ہے۔" ... نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا

"ہاں۔ دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس رہوں یا ... میرے پاس رہے۔ شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔" ... دھیمے سے لہجے میں بولا۔ تبھی تانی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"محبت قربت کی محتاج تو نہیں ہے۔ ہزاروں میل کی دوریاں بھی ہوں نا تو محبت کم نہیں ہو جاتی ... دوریاں، یہ ہجر تو محبت بڑھاتی ہیں۔ دوسرے کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ یاد آتا ہے۔"

"کیا تم قربت کی لذت سے انکار کرو گی؟" جسپال نے کہا تو وہ بولی۔

"محبت ہونا تو پھر ہجر کیا اور وصال کیا، دونوں لذت دیتی ہیں۔"

"اچھا یہ محبت کے فلسفے کو کچھ دیر ایک طرف رکھو ... ابھی چلیں، اماں انتظار کر رہی ہوگی۔ چل کے ناشتہ تو ... لیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گئے۔ ... دیر بعد ہم گھر پہنچ گئے تو سوہنی نے ناشتہ لگا دیا ... ہمارے انتظار ہی میں تھی۔

دوپہر سے ذرا پہلے میں اور چھاکا باہر والے کمرے میں تھے۔ باقی سب حویلی میں تھے۔ وہ اماں کو بھی وہیں لے گئے تھے۔ میں نے ڈیرے پر ہونے والی باتوں کے بارے میں اسے بتایا تو وہ چند لمحے سوچتا ... پھر بولا۔

"پیرزادہ وقاص نے اپنی طرف سے یہ سازش کی ... وہ ہمیں پورے علاقے میں گندہ کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر کیا کہتے ہو تم؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو سیدھے پیرزادہ وقاص ہی کو ... لیتے ہیں۔ اس پر کوئی اور مدعا ڈال کے، اسی کو دبا ... دیتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"لیکن وہ جو کیڑا لوگوں کے دماغ میں ڈال چکا ... اس کا کیا کیا جائے۔ اسے گولی مار دینا بہت آسان ... وہ تو یہ چاہتا ہے، ہم اس پر چڑھ دوڑیں اور وہ مظلوم ... بن جائے۔ منافق کا یہی تو کام ہوتا ہے کہ وہ مظلوم بن ... ہمدردیاں حاصل کرتا ہے۔ ایسا نہیں چھاکے۔ ... سازش کا مقابلہ ایسے کیا جائے کہ اس کی سازش اسی پر ... الٹ دی جائے۔ یا کم از کم وہ ننگے تو ہو جائیں۔ ان کا ... اندر باہر آ جائے" میں نے اسے سمجھایا تو وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو پھر ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا، جب تک ... وقت ہمیں ایسا کوئی موقعہ نہ دے دے۔"

"ہاں، یہ موقعہ ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔ پورے علاقے میں پھیل جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ربّ نے ہماری مدد کا ضرور بندوبست کیا ہوگا۔" میں نے یقین سے کہا تو چھاکا سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ سارا دن یونہی سوچتے ہوئے گذر گیا۔ میں گولی چلا سکتا تھا۔ سامنے آئے دشمن سے بھڑ سکتا تھا۔ لیکن اس سازش کا مقابلہ کیسے کیا جائے، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جسپال واپس کینیڈا جانے کی تیاریوں میں تھا۔ اس کی سفری دستاویزات لاہور میں سوہنی کے گھر پر محفوظ تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ لاہور جاؤں اور اسے وہاں سے الوداع کہوں۔ یہ طے کرتے، کھاتے پیتے، باتیں کرتے دن گذر گیا۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اماں اور سوہنی گاؤں والے گھر میں چلی گئی تھیں۔ میں اور جسپال باہر والے کمرے میں سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے تیزی سے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں اپنی کلائی پر گرفت کو محسوس کر رہا تھا۔ کوئی مجھے کھینچ رہا تھا۔ میری طرح جسپال بھی حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بھی میرے جیسی کیفیت میں تھا۔ کوئی نادیدہ قوت چاہتی تھی کہ ہم اس کے ساتھ چلیں۔ میں نے مزاحمت چھوڑ دی اور اٹھ گیا۔

باہر والا دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ میں اندھیری گلی دیکھ رہا تھا۔ میں نے جسپال کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم دونوں ہی اٹھ گئے۔ وہ گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ ہم گلی میں آ گئے تو وہ گرفت بھی ختم ہو گئی۔ اچانک ہمارے سامنے زمین پر ایک دودھیا لکیر پھیل گئی۔ جو ہمارے قدموں سے شروع ہوئی اور سامنے بڑھتی ہی چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہمیں راستہ سمجھا رہی ہے۔ وہ لکیر گلی پار کر گئی تھی۔ ہم دونوں جیسے ہی اس لکیر پر چلنے لگے۔ ہمارے قدم اٹھ گئے۔ جیسے ہوا میں معلق ہو گئے ہوں۔ ہم اس لکیر پر آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔ کوئی نادیدہ قوت ہمیں اُڑا کر لے جانا چاہتی ہوں۔ ہم نے مزاحمت تو پہلے ہی چھوڑ دی تھی۔ ہم بے وزن ہو گئے اور اس لکیر پر اُڑتے ہوئے گاؤں سے باہر چلے گئے۔ وہاں سے بھی آگے نہر بھی پار کر گئے۔ یہاں تک کہ ہم اسی میلے والے میدان میں مسافر شاہ کے تھڑے کے پاس آن رکے، جہاں پر وہ لکیر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

اسی لمحے میرے اندر اطمینان پھیل گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب مجھے کوئی نہ کوئی بات سمجھانے کے لیے ہو رہا ہے۔ دشمن اگر سازش کر رہے تھے تو ہماری مدد کے لیے بھی کوئی موجود تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مسافر شاہ کے تھڑے پر دودھیا روشنی پھیل گئی۔ اس میں روہی

والے بابا جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"وقت آگیا ہے کہ اب تمہیں تیرے بارے میں بتا دیا جائے۔"

"میں کون ہوں، کیا یہ آپ جانتے ہیں؟" میں نے مودب لہجے میں پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں تمہاری تین نسلوں سے تجھے جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ جانتا مگر مجھے حکم ہی تین نسلوں تک کا ہوا ہے۔" انہوں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"لیکن بابا جی آپ نے تو یہ بھی کہا تھا کہ آپ مجھے صرف دو بار ملیں گے۔ مگر آپ تو مجھے اب تک کئی بار مل چکے ہیں۔ اسے میں کیا سمجھوں۔" میں نے اپنے دماغ کی الجھن ان کے سامنے رکھ دی

"تمہاری یہ سوچ ہونی چاہیئے، کیونکہ ابھی تک تمہیں اس راز کی سمجھ نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ تم اسے سمجھ جاؤ گے اور یہ یقین رکھو کہ میں تمہیں اب تک صرف ایک بار ہی ملا ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مزید الجھن والی بات ہو گئی بابا جی۔" میں نے کسی ضدی بچے کی مانند کہا تو وہ بولے۔

"کہا نہ ابھی تمہیں سمجھ نہیں۔ ابھی تم صرف دیکھو، اسے سمجھنے کی کوشش کرو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔ اپنے اندر صرف جذب کی قوت پیدا کرو۔ اب دیکھو، میں تمہیں تمہارے بارے میں بتانا چاہتا ہوں اور تم دوسری باتوں میں الجھ رہے ہو۔"

"نہیں بابا جی، جیسا آپ چاہئیں۔" میں نے تیزی سے کہا تو چند لمحے خاموش رہ کر بولے۔

"تیری کہانی اسی میدان سے شروع ہوئی تھی۔ یہ میرے پیروں تلے جو جگہ ہے یہ اسی وقت مخصوص کر لی گئی تھی۔ یہ کیوں مخصوص ہوئی۔ یہ تجھے وقت بتائے گا، لیکن تمہاری کہانی یہیں سے شروع ہوئی تھی، یہ ایک حقیقت ہے۔"

"کیسے بابا جی، میری کیا کہانی ہے۔ کیسے شروع ہوئی تھی یہ۔ اس جگہ کا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا تو پہلی بار بابا جی جسپال سے مخاطب ہوئے۔

"جسپال! تم جانتے ہو کہ تم بھی اس جمال سے پورا تعلق رکھتے ہو؟"

"تم دونوں ایک دوسرے سے بہت ساری باتیں کر چکے ہو لیکن کبھی یہ احساس نہیں کیا کہ جب جمال حرکت میں آیا تو تم بھی اس وقت بھارت میں آ کر اس چکرویو میں پڑ گئے تھے۔ تم دونوں کی کہانی ساتھ ساتھ کیوں ہے۔ اکٹھے رہ ہی کیوں پہنچے؟ یہ تم نے ابھی نہیں سوچا۔ مگر آج سے نہ صرف تم سوچو گے بلکہ سمجھ بھی جاؤ گے۔ جمال کیا ہے، یہ بھی سمجھ جائے گا۔"

"آپ بتائیں گے نا بابا جی؟" میں نے کہا تو وہ اپنی بھاری آواز میں بولے۔

"میں نہیں، وقت تمہیں بتائے گا۔ اپنا رخ میدان کی جانب کر لو۔ اور ادھر غور سے دیکھو۔ وقت پلٹ کر آپ تمہیں دکھانے آ رہا ہے۔ اس میں کیا ہوا، وہ سب اور اس سے اخذ کرنا یہ تم دونوں پر منحصر ہے۔ پلٹ جاؤ اور بدلتے منظروں کو دیکھتے رہو، سوال مت کرنا۔" انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا تو ہم پلٹ گئے۔

ہمارے سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا میدان تھا۔ بس کہیں کہیں خاردار جھاڑیوں کا پتہ چل رہا تھا۔ اس سے آگے ہم دیکھنے سے بے بس تھے۔ اچانک ہمارے سامنے کا منظر بدل گیا۔ رات کا اندھیرا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دن کا اجالا آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا صحرا تھا۔ جس کے درمیان میں ایک چٹیل میدان تھا اور اس پر لوگ ہی لوگ تھے۔ ہمارے سامنے میلہ جاگ اٹھا تھا۔

باقی آئندہ

یقین کامل

خلیل جبار

یقین کامل، ایک ایسی قوت ہے، جو طوفانوں کا رخ بھی موڑ دیتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی شخص تھا اس کا ایمان تھا کہ اس نے زندگی میں کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہر نقصان سے بچالے گا۔

ایک باپ کا احوال، اس کی جوان بیٹی دن دہاڑے اغوا ہو گئی تھی

میں اس وقت کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ بچپن سے میری عادت تھی کہ جیسے ہی فرصت ملتی مطالعے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ اس لیے گھر والوں کو بھی میری اس عادت پر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس عمر میں بھی نہیں چھوٹی۔ میں ایک جوان بیٹی اور بیٹے کا باپ ہوں، صبح دفتر جاتا ہوں، شام گئے گھر لوٹنے پر گھر میں میرے ذمے جو کام ہوں انہیں نمٹاتا ہوں۔ رات کا کھانا آٹھ بجے کھا کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتا ہوں، میرے تبصرے سن کر بیگم کبھی کبھی مجھے حیرت سے دیکھتی ہے۔ ان کے اس طرح دیکھنے پر میں پوچھتا ہوں۔

"کیوں بیگم میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟"

"نہیں، غلط بات نہیں کہی میں اکثر تمہارے تبصرے سن کر حیرت زدہ رہ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ تمہیں تو ٹیلی ویژن پر نوکری کرنی چاہیے۔" راشدہ بیگم کہتیں۔

"وہ کیوں؟" میں انجان بنتے ہوئے پوچھتا۔

"تم میں ایک اچھے ٹی وی پروڈیوسر والی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ تم ٹی وی پروڈیوسر بن جاتے تو ناظرین کو اچھے اچھے پروگرام دیکھنے کو ملتے۔"

"بیگم یہ پاکستان ہے یہاں ہر شخص کو اس کی پسند کا کام نہیں ملتا۔ یہ اتفاق ہی ہوتا ہے کہ جسے جو کام پسند ہو وہی کام بھی اسے مل جائے اگر ایسا نہ ہو تو لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان پاکستان سے باہر جا کر ٹیکسیاں نہ چلائیں اور ہوٹلوں میں کام کرنے پر مجبور نہ ہوں۔" میں کہتا۔

"ہاں یہ بات تمہاری درست ہے لیکن پھر دل میں ایک خواہش ابھرتی ہی ہے کاش جس کو جو کام آتا ہے وہی کام اسے مل جائے۔"

"بیگم میرا دل بھی کر رہا ہے کہ کاش......" میں جان بوجھتے جملہ ادھورا چھوڑتا۔

"کہ بیگم بہت اچھی چائے بناتی ہے وہ چائے بنا کر لے آئے۔" راشدہ بیگم زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہتی۔

"یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں مصنوعی حیرت کا اظہار کرتا۔

"میرے شوہر کو ایک ہی شوق ہے چائے پینے کا، خاص کر ٹی وی پروگرام دیکھتے ہوئے اس کے چائے پینے کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے میں چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر آ گئی ہوں۔" وہ ہنس دیتیں۔

میں بھی انہیں ہنستا دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ جاتی اور چائے لا کر میرے ہاتھوں میں تھما دیتی۔ اس موقع پر میں مسکراتے ہوئے اسے کہتا "شکریہ۔"

"کس بات کا؟" وہ انجان بنتے ہوئے کہتی۔

"اس بات کا جس کا تم سمجھ رہی ہو۔" میں زوردار قہقہہ لگاتا۔

دن اسی طرح ہنسی خوشی گزر رہے تھے میرا بیٹا کاشف تعلیم مکمل ہوتے ہی ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر رہا تھا۔ بیٹی فرحین کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی دو سال باقی تھے، میری خواہش تھی کہ بیٹی کی تعلیم مکمل

ہوجائے پھر بیٹی اور بیٹے کی شادیاں کرکے اپنے اہم فرائض سے فارغ ہوجاؤں۔

مجھے اپنی پسندیدہ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اسٹڈی روم میں بیگم راشدہ داخل ہوئی۔ اسے آتا دیکھ کر میرا چونکنا ضروری تھا' اس کی عادت تھی جب میں مطالعہ کررہا ہوتا ہوں وہ مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کرتی تھی۔ میں خود ہی مطالعہ سے فارغ ہوکر سونے کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"بیگم خیریت ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"عابد تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ تم جوان بیٹی کے باپ ہوگئے ہو۔" بیگم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"بیگم میرا ایک جوان بیٹا بھی ہے۔" میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا ضروری سمجھا۔

"مجھے معلوم ہے بیٹے سے زیادہ مجھے بیٹی کی فکر کھائے جارہی ہے۔"

"کیوں بیگم ابھی فرحین کی تعلیم مکمل ہونے میں پورے دو سال باقی ہیں پھر کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر فرحین کے ہاتھ پیلے کردیں گے۔"

"عابد میں دیکھ رہی ہوں تمہاری بیٹی بدل گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" مجھے ایک جھٹکا لگا۔

"یہ موبائل بہت ہی خراب چیز ہے' اس نے نوجوان نسل کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے' بچے ماں باپ سے بدل جاتے ہیں۔" بیگم نے کہا۔

"بیگم تم فکر نہ کرو فرحین ہماری بیٹی ہے وہ ہرگز نہیں بدلے گی۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں سارا دن گھر میں رہتے ہو' میں ہی ہوتی ہوں اور میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے فرحین بیٹی کے ہاتھ میں موبائل آیا ہے وہ دن رات کسی سے موبائل لگی رہتی ہے' پوچھنے پر کہتی ہے کہ سہیلی سے بات کررہی ہوں۔"

"ہوسکتا ہے وہ کسی سہیلی سے بات کررہی ہو۔"

"سہیلی سے اس طرح گھنٹوں باتیں نہیں ہوتیں مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔" بیگم نے تشویش کا اظہار کیا۔

"پھر بیگم تم ایسا کرو یہ معلومات نکالو وہ کس سے باتیں کرتی ہے اگر وہ واقعی کسی لڑکے سے بات کرتی ہے تو پھر ہمارے لیے یہ بڑی تشویش کی بات ہے۔" میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اس لیے میں یہ بات کرنے تم سے اسٹڈی روم میں آئی ہوں۔"

"اچھا ہوا بیگم تم نے یہ بات مجھ سے چھپائی نہیں ورنہ ہمارے لیے پرابلم پیدا ہوجاتی۔ تم اچھی طرح چھان بین کرکے مجھے پوری تفصیل سے آگاہ کرو۔" میں نے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

بیگم کے اسٹڈی روم سے جاتے ہی میں نے کتاب ٹیبل پر رکھ دی' بیگم کی بات نے میرا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں اپنی ذات اور کتابوں میں ایسا گم تھا مجھے اپنے بچوں پر نظر رکھنے کا دھیان ہی نہیں گیا۔ اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں نوجوانی کی عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ نا چاہتے ہوئے بھی عشق ہوجاتا ہے انسان کی فطرت ہے کہ وہ حسن پرست ہوتا ہے جہاں حسین چہرہ دیکھتا ہے اس کو پانے کی جستجو کرتا ہے۔ کبھی میں بھی نوجوان تھا' میرے ساتھ جو لڑکے تعلیم حاصل کررہے تھے ان کے کئی کئی لڑکیوں کے ساتھ چکر چل رہے تھے۔ میں واحد لڑکا تھا جس کا کسی بھی لڑکی سے چکر نہیں تھا' میرے دوست حیرت سے مجھے دیکھتے تھے اور ساتھ ہی مشورہ دینا بھی ضروری سمجھتے کہ مجھے بھی اب کسی لڑکی سے عشق کرلینا چاہیے۔ میں ان کی بات پر زوردار قہقہہ لگاتا' میرے قہقہہ لگانے پر وہ مجھے حیرت سے دیکھتے۔

"لڑکیوں کے چکر میں تم تو برباد ہورہے ہو اور چاہتے ہو کہ میں بھی برباد ہوجاؤں۔"

"کمال ہے اس میں برباد ہونے والی کون سی بات ہے۔" سلمان کہتا۔

"یہ ہمارے تعلیمی کیریئر کا آخری سال ہے ہماری زندگی کے کیریئر کا سارا دارومدار اس پر ہے۔ ہم اچھے نمبر سے پاس نہیں ہوتے تو پھر سوچو ہمیں کس طرح نوکری ملے گی۔" میں کہتا۔

"نوکری بھی مل جائے گی مگر یہ لمحات پھر کہاں ملیں گے' سوچو ذرا اپنے ذہن کو کام میں لاؤ۔" ظہیر کہتا۔

"لڑکی ہر انسان کو شادی کرکے مل ہی جاتی ہے پھر کیا ضرورت ہے ان فضول دھندوں میں پڑنے کی' کیا تم ان لڑکیوں سے شادیاں کروگے؟" میں جذباتی ہوجاتا۔

"ان سے شادی کون کرے گا یہ قابل بھروسہ کہاں ہوتی ہیں' آج ہم سے عشق لڑا رہی ہیں کل کسی اور سے بھی لڑا سکتی ہیں۔" سلمان کہتا۔

"جب یہ بات تمہیں معلوم ہے کہ وہ قابل بھروسہ نہیں ہیں پھر کیوں ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع کررہے ہو' یہ وقت اپنی پڑھائی کو دو۔" میں کہتا۔

"ہم ہر وقت کتابی کیڑے بن کر نہیں رہ سکتے' اس لیے تفریح کی غرض سے لڑکیوں سے دوستیاں کی ہوئی ہیں' یہ بات وہ لڑکیاں بھی جانتی ہیں' وہ بھی انجوائے کی غرض سے ہم سے دوستی رکھے ہوئے ہیں۔" ظہیر کہتا۔

ان کی یہ باتیں سن کر میں خاموشی سادھ لیتا۔ انہیں سمجھانا فضول تھا وہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے اپنا وقت برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

اپنے دوستوں کی نسبت میں نے تعلیم پر بھرپور توجہ رکھی ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا اور رزلٹ آتے ہی مجھے ایک جگہ سے نوکری کی آفر بھی آگئی جو میں نے فوراً ہی قبول کرلی۔ مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری ملی تھی میرے دوست بھی میری قسمت پر رشک کررہے تھے کہ اتنی اچھی نوکری کیسے مل گئی۔ میں انہیں یہی کہہ رہا تھا کہ اگر تم بھی میری طرح تعلیمی میدان میں محنت کرتے تو تمہیں بھی ایسی اچھی نوکری مل جاتی۔

میں رنگین مزاج طبیعت کا مالک نہیں تھا پھر بھی ناجانے کیوں مجھے اپنے آفس کی ایک ٹائپسٹ سے عشق ہوگیا۔ ابتدا میں یہ بات مجھ تک ہی محدود رہی مگر وہ کہتے ہیں عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتا' یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ ٹائپسٹ ناہید کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میرا عہدہ اور میری پرسنالٹی ایسی تھی کہ وہ مجھے نظر انداز کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے بھی مجھ میں دلچسپی لینا شروع کردی اور پھر ہماری ملاقاتیں دفتر تک ہی نہیں باہر ریستوران اور تفریحی وائنٹ پر ہونے لگی تھیں۔ دفتر کے تقریباً تمام اسٹاف کو بھی ہمارے عشق کا علم ہوچکا تھا' میں نے جب گھر میں ناہید سے شادی کی بات کی' ابا تقریباً راضی ہوگئے تھے مگر امی جان غصے سے بھڑک اٹھیں۔

"یہ شادی نہیں ہوسکتی۔" امی بولیں۔

"امی یہ ڈائیلاگ فلموں میں بہت استعمال ہوچکا ہے۔" میں نے امی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کو کہا۔

میں نہیں چاہتا کہ غصے اور جذبات کو استعمال کرنے سے کہیں معاملہ خراب ہوجائے اس لیے خود کو پرسکون رکھے ہوئے تھا اور کوشش کررہا تھا کہ امی کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوجائے۔

"بیگم تم ہر بات میں جذباتی ہوجاتی ہو' زندگی ہمارے بیٹے کو گزارنی ہے وہ زیادہ بہتر سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کس کے ساتھ بہتر گزرے گی۔" ابا نے کہا۔

"کبھی ہمارے بڑوں نے شادی کے معاملے میں پوچھا تھا۔" بیگم نے کہا۔

"وہ وقت اور تھا اب زمانہ بدل گیا ہے اب لڑکے اور لڑکیاں اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرلیتے ہیں یہ اچھا بھی ہے اس طرح ان کی زندگی اچھی اور

پرسکون گزرتی ہے۔“
”کیوں کیا ہماری زندگی خراب گزر رہی ہے۔“ امی جان آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولیں۔
”بیگم یہ میں نے کب کہا ہے' ماشاء اللہ ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے' اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے کی بھی زندگی اچھی گزرے۔“ ابا نے کہا۔

امی جان کسی طرح بھی اس رشتے کے لیے تیار نہ تھیں' ابا نے جب اپنا سخت رویہ اپنایا وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ اسی طرح ناہید اور میں شادی کے مقدس بندھن میں بندھ گئے۔ میں اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا تھا' میں نے اچھی نوکری کی خواہش کی اچھی نوکری مل گئی' اچھی بیوی کی خواہش کی اچھی بیوی مل گئی۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی امی جان کو ناہید پسند نہیں آئی تھی اس لیے ان میں تلخ کلامی ہو جاتی تھی مگر میں ناہید کو سمجھا دیتا تھا کہ یہ وقتی باتیں ہیں میری والدہ دل کی بری نہیں ہیں۔ وقتی غصہ ہے پسند کی شادی کرنے پر جو آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور پھر واقعی امی کے غصے کی شدت میں کمی آنے لگی تھی' میں بھی اس بات پر خوش تھا کہ اچھا ہے بیگم کا گھر میں وقت اچھا کٹے گا۔

شام چار بجے میرے دفتر کے ٹیلی فون پر امی جان کی کال آئی وہ سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔
”کیا ہوا امی! خیریت ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
”بیٹے خیریت نہیں ہے جبھی تمہیں فون کیا ہے۔“ امی جان نے کہا۔ ”وہ...... ناہید...... کچن......“
”ہاں' ہاں بولیں۔“ میں نے کہا۔
”وہ ناہید کچن میں کھانا پکاتے ہوئے جل گئی ہے۔“
”کیا...... ؟“ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔
”ہاں بیٹے تم جلدی سول اسپتال پہنچو ہم ناہید کو اسپتال لے کر پہنچ رہے ہیں۔“ امی جان نے کہا۔
میں حواس باختہ سول اسپتال پہنچا ناہید کا پورا جسم بری طرح جھلس گیا تھا' وہ وقفے وقفے سے سانس لے رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سانس لینے میں اسے تکلیف ہو رہی ہو جیسے ہی اس سے میری آنکھیں ملیں اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور اسی وقت دم توڑ دیا۔ مجھ پر بجلی سی گر گئی تھی وقت نے اتنی بھی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ مجھ سے دو منٹ بات کر لیتی' میں تڑپ کر رہ گیا تھا۔

اسپتال سے ناہید کی لاش لا کر تدفین کر دی گئی' اس کے دوسرے دن پولیس نے مجھے اور امی جان کو گرفتار کر لیا۔ ناہید کے والدین نے میرے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی کہ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ مل کر ناہید کو جان بوجھ کر جلایا ہے' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا جس وقت ناہید کچن میں جلی تھی میں آفس میں تھا' امی جان دوائی لے کر سوئی ہوئی تھیں۔ پڑوسیوں نے ناہید کی چیخ و پکار سنی تو تبھی گھر میں داخل ہوئے تھے اور امی جان کو سوتے میں سے بیدار کیا تھا اس بات کا علم پولیس کو تفتیش کے دوران ہو گیا تھا۔ محلے کے لوگوں نے بھی میرے اور امی جان کے حق میں گواہی دی اور بتایا کہ میں ناہید کو بہت خوش رکھتا تھا' اس بات کا میرے سسرال والوں کو بھی علم تھا کہ میں نے ناہید کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی پھر انہوں نے کس کے کہنے میں آکر یہ اقدام اٹھایا۔ میرے اور امی جان کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہ مل سکا کہ میں مجرم ثابت ہوتا اس لیے میں اور امی جان اس مقدمے سے بری ہو گئے تھے۔ میرے اور امی جان کے بری ہو جانے پر سسرالیوں کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور وہ مجھے ہی قصوروار تصور کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر چکا تھا میں نے ابھی تک دوسری شادی نہیں کی تھی' میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب کبھی شادی نہیں کروں گا مگر تنہا زندگی کیسے گزار سکتا تھا زندگی گزارنے کو انسان کو ایک ساتھی کی اشد

ضرورت ہوتی ہے' ایسے میں ابا جان نے ضد کر کے میری شادی میری کزن راشدہ سے کرادی۔ راشدہ جانتی تھی کہ میں کس کرب سے گزر رہا ہوں اس لیے وہ ہر وقت میری دلجوئی کرتی رہتی تھی جس سے مجھ میں جینے کی امنگ پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ میں ناہید کا زخم بھولنے لگا۔

راشدہ کی فرحین کے بارے میں گفتگو کو دو دن ہی ہوئے تھے کہ شام کو گھر پہنچنے پر پتا چلا کہ فرحین صبح پڑھنے آئی تھی اور ابھی تک لوٹی نہیں تھی۔
”تم نے فرحین سے موبائل پر رابطہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔
”اس کا موبائل بند جا رہا ہے۔“ راشدہ بیگم نے بتایا۔
”اس کی سہیلیوں سے معلوم کرو' ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سہیلی کے پاس رک گئی ہو۔“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔
”فرحین کی ایک ایک سہیلی کو فون کیا تھا' سب کا یہی کہنا ہے کہ فرحین آج پڑھنے ہی نہیں آئی ہے۔“
”کیا......؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”پھر وہ کہاں چلی گئی؟“
”میری خود سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“
ابھی ہم دونوں سوچ ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی' میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔
”ہیلو......“ میں نے کہا۔
”عابد صاحب بات کر رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
”ہاں عابد ہی بات کر رہا ہوں۔“
”جوان بیٹی گھر پر نہ پہنچے تو بہت پریشان ہو گئے ہوں ہے نا؟“
”کک...... کک...... کون بول رہا ہے؟“ میں نے کہا۔
”میں وہی بول رہا ہوں جس کے پاس تمہاری بیٹی فرحین ہے وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ شادی کے جھنجٹ میں پڑنے کی بجائے دوست بن کر رہے مگر وہ مان نہیں رہی ہے خیر جب میں اسے بھگا کر لے جا سکتا ہوں تو اس بات پر بھی راضی کر لوں گا کہ وہ میرے ساتھ دوست بن کر رہے۔“ وہ زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
”میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گا۔“ میں نے کہا۔
”کیسے دیکھو گے میرا اپتا تمہارے پاس ہے' نہیں۔ کال بھی میں نے پی سی او سے کی ہے پھر کس طرح تلاش کرو گے۔ بس میں کبھی کبھی تمہارا خون خشک کرنے کو پی سی او سے بات کر لیا کروں گا۔“ وہ میری بیٹی کو اغواء کر کے سمجھ رہا تھا کہ میرے قابو نہیں آسکتا۔
”مسٹر میری بات کان کھول کر سن لو فوراً میری بیٹی کو چھوڑ دو ورنہ تم زمین کے اندر بھی چھپ جاؤ میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔“ میں نے اسے دھمکی دی۔
”یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا فی الحال تم اپنی بیٹی کے گھر سے فرار ہونے کا سوگ مناؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔
”یہ گمنام کال آنے پر کوئی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی' فرحین بیٹی کو اس شخص نے موبائل پر اپنی پیار بھری باتوں میں پھنسا کر اغواء کر لیا تھا پولیس کی مدد لیے بغیر گزارا نہیں تھا۔ میں نے متعلقہ تھانے جا کر فرحین کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوادی اور ساتھ ہی ایس ایچ او صاحب کو کال آنے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ ایس ایچ او صاحب نے اپنے تعاون کی بھرپور یقین دہانی کرائی تھی اس کی یقین دہانی پر ہی میں تھانے سے بوجھل سے قدموں گھر لوٹ آیا' سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ دوسرے دن صبح ہی جب ایس ایچ او صاحب کا فون گیا۔
”عابد صاحب' ہم نے آپ کی بیٹی کو بازیاب کرالیا ہے' آپ فوری تھانے پہنچیں۔“
”کیا واقعی؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں بھئی نا صرف تمہاری بیٹی کو بلکہ ملزمان کو بھی گرفتار کرلیا ہے اور ہمیں لڑکی کا 164 کا بیان سول کورٹ میں ریکارڈ بھی کرانا ہے جلدی تھانے آجائیں۔'' ایس ایچ او صاحب نے کہا۔

مجھے پولیس کی کارروائی پر بڑی حیرت ہو رہی تھی' رات کو میں نے بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی اور صبح پولیس نے ملزم سمیت اسے بازیاب بھی کرلیا تھا' اس طرح پولیس اور معاملات بھی نمٹاتی رہے تو ملک سے جرائم کا خاتمہ ہوجائے۔

تھانے میں مجھے دیکھ کر فرحین میرے گلے لگ کر بری طرح رودی۔ میرے تسلی دینے پر ہی وہ خاموش ہوئی۔

فرحین نے جیسے ہی سول جج کے روبرو اپنا بیان قلم بند کرایا' صحافی اور فوٹو گرافر بھی آچکے تھے' انہیں دیکھ کر میں چونکا۔ ان کا یہاں کیا کام ہے ایس ایچ او مظفر میری حیرانی کو سمجھ چکا تھا۔ اس لیے میرے پاس آیا۔

''یہ خبر کے سلسلے میں آئے ہیں' ان کی ڈیوٹی میں یہ کام شامل ہے۔'' اس نے بتایا۔

ایک رپورٹر تیزی سے فرحین کی طرف لپکا جبکہ فوٹو گرافر نے جلدی جلدی فرحین کے فوٹو لینا شروع کردیئے۔ میری بیٹی کی ایک غلطی کے سبب آج ہمیں یہ سب دیکھنا پڑ رہا تھا۔

''فرحین تم نے کورٹ کو کیا بیان دیا اور تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟'' رپورٹر نے پوچھا۔

وہ ایک دبلا پتلا نوجوان رپورٹر تھا' فرحین نے ایس ایچ او اور میری طرف ایسے دیکھا کہ اجازت چاہ رہی ہو کہ انہیں کچھ بتائے یا نہیں۔

''بتا دو بیٹی تمہارا بیان ریکارڈ ہوچکا ہے' اس لیے انہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' ایس ایچ او مظفر نے کہا۔

میری خاموشی بھی ایک طرح سے نیم رضامندی تھی جس پر فرحین نے رپورٹر کو بتانا شروع کردیا۔

''میں اس دن یونیورسٹی سے جلد آ گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نوٹس تیار کرلوں کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی' اسکرین پر جو نمبر جگمگا رہا تھا وہ میرے لیے نیا تھا پھر بھی میں نے کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو! جی کس سے بات کرنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سے ہی بات کرنی ہے۔''

''جی' مجھ سے بات کرنی ہے؟'' میں چونکی۔

''ہاں میرا کسی خوب صورت حسینہ سے گفتگو کرنے کو دل چاہ رہا تھا' اس لیے تمہیں فون کیا ہے۔'' وہ بولا۔

''تم کون ہو؟ اور تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ اس طرح مجھ سے بات کرو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''ارے اس میں اتنا غصہ کرنے کی کون سی بات ہے کیا تم خوب صورت حسینہ نہیں ہو' اس دور میں بدصورت عورت کو خوب صورت لڑکی کہہ دینے پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی ہے اور ایک تم ہو جو ناراض ہوگئی ہو۔'' وہ بولا۔

''دیکھئے تم جو کوئی بھی ہو تمہاری یہ غلط فہمی دور کیے دینا چاہتی ہوں کہ مجھے اجنبی لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں لہٰذا آئندہ مجھے اس طرح کال کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اس دور میں جان پہچان ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے' مجھ سے بات چیت کرتی رہو' جان پہچان ہوجائے گی۔'' اس نے کہا۔

غصے سے میں نے کال بند کردی مگر وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا وہ روزانہ کال کرنے لگا اگرچہ میرا رویہ سخت رہتا تھا پھر بھی کال کیے نہیں مانتا تھا پھر نا جانے کیوں مجھے اس پر ترس آنے لگا اور میں نے انجام کی پروا کیے بغیر بات چیت کرنی شروع کردی۔ اس کا نام سرفراز تھا اور وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند تھا۔ سرفراز نے مجھے مستقبل کے بڑے بڑے سہانے خواب دکھائے تھے اور تصور ہی تصور میں مستقبل میں خود کو عیش کرتے دیکھنے لگی تھی' مجھے نہیں پتا تھا کہ جو سہانے خواب دکھا رہا ہے وہ حقیقت میں نہیں بن سکتے۔ سرفراز اکثر مجھ سے ملاقات کرنے یونیورسٹی بھی پہنچ جاتا تھا وہ پہلی ملاقات میں اس طرح ملا جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتا ہو۔ ہم یونیورسٹی سے باہر مختلف ریستوران میں بھی ملاقاتیں کرنے لگے تھے۔ سرفراز ملاقاتوں میں شرافت کا مظاہرہ کررہا تھا اس لیے مجھے اس پر مکمل اعتماد ہوگیا تھا جس روز مجھے اغوا کیا گیا اس دن بھی سرفراز اپنے ایک دوست سے ملاقات کرانے لے گیا تھا اور پھر مجھے جس گھر میں لے گیا وہ ایک کچی آبادی تھی' وہاں غریب مزدور پیشہ لوگ رہتے تھے۔ میں حیران تھی کہ سرفراز مجھے یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔ ایک مکان کے دروازے کا تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوا' میں نے حیرت سے اس مکان کو دیکھا اور اس سے پوچھا۔

''سرفراز یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''

''گھبراؤ نہیں یہ میرے دوست کا گھر ہے' وہ ابھی کھانا لے کر آتا ہوگا۔'' سرفراز نے کہا۔

کچھ دیر گزرنے پر اس کا دوست لقمان کھانا لے کر آ گیا' ہم نے ساتھ کھانا کھایا پھر جب وقت تیزی سے گزرنے لگا تو مجھے گھر جانے کی فکر ہوئی۔ سرفراز کے ارادے سے لگ رہا تھا کہ وہ وہاں سے جانے کے موڈ میں نہیں ہے اور پھر اس نے ایک ایسی بات کی جس سے میرا دل دہل گیا۔

''فرحین تم اغوا ہوچکی ہو۔''

''کیا...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں مجھے تمہارے والد سے انتقام لینا ہے اسی لیے میں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سرفراز کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

''کک...... کیا انتقام؟'' میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے والد نے جو پہلی شادی کی تھی وہ میری پھوپی جان تھیں' انہیں تمہارے ابو اور دادی نے مل کر زندہ جلادیا تھا۔ میرے والد نے پولیس میں قتل کا مقدمہ بھی درج کرایا تھا لیکن میری پھوپی ہلاک ہوچکی تھیں اس لیے ہمارے پاس ایسی شہادت نہیں تھی جس کی مدد سے تمہارے ابو اور دادی کو قاتل ثابت کرسکیں اس لیے وہ مقدمے سے بری ہوگئے تھے مگر میں اس وقت چھوٹا تھا۔ میں نے اس وقت سے تہیہ کیا تھا کہ ان سے انتقام ضرور لوں گا میں اب اس پوزیشن میں آچکا ہوں کہ انتقام لے سکوں۔ اس لیے تم سے موبائل پر دوستی کی اور اپنا اعتماد حاصل کرکے یہاں لے آیا ہوں۔ یہاں روزانہ میں اور میرے دوست تمہیں زیادتی کا نشانہ بنائیں گے اور اس بات کی رپورٹ گمنام کال کے ذریعے دیتے رہیں گے تاکہ وہ بھی اس طرح آگ کے شعلوں پر خود کو جلتا محسوس کریں ان کی نیندیں اڑ جائیں پھر جب ہمارا دل بھر جائے گا تمہیں کسی بھی سڑک پر رات کی تاریکی میں پھینک دیں گے۔'' سرفراز نے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے' میرے ابو اور دادی نے ہرگز تمہاری پھوپی کو زندہ نہیں جلایا مجھے خود دادی جان نے بتایا تھا کہ اس دن ان کی طبیعت خراب تھی اور دوائی لے کر سوئی تھیں جب تمہاری پھوپی باورچی خانے میں کام کررہی تھیں وہ بالکل اکیلی تھیں یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور انہیں جب آگ لگنے کا احساس ہوا تو دیر ہوچکی تھی' محلے والوں نے گھر میں داخل ہوکر تمہاری پھوپی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور دادی جان کو سوتے سے جگایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے تمہاری دادی نے خود کو بچانے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا ہے وہ شروع دن سے اس شادی کی مخالف تھی اور آئے دن ان کی اور میری پھوپی کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔''

''میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ ساس بہو کی لڑائیاں ہوتی تھیں لیکن وہ ایسا اقدام ہرگز نہیں اٹھا سکیں۔'' میں

نے سرفراز کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ میری بات نہیں مان رہا تھا اور اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا' میں نے بار بار اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے جانے نہیں دے رہا تھا مجھے انہوں نے مکان میں موجود دوسرے کمرے میں قید کر دیا اور موبائل بھی چھین لیا تھا کہ میں کسی اور سے گفتگو کر کے مدد کو بلالوں۔ میں کمرے میں بند اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے روتی رہی اور دعا مانگتی رہی کہ کسی طرح مجھے اس قید سے نجات دلا دے پھر کبھی بھی کسی غیر مرد سے بات نہیں کروں گی کیونکہ یہ غیر محرم شخص سے بات کرنے اور دوستی کرنے کا نتیجہ حاصل ہوا تھا۔ میرے گھر والے میری جدائی میں کس قدر پریشان اور کتنی تکلیف سے گزر رہے ہوں گے۔

رات دو بجے کے بعد سرفراز اور اس کے دوست نشے میں کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئے' وہ تین اور میں اکیلی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سے کس طرح بچ پاؤں گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک شاندار ترکیب آ گئی' میں نے ان پر یہ ظاہر کیا کہ میں مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اور وہ جیسا کہیں گے میں ایسا ہی کروں گی اس بات پر وہ خوش ہو گئے اور زور زور سے قہقہے لگانے لگے' میں نے ان کی خوش فہمی کا فائدہ اٹھا کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ انہیں مجھ سے اتنی ہوشیاری کی توقع نہیں تھی۔ میں مکان کا دروازہ کھول کر ایک سمت بھاگ نکلی' خاصی دور نکل آنے پر مجھے پکڑے جانے کا خوف تھا اس لیے تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے مجھے ٹھوکر لگی اور میں گر پڑی۔ میرے پاؤں کے انگوٹھے پر چوٹ لگنے سے خون بہہ نکلا تھا مگر مجھے اس وقت خون بہنے سے اپنے پکڑے جانے کی فکر تھی۔ اس لیے دوبارہ بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے میں تھک چکی تھی' میں نڈھال ہو کر سڑک پر گرنے والی تھی کہ دور سے ایک وین آتی نظر آئی پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا اور سڑک پر گر پڑی۔

وہ وین دراصل پولیس کی تھی انہوں نے مجھے اٹھایا' ہوش میں آنے پر میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا' پولیس وہاں لے کر پہنچی اور پولیس نے ان تینوں کو گرفتار کیا اور صبح ہمیں کورٹ میں پیش کر دیا۔ مجھے میری خواہش کے مطابق والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دی ہے جبکہ تینوں ملزمان کو پولیس ریمانڈ پر دے دیا ہے۔'' فرحین یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

میں سرفراز کی طرف بڑھا وہ مجھے اپنی جانب دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔

''سرفراز تم نے جو کچھ کیا وہ بہت غلط تھا' میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ ناہید اور میں نے پسند کی شادی کی تھی پھر بھلا میں کیوں اس کو زندہ جلا مارتا۔ یہ اتفاقی حادثہ تھا جس میں ناہید کی موت ہوئی' دنیا میں ابھی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا جس پر ہاتھ رکھ کر سے جھوٹ اور سچ کا پتا چل سکے۔ تم نے جو کچھ کیا اس پر شدید غصہ ہے لیکن ناہید میری محبت تھی۔ میں اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ میں نے یا میری ماں نے ناہید کو نہیں جلایا اس کے بعد بھی اگر تم یقین نہ کرو تو تمہاری مرضی۔ میرا اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا یقین ہے کہ جب میں کسی کو تنگ یا پریشان نہیں کروں گا تو کوئی دوسرا بھی مجھے تنگ نہیں کرے گا جس کی مثال یہ ہے کہ تم فرحین کو اپنے جال میں پھنسا کر بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکے۔ میری بیٹی جیسی گھر سے نکلی تھی ویسے ہی اپنے گھر جا رہی ہے اس سے بڑھ کر میں تمہیں کوئی اور مثال نہیں دے سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے میں فرحین کو اپنے ساتھ لے آیا۔ میں نے ابھی تک گھر پر فرحین کے گھر سے جانے کا نہیں بتایا تھا وہ بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گئے۔

زخمی ہمزاد

انجم فاروق ساحلی

ہماری کائنات میں انسانوں کے علاوہ ہزارہا مخلوقات آباد ہیں' جن کا وجود کبھی کبھار انسان محسوس کرسکتا ہے لیکن اس کی کوئی عقلی توجیہ بیان نہیں کرسکتا۔ البتہ اسے ماورائی قوت قرار دے کر خاموش ہو جاتا ہے۔

ایک ایسی ماورائی بلا کا احوال' وہ انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر انسانی آبادی میں گھس آئی تھی۔

خوفناک اور ماورائی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے بطور خاص

آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا' رات بڑی تاریک اور سرد تھی' دسمبر کا مہینہ تھا بارش مسلسل برس رہی تھی۔ سڑکیں' بازار اور راستے سر شام ہی ویران ہو کر رہ گئے تھے' تیز بارش کے ساتھ ہوا کا طوفان بھی اپنی پُر ہول آوازوں کے ساتھ بپھرتا جا رہا تھا۔ لوڈشیڈنگ کے باعث ... وِنڈ روڈ کا علاقہ اور ماحول اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا' ضروری کاموں سے باہر نکلے ہوئے لوگ جلد از جلد طوفانی موسم میں گھر پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن وہ اندھیرے' بارش کے پانی اور ہواؤں کے جھکڑوں کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ ٹرک کا پہیہ ایک گڑھے میں پھنس گیا تھا اور ... کی کوشش کے باوجود بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھی جھنجلائے ہوئے تھے' اس وقت ڈرائیور نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُف خدا! طوفان ہے یا کوئی آفت' مجھے اپنی بیمار والدہ کو اسپتال لے جانا تھا میں کہاں پھنس گیا۔''

اس وقت آسمان پر بجلی زور سے کڑکی تو سیٹھ دولت کی حویلی روشنی میں نہا گئی۔ اس کے کچھ حصے جنریٹر اور یو پی ایس کی مدد سے روشن دکھائی دے رہے تھے۔ صدر دروازے کے دائیں جانب بنے لکڑی کے کیبن میں گھسے مسلح محافظ بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کیونکہ کیبن کی کھڑکی کا شیشہ ہوا کے تیز جھکڑ سے ٹوٹ گیا تھا اور ٹھنڈی بوندیں کنکریوں کی طرح جسم میں گھستی معلوم ہو رہی تھیں ایک محافظ زور زور سے چھینک رہا تھا اور دوسرے کی ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔

حویلی کے عقبی باغ میں ہوا کے طوفان نے کئی کمزور درختوں کو زمیں بوس کر دیا۔ باغ کے بڑے بڑے خوفناک اور پھرتیلے بلڈاگ کتے جو رات بھر باغ میں گھوم پھر کر نگرانی کرتے تھے اپنے لکڑی کے باڑے میں گھسے آہستہ آہستہ غراتے ہوئے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ماحول کو گھورتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے' بارش کی مصیبت سے گھبرائے ہوئے پرندے درختوں کے پتوں میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ کچھ پرندے باغ میں گرے ہوئے درختوں پر بنے گھونسلوں کو اب بکھرا ہوا دیکھ کر غصے اور مایوسی سے چلا رہے تھے۔ کچھ پرندے ہوا کے جھکڑ کی لپیٹ میں آ کر باغ کے نشیبی حصے کے پانی میں جا گرے تھے اور اب غوطے کھاتے ہوئے اپنے پَر پھڑپھڑا کر اڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

❀ ❀ ❀

سیٹھ دولت حویلی کے بڑے ڈائننگ ہال میں وسطی مقام پر ایک خوشنما منقش میز پر بچھی شطرنج کی بساط پر موجود تھا وہ سگار کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ اس کا مدمقابل اس کا سب سے بڑا بیٹا سکندر خان تھا۔ سکندر خان بھی اپنے باپ کی مانند شطرنج کا شوقین تھا' دونوں باپ بیٹوں میں خوب بازی جمتی تھی' سیٹھ ددولت خان شطرنج اور شکار کا بے حد رسیا تھا۔ وہ موضع شاہ پور سے چند گھنٹے قبل ہی واپس لوٹا تھا۔ شاہ پور کے شمال اور جنوب میں تاحد نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھانے کی پرانی اور بوسیدہ عمارت واقع تھی جس کی اپنی خستہ حالی لوگوں کو عدم تحفظ کا ہی احساس دلاتی تھی تھانے سے نصف میل آگے ایک نیم پختہ سڑک تھی جو لاہور کی جانب جانے والی سڑک سے جا ملتی تھی جبکہ شاہ پور کے مغرب میں دو فرلانگ کے فاصلے سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی بیس میل پر محیط بے حد گھنا جنگل تھا جس میں طرح طرح کے جنگلی جانور سیٹھ دولت خان کے شکار کے لیے موجود تھے' ندی نالے اور پہاڑی سلسلہ بھی وسطی مقام پر موجود تھا۔ گاؤں کے لوگ ایندھن کی تلاش میں اسی گاؤں کا رخ کرتے تھے' اس جنگل میں سیٹھ دولت خان نے ایک بڑا شکاری کیبن بنا رکھا تھا جس میں تین چھوٹے چھوٹے کمرے' واش روم اور کچن موجود تھا۔ وہ اور اس کے دونوں دوست سیٹھ موتی والا اور سیٹھ چاندی والا اس کے ساتھ مل کر شکار کیے گئے پرندوں کے پَر اتار کر ان کا گوشت صفائی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لذیز پکوان تیار کیا کرتے تھے۔ تینوں دوست سردی اور گرمی دونوں موسموں میں شکار پر نکلا کرتے تھے' اس مرتبہ سیٹھ دولت نے ایک ہرن بھی شکار کیا تھا جس کے گوشت سے ابھی ابھی اس کے علاوہ اس کے تینوں بیٹوں اور دو بیٹیوں نے رات کے کھانے پر لطف اٹھایا تھا تیتر اور بٹیر اس کے علاوہ تھے اس وقت دولت خان نے اپنے وزیر کی جارحانہ چال سے اپنے بیٹے سکندر کو شہ مات کر دی۔ سکندر نے کھسیانا ہو کر سر جھکا لیا' اس نے کہا۔

''ڈیڈی! میں یہ بازی جیت جاؤں گا۔''

''سکندر بیٹے! تم یہ بازی بھی ہار گئے۔'' سیٹھ دولت نے مسکراتے ہوئے سگار کا لمبا کش کھینچا۔

''آپ کے سامنے جیت کیسے سکتا ہوں' جتنی میری عمر ہے اتنا ہی آپ کا تجربہ ہے۔'' سکندر نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''بیٹا کوشش اور لگن سے کھیل جاری رکھو ایک نہ ایک دن ضرور جیت جاؤ گے۔ میں بھی شروع میں صرف ہارتا ہی رہا ہوں' بیٹے ایک اور بازی ہو جائے۔'' دولت خان نے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ آرام کرنے کے بعد اب تازہ دم تھے۔

''نہیں ڈیڈی! آج کے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے باقی مرمت پھر کروالوں گا۔'' سکندر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تم تو گھبرا گئے دل چھوٹا نہیں کرتے۔'' سیٹھ دولت خان نے مہرے سمیٹ کر بکس میں ڈالتے ہوئے کہا

''ڈیڈی کل رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا' اُف کس قدر خوفناک تھا۔'' سکندر کچھ یاد آنے پر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

''کیسا خواب...... کیسا خواب؟'' سیٹھ دولت خان نے چونک کر پوچھا۔

''بس ڈیڈ کچھ ایسا تھا کہ میں ایک گھنے جنگل میں ایسے ہی طوفانی موسم میں پھنس گیا ہوں۔'' سکندر نے کھڑکی کے شیشے سے باہر موسلا دھار بارش اور ہواؤں کے بگولوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سیٹھ دولت خان پوری طرح سنجیدگی سے بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا کیونکہ اچانک سکندر کا رنگ اڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں خوف اور جسم میں تھرتھری سی پیدا ہو گئی تھی۔ خوف نے اسے اپنے پھندے میں جکڑ لیا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' سیٹھ پوری توجہ سے بے تاب ہو کر بولا۔

''پھر ڈیڈی میں جنگل کے اندھیرے میں ٹارچ کے سہارے گرتا پڑتا باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا' میرا گھوڑا جس نے مجھے اژدھا دیکھ کر زمین پر پٹخ دیا تھا' نہ جانے کہاں بھاگ نکلا تھا خیر ہوئی کہ اژدھا ایک زخمی مرغ کو چاٹنے میں مگن ہو گیا۔ میں کیچڑ اور پانی میں تیزی سے آگے بڑھا جا رہا تھا' میں جلد از جلد اژدھے سے دور ہونا چاہتا تھا میری سانس پھول گئی' ٹانگیں شل ہو گئیں' سردی سے کندھے اور بازو اکڑ گئے۔ میں لڑکھڑا سا گیا' اس وقت کسی منحوس الو کی بڑی تیز اور خوفناک سی چیخ جنگل میں گونجی اور مجھے اپنے چاروں طرف گردش کرتی محسوس ہوئی' میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے' حلق سوکھ گیا۔ جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی' میں خوف سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ عین اسی لمحے قریبی جھاڑی کی اوٹ سے خوفناک درندہ نمودار ہوا اور صورت دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اُف اس کی صورت بڑی بھیانک تھی' اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں شیطانی چمک اور شرارت تھی۔ وہ کسی بڑے ریچھ کی مانند تھا البتہ دہانہ بڑا پھیلا ہوا تھا جیسے کسی مگرمچھ کا منہ اس کے جسم پر فٹ کر دیا گیا ہو اس نے اپنا بھاڑ سا منہ کھولا تو اس کی لمبی زبان تازہ لہو جیسی سرخ تھی اس کے جبڑے میں صرف دو بڑے بڑے خوفناک نوکیلے دانت تھے' جن کو دیکھ کر مجھے چکر سا آ گیا اس کے منہ سے غراہٹ سی نکلی وہ حرکت میں آیا' لپکا' میں بھاگا لیکن پھر کیچڑ میں گر پڑا۔ وہ خوفناک درندہ جست مار کر میرے قریب آیا اس نے اپنا لمبا منہ کھولا اور اپنے دونوں لمبے نوکیلے دانت میری گردن میں گاڑ دیئے جس سے خون فوارے کی مانند میری گردن سے ابلنے لگا بس اس وقت میری آنکھ کھل گئی۔'' سکندر نے لرزتے ہوئے کہا۔

''بیٹا گھبراؤ مت اگرچہ خواب ڈراؤنا اور دہشت ناک ہے لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں ان میں حقیقت بالکل نہیں ہوتی بس ایسا سمجھو کہ انسان کے لاشعور میں واقعات کے مختلف ٹکڑے بھی کبھی پڑے پڑے آپس میں مدغم ہو کے ایک منظم واقعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ تو خواب ہے میں تو بے شمار دفعہ خوفناک جنگلوں ویرانوں اور قبرستانوں سے گزرا ہوں لیکن کسی مافوق الفطرت قوت یا ماورائی طاقت سے واسطہ نہیں پڑا۔'' سیٹھ دولت خان نے سکندر کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ملازم کچھ دور مستعد کھڑے تھے۔

''جاؤ چائے لاؤ۔'' سیٹھ نے انہیں اشارہ کیا' ملازم بھاگے بھاگے گئے اور چائے کے ساتھ اُبلے ہوئے انڈے اور میوے بھی لے آئے جو میز پر موجود سونے کی طشتری میں رکھ دیئے گئے'

چائے تیار کرکے ملازم انہیں تھما گئے۔
"بیٹے چائے اور میوہ جات لو اور گرم ہوجاؤ۔" سیٹھ دولت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سکندر کا چائے کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ کپکپا رہا تھا' آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی ایک ہیٹر بھی چل رہا تھا لیکن اس کے اندر خوف کی لہر کسی سانپ کی مانند بل کھا رہی تھی' خواب یاد آتے ہی وہ بُری طرح سہم گیا تھا۔

❁......❁......❁

اس کے دونوں چھوٹے بھائی فیصل اور اقبال آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھے سامنے دیوار پر نصب بڑی ایل سی ڈی اسکرین پر چلتے ایک ہارر انڈین ڈرامے سے محظوظ ہورہے تھے جبکہ سکندر اسکرین سے نظریں چرا رہا تھا۔ اسکرین مشرقی سمت دیوار پر نصب تھی' آتش دان والی نشست گاہ مغربی سمت اور شطرنج کی بساط شمال کی جانب لگی ہوئی تھی۔ سکندر کی دونوں چھوٹی بہنیں عمرانہ اور فرزانہ موبائل پر اپنی سہیلیوں سے گپ شپ میں مصروف تھیں۔ فرزانہ کی گود میں اس کی بے حد خوب صورت لاڈلی اور پیاری بلی سونیا بیٹھی میاؤں میاؤں کی آوازیں نکالتی ہوئی اسکرین پر ڈرامے کے منظر دیکھ رہی تھی اس کی نیلی آنکھوں میں تیز چمک تھی پھر وہ سکندر کو دیکھ کر دُم ہلانے لگی۔

کچھ دیر کے بعد بارہ بجتے ہی سیٹھ دولت خان نے سب کو آواز دے کر سونے کی ہدایت کردی جس کے بعد وہ سب ڈائننگ ہال سے نکل کر کاریڈور میں آئے اور اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہوگئے۔

سیٹھ دولت خان موبائل آن کرتے ہوئے صدر دروازے کے محافظوں اور عقبی برآمدے میں بیٹھے مسلح محافظ پٹھان کو چوکنا کردیا۔ اس طوفانی موسم میں چوری چکاری کا خطرہ بڑھ جاتا تھا' ان کی خاندانی پُرشکوہ حویلی کے گرد ویسے بھی ویرانی اور سناٹا تھا۔ کھیت اور جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں' حویلی کے عقب میں سیٹھ دولت خان کا زرعی فارم بھی ایک میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس میں گندم' جو' باجرہ اور سبزیاں وغیرہ اُگائی جاتی تھیں۔ مرغی' بطخیں' کبوتر گائے اور بھینسوں کے باڑے بھی بنے ہوئے تھے۔ وہاں دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھے گئے تھے ان کی رہائش بھی وہیں تھی' زرعی فارم کے اردگرد اونچی خاردار باڑ لگائی گئی تھی اور کہیں کہیں پول لگا کے ان پر بلب قمقموں کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ہٹ بھی بنوایا گیا تھا جس کے سامنے سوئمنگ پول تھا۔ اتوار کے دن سیٹھ صاحب اکثر یہاں آکے سکون اور تیراکی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ سیٹھ دولت کے پاس خاندانی دولت تو تھی ہی لیکن اس کا جیولری کا کاروبار بھی خوب چل رہا تھا' شہر میں کئی بڑی بڑی دکانیں کامیابی سے چل رہی تھیں۔

❁......❁......❁

سکندر اپنے کمرے میں آکر لحاف میں دبک گیا' کمرے کا بیرونی دروازہ اور کھڑکیاں اس نے اچھی طرح اندر سے بند کرکے اطمینان کرلیا تھا لیکن نیند کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اچانک ہی خوف کی لہر اسے اپنی گرفت میں سانپ کے بلوں کی مانند لپیٹ کر رکھ دیتی اور وہ پھٹی پھٹی خوف زدہ نظروں سے کمرے کا طواف کرنے لگتا۔ اس کے لاشعور کے پردے پر وہی

خوفناک نوکیلے دانت اٹکے ہوئے تھے جن سے خون رس رہا تھا اس کا جسم ٹھنڈا اور زرد پڑنے لگا' سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ اس نے بار بار اس خوفناک تصور سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ خوف اور دہشت کے سیلاب میں بہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کی دراز سے تیز نیند آور دوا نکالی اور اٹھ کر کھانا چاہتا تھا کہ اچانک آپ ہی آپ کمرے کا زیرو کا بلب بجھ گیا' خوف سے اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ اس وقت سامنے واش روم کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک دھاری دار شیر نما درندہ منہ کھول کر اس کی طرف لپکا جس کے منہ میں صرف خوفناک دانت دکھائی دے رہے تھے۔ سکندر کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس کا ہاتھ پستول پر جا پڑا لیکن اسی وقت درندے نے جست لگائی اور سکندر کی آخری چیخ بڑی خوفناک اور بلند اور لرزہ خیز تھی۔ دھڑا دھڑ دروازے کھلنے لگے' بھاگتے قدموں کی آوازیں ابھریں کچھ دیر بعد سکندر کے دروازے پر زور زور سے دستک دی جارہی تھی لیکن سکندر اس دنیا میں ہوتا تو دروازہ کھولتا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد جب ایک ملازم نے باہر سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر چٹخنی گرا کر کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہوا تو اس کے منہ سے بھی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ وہ ہانپتا کانپتا دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر انگلی سے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

بستر پر سکندر کی گردن اور ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی بستر کی سفید چادر خون سے سرخ ہورہی تھی' لاش کا چہرہ اذیت سے بڑا بھیانک اور حیرت کا عنصر آنکھوں میں ابھی تک منجمد دکھائی دے رہا تھا۔ گردن پر کسی درندے کے دانتوں کے بڑے بڑے گہرے سوراخ یا گھاؤ تھے جن سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔

"نہیں نہیں سکندر! تمہیں کیا ہوگیا' میرا بیٹا...... میرا لخت جگر!" سیٹھ دولت پوری قوت سے دھاڑیں مار کر رو پڑے' اس کے بھائی اور بہنیں بھی بستر کے کنارے سسکیاں بھرنے لگے اس وقت فرزانہ کی بلی سونیا تیزی سے سکندر کے بستر کے نیچے سے نکلی اور بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ سب نے چونک کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر فرازنہ نے عمرانہ سے کہا۔

"یہ تو میرے کمرے میں اپنے بستر پر تھی ادھر کس وقت آ گئی۔"

"بس آ گئی ہوگی یہ تو سب سے ہی مانوس ہے اور کسی بھی کمرے میں گھس کر سو جاتی ہے۔" عمرانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا لیکن آنسو کوشش کے باوجود آنکھوں سے رک نہ سکے۔ سکندر ان کا بڑا بھائی اور بڑا ہی پیار کرنے والا تھا' وہ سراپا شفقت اور محبت تھا اس نے انہیں کبھی نہ جھاڑا تھا' ڈانٹ ڈپٹ کی تھی ہمیشہ نرمی سے ان کی کوتاہی کی نشاندہی کی تھی۔

ایک مرتبہ بچپن میں جب وہ دونوں کھیلتے ہوئے گھر سے دور نکل گئی تھیں تو سکندر نے مسلسل بھاگ دوڑ کرکے انہیں تلاش کرلیا تھا اور اپنی ایک ایک انگلی انہیں تھما کر گھر لے آیا تھا۔ ان کی والدہ فوت ہوچکی تھیں لیکن ان کے والد اور بھائیوں نے انہیں کبھی ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی'

ان کے دوسرے بھائی فیصل اور اقبال بھی بہت اچھے تھے۔

''کمرا اندر سے بند تھا پھر وہ درندہ اندر کیسے آیا؟'' فیصل نے چونک کر اقبال سے پوچھا۔ اقبال کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈال کر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' پھر اس کی نگاہ کمرے کے واش روم پر جا کر ٹھہر گئی۔

''آؤ واش روم کا جائزہ لیں۔'' فیصل' اقبال کے ساتھ ہولیا' ان کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں' سیٹھ دولت بستر کے کنارے بیٹھ کر سسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ منحوس خواب اپنی خوفناک تعبیر کے ساتھ مکمل ہو چکا تھا' جو سکندر نے پچھلی رات دیکھا تھا۔

اقبال نے واش روم کے ادھ کھلے دروازے کو پورا کھول دیا پھر وہ دونوں اندر داخل ہوئے واش روم کا دوسرا دروازہ جو باہر کاریڈور میں کھلتا تھا وہ اندر سے بند تھا' چٹخنی چڑھی ہوئی تھی یہ کافی وزنی اور مضبوط چٹخنی تھی آفتاب کی نگاہ بھی اس پر جم کر رہ گئی۔

''پھر وہ درندہ اندر کیسے آ گیا؟'' اس کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں نکلا۔

''یہ فی الحال سربستہ راز ہے جس سے پردہ اٹھانا ہوگا۔'' اقبال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس وقت آگے بڑھتے ہوئے فیصل کی نگاہ ٹونٹی کے نیچے رکھی بالٹی پر پڑی تو وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑا۔

''ب...... بھائی ادھر......؟''

''ادھر کیا ہے؟'' اقبال نے چونک کر پوچھا اور جلدی سے آگے بڑھا پھر وہ بھی دھک سے رہ گیا۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں کسی سانپ کی مانند رینگنے لگی۔ بالٹی کا پانی خون سے سرخ تھا' انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے' وہ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے پھر اچانک اقبال کے منہ سے نکلا۔

''اس کا ایک ہی مطلب میری سمجھ میں آتا ہے شاید اس درندے یا خونی چڑیل نے اپنا خون آلود منہ اس بالٹی میں صاف کیا ہو؟''

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں اس کے علاوہ کچھ اور قیاس نہیں کیا جا سکتا۔'' فیصل نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا اس وقت اقبال اچھل ہی پڑا۔

''ارے......ارے فیصل میں نے سونیا کی بلی کے کان خون سے تھوڑے سرخ دیکھے تھے۔''

''اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' وہ تو چھوٹی سی خوب صورت بلی ہے جو سب کے ساتھ ہی مانوس ہے پھر کہاں اس کا چھوٹا سا منہ چھوٹے سے دانت اور کہاں سکندر بھائی کی گردن پر دو بڑے بڑے گہرے گھاؤ یا سوراخ دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شیر یا کسی درندے نے اپنے بڑے دانتوں سے ان کی گردن چبا ڈالی ہے۔'' فیصل نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی تم بھی ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ بات میرے ذہن میں چبھ رہی ہے کہ بلی اس کمرے میں کیا کر رہی تھی؟'' اقبال نے ایک نکتہ اٹھایا۔

''بھئی ویسے ہی آ گئی ہوگی کئی بار یہ ہمارے کمروں میں بھی گھس چکی ہے۔ سکندر بھائی کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی ہوگی اور جہاں تک اس کے کانوں کے خون آلود ہونے کا تعلق ہے تو اسے

پیاس لگی وہ پانی پینے کے لیے بالٹی پر چڑھ کر بے ساختہ پینے لگی اس وقت اسے احساس ہوا کہ پانی خون آلود ہے بس اس وقت اس کے کان خون میں بھیگ گئے ہوں گے۔'' فیصل نے اپنے قیاس سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

دونوں کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور واپس سیٹھ دولت کے پاس بستر کے کنارے چلے آئے اس وقت سیٹھ دولت نے ملازم کو آواز دے کر اپنا موبائل منگوایا اور پھر پولیس اسٹیشن اس حادثے کی اطلاع دے دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی انسپکٹر عمران کو مقامی پولیس انسپکٹر کی جگہ موقع واردات پر بھیج دیا گیا کیونکہ متعلقہ انسپکٹر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اسے نزدیکی اسپتال میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ انسپکٹر عمران چونکہ کسی سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا لہٰذا کیس کو پیچیدہ اور پُراسرار محسوس کر کے ڈی ایس پی صاحب نے انسپکٹر عمران کو سیٹھ دولت کی حویلی بھیج دیا۔

انسپکٹر عمران حویلی میں داخل ہوا تو اس وقت صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا' باغ سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ باغ کے ایک اونچے درخت کی جھلک دکھائی دے رہی تھی جس پر لگے ہوئے بڑے بڑے سرخ پھول روش پر چلتے ہوئے خون میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے تھے جیسے انہوں نے کسی کا خون پی لیا ہو۔

انسپکٹر عمران کے ساتھ فوٹو گرافر اور انگلیوں کے نشانات اٹھانے والے لوگ بھی تھے وہ سب مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے کمرۂ واردات میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر عمران نے آگے بڑھ کر لاش کا بغور جائزہ لیا اس کھڑکی کو دیکھا جس کا شیشہ باہر سے توڑ کر ملازم نے ہاتھ اندر داخل کر کے چٹخنی گرائی تھی۔ سیٹھ دولت' فیصل اور عمران ساتھ تھے۔

''کمرا اندر سے مکمل طور پر بند تھا۔'' انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نظریں سیٹھ دولت پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں انسپکٹر صاحب کمرا اندر سے بند تھا' ہم لوگ تو سکندر کی چیخیں سن کر ادھر آئے' ملازم کو شیشہ توڑ کر کھڑکی کھول کر دروازہ کھولنے کی ہدایت کی جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری قسمت پھوٹ گئی تھی' میرا بڑا بیٹا اور ان دونوں کا بڑا بھائی بستر پر مردہ پڑا تھا۔ لاش اس وقت سے اسی پوزیشن میں ہے۔'' انسپکٹر عمران نے آگے بڑھ کر بستر کے قریب ہوتے ہوئے دستانے پہن کر لاش کے گلے کے دو بڑے سوراخوں کا جائزہ لیا جن سے خون ابل ابل کر سفید چادر کو گلنار کر چکا تھا۔ انسپکٹر عمران نے انچ ٹیپ سے گھاؤ کی لمبائی کا جائزہ لیا تقریباً چھ انچ لمبے تیز دانتوں سے لگائے گئے زخم تھے اس کے بعد انسپکٹر عمران نے سکندر کے تکیے کا جائزہ لیا اس کے اوپر سکندر کی خون آلود انگلیوں کے نشانات تھے' تکیے کے نیچے سکندر کا اعشاریہ اڑتیس بور کا' ریوالور موجود تھا۔ انسپکٹر عمران نے ریوالور کی نال کو سونگھا اور پھر چیمبر کھول کر گولیوں کا جائزہ لیا' ریوالور سے ایک گولی فائر کی گئی تھی یعنی جس وقت خونی درندے نے حملہ کیا اس کی گردن سے خون نکلا' حالت اضطرار میں خون کی دھار سے سرخ ہونے والے ہاتھ کے نشانات تکیے پر لگے پھر اس ہاتھ سے سکندر نے ایک فائر کیا لیکن درندہ کامیاب واردات کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

انگلیوں کے نشانات اٹھانے والوں نے اعلان کیا کہ کمرے میں سکندر اور اہل خانہ کی انگلیوں کے نشانات کے سوا کسی اور انسان یا درندے کے نشانات موجود نہیں البتہ بستر کا جائزہ لیتا ہوا انسپکٹر عمران چونک اٹھا' بستر پر ایک جگہ خون کے بڑے سے دھبے کو جب اس نے محدب عد سے کی مدد سے دیکھا تو وہ کسی بہت بڑے بلی یا شیر کے پنجے کا نشان تھا۔ انسپکٹر عمران نے اس کی تصویریں اتروائیں اور پھر چاقو سے چادر کا وہ حصہ کاٹ کر لفافے میں محفوظ کرلیا۔

اب فیصل اور آفتاب انہیں واش روم میں لے آئے جہاں بالٹی کا پانی سرخ تھا جو اب سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ دونوں نے اپنے خدشات سے انسپکٹر کو آگاہ کیا' یہ بھی بتایا کہ فرزانہ کی چھوٹی سی خوب صورت بلی سونیا جس کے کان سرخ سرخ سے تھے بستر کے نیچے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

کوئی اور کلیو نہ پا کر انسپکٹر عمران ڈرائنگ روم میں فرزانہ اور عمران کے پاس آیا۔ بلی واقعی بڑی خوب صورت اور پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی سفید جلد پر چھوٹے چھوٹے پھولدار دھبے سے بادامی رنگ کے بنے ہوئے تھے اس کی دُم سنہری تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی دم پر سنہرا پینٹ کا برش پھیرا گیا ہو۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بڑی پیاری اور تیز چمک تھی' وہ اس وقت سونیا کی گود میں بیٹھی پیالے سے دودھ پی رہی تھی۔ انسپکٹر عمران کی آواز سن کر اس نے میاؤں کی آواز نکالی اور پھر دودھ پینے لگی۔

انسپکٹر عمران نے قریب آ کے بلی کے دونوں کان چٹکیوں میں پکڑ لیے' بل میاؤں میاؤں کرنے لگی' انسپکٹر عمران نے محدب عد سے بالوں کا جائزہ لیا وہ خون آلود تھے پھر انسپکٹر عمران نے جیب سے کٹر نکالا اور بلی کے چند بال کا لیے' بلی چیخنے اور غرّانے لگی لیکن انسپکٹر عمران اپنی کارروائی مکمل کر ڈالی۔

اب وہ بلی کے چھوٹے چھوٹے خون آلود بال اور بستر سے ملنے والے دو بڑے بڑے بال لے کر میز پر آ بیٹھا۔ بڑے بال بھی خون آلود انسپکٹر عمران نے بغور دیکھتے ہوئے رائے قائم کی کہ دونوں بال ایک جیسے ہی ہیں مگر یہ چھوٹے منہ والی بلی اور کہاں وہ گہرے اور چوڑے گھا سکندر کی گردن پر لگے کسی خوفناک درندے کی کارروائی کی کہانی سنا رہے تھے۔ اس سوال انسپکٹر عمران کو چکرا کر رکھ دیا پھر یہ سوال بھی اس کے ذہن میں اٹھنے لگا کہ گھر کی پالتو بلی کو آ سکندر سے کیا رنجش ہوسکتی ہے جب سب ہی اس سے پیار کرتے تھے وہ سب کے کمروں میں آزادانہ آتی جاتی اور گھومتی پھرتی تھی وہ کسی کی بھی گود میں اچھل کر بیٹھ جاتی تو اسے پیار اور شفقت ہی ملتی تھی وہ سوچتے سوچتے کسی نتیجے پر نہ پہنچ پھر اس نے تمام کمروں اور اہم مقامات پر کیمر نصب کروادیئے اور حفاظت کے لیے دو سپاہی چھوڑ کر آفس روانہ ہوگیا۔ قتل کے حالات بظاہر یہی نتیجہ نکل رہا تھا کہ کسی مافوق الفطر قوت (ماورائی طاقت) نے سکندر کو کسی دشمنی کی پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

❀......❀......❀

سکندر کو فارم کے ساتھ واقع آبائی قبرستان میں دفن کروا دیا گیا' ساری حویلی میں ماتمی فضا طاری ہوگئی تھی سیٹھ دولت کے رشتہ دار اور عزیز مہمان نے ٹھہرے ہوئے تھے سب نے ہی گہرے افسوس و رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سیٹھ صاحب کی باقی اولاد کو دعائیں دی تھیں۔ ایک بزرگ قسم کی عورت جو افسوس کرنے والوں میں شامل تھی اس نے اپنے مراقبے سے نکلنے کے بعد سیٹھ دولت اور ان کے باقی بچوں کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''حویلی پر کوئی آسیب یا بد روح مسلط ہوچکی ہے' یہ کسی چور ڈاکو یا قاتل کی کارستانی نہیں ہے لیکن میں ان چیزوں پر براہ راست ہاتھ نہیں ڈالتی آپ کسی پیر فقیر کو بلوا کر سد باب کروائیں ورنہ وہ منحوس ڈائن کسی اور پر حملہ نہ کر بیٹھے۔''

''بڑی بی! میں بھوت' پریت' چڑیل ڈائن' بد روح ان مخلوقات کا قائل نہیں ہوں' نہ میرا جنگلوں میں شکار کے دوران کبھی ان سے واسطہ پڑا ہے لیکن اگر آپ کا اصرار ہے تو کسی ماہر روحانیت کو بلوا لیتے ہیں۔'' سیٹھ دولت خان نے اپنی باقی اولادوں پر پُرشفقت نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے ان سے زیادہ اور کسی چیز کی پروا یا طلب ہوسکتی ہے؟'' سیٹھ دولت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ملازم پیر کرم علی شاہ کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہوئے حویلی میں لے آئے یہ صاحب رائے ونڈ روڈ پر اپنے آستانے پر لوگوں کے مسائل حل کرتے ہوئے کافی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ پیر کرم علی شاہ کے ساتھ اس کا خاص مرید آلو بخارہ بھی تھا جو کچھ مسخرہ سا بھی معلوم ہوتا تھا۔

پیر کرم علی شاہ کے سامنے حویلی کے نچلے ڈرائنگ روم میں تمام اہل خانہ جمع تھے' پیر صاحب آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے ان کے سامنے ایک ہانڈی سے دھوئیں کی لکیر سیدھی اوپر کو اٹھ رہی تھی میز پر کچھ جانوروں کی ہڈیاں بھی پڑی تھیں' ایک کٹورے میں الّو کا خون بھرا ہوا تھا' ایک چمکدار آئینہ بھی اسٹینڈ پر موجود تھا۔

پیر کرم علی شاہ کا چہرہ سرخ و سفید تھا' آنکھوں میں تیز چمک اور بھاری بھرکم چہرے سے خاصے بارعب دکھائی دیتے تھے' گلے میں موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا پڑی ہوئی تھی جس کے وسط میں ایک انسانی کھوپڑی لگی ہوئی تھی۔ پیر کا چیلا عمرانہ کے سامنے بڑھانک رہا تھا۔

''کیا بتاؤں مس صاحبہ! بھوپال میں منشی حسین خان کے تالاب پر ایک بھوت نے بڑا زبردست خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا' لوگ گرمی کے موسم میں اس تالاب پر نہانے اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے آتے تھے اچانک ایسا ہونے لگا کہ تالاب میں نہانے والوں میں سے ایک آدمی پُراسرار طور پر غائب ہونے لگا۔ کالا بھوت جس کے ہونٹ سفید اور آنکھیں سرخ تھیں وہ کسی ایک آدمی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لے جاتا تھا اور پھر تالاب کی تہہ میں اس کا خون پی کر غائب ہوجاتا تھا۔ وہ خوب موٹے تازے اور تندرست آدمیوں کا انتخاب کرتا تھا' بس اس کی کم بختی کے دن آ گئے تھے کہ ہمارے حضرت صاحب لوگوں کی دہائی پر وہاں پہنچے اور تالاب پر نہانے کے لیے تشریف لے گئے۔ بس ہمارے پیر صاحب کی صحت اور رنگ روپ دیکھ کر کالا بھوت رہ نہ سکا اس نے پیر صاحب کا پیر گھسیٹ لیا۔ ہمارے حضرت صاحب نے اس کے بال پکڑ لیے

اور منتر پڑھتے ہوئے اسے کھینچ کر تالاب کے باہر لے آئے اور لوگوں کے سامنے اس کی مرمت شروع کردی' دھینگا مشتی میں پیر صاحب نے جست کی اور اس کے کندھوں پر سوار ہوگئے اس وقت ہمارے پیر صاحب کا منتر بھی پوری طرح حاوی ہوگیا اور ہمارے پیر صاحب اسے جوتے مارتے ہوئے بستی میں لے گئے اور سب لوگوں کو اس کی مرمت کا تماشہ دکھایا لوگوں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دیں۔ بول بول کر حلق خشک ہوگیا ہے ایک گلاس شربت ہی پلادیں۔'' آلو بخارہ نے عمرانہ کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ عمرانہ نے ملازم کو اشارہ کیا ملازم گلابی رنگ کے شربت کا گلاس لے آیا۔ ''شکریہ'' آلو بخارہ نے گلاس تھام لیا پھر گلاس پر پُرتحسین نگاہ ڈالتا ہوا بولا۔

''مس صاحبہ! مشروب اور آپ کے چہرے کا رنگ کتنا ملتا جلتا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شربت شباب آور ہے۔''

''تم کچھ شریر معلوم ہوتے ہو۔'' عمرانہ نے آلو بخارہ کا کان مروڑ دیا۔

''شریر اور آتما کا ہی تو سارا چکر ہے۔'' آلو بخارہ نے مروڑا ہوا کان مسلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی آنکھوں میں بڑی گہرائی ہے۔'' آلو بخارہ نے ایک فلمی ادا سے جھومتے ہوئے کہا۔

''میرے ڈیڈی کا ہنٹر کھال میں گہرائی تک اتر جاتا ہے۔'' عمرانہ نے ہاتھ لہراتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

''مس صاحبہ! آپ گلاب دیوی ہیں آپ کو خون کا نذرانہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔'' آلو بخارہ کے اس جملے پر عمرانہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ فرزانہ خاموشی سے مسکراتے ہوئے نوک جھونک سن رہی تھی' غمگین اور افسردہ ماحول پر پھیلی خوشگوار گفتگو تھی۔ آلو بخارہ کے چہرے پر معصومیت اور بھولپن بھی ایسا تھا کہ انہوں نے دلچسپی لے لی تھی۔

''میرے حضرت صاحب ایک علم کرنے والے ہیں۔''

''وہ کیا......؟'' اس مرتبہ عمرانہ اور فرزانہ دونوں کے منہ سے نکلا۔

''وہ میری شادی کرنے جارہے ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھی اور خوشی کی بات ہے۔'' عمرانہ نے جلدی سے کہا۔

''خاک اچھی ہے' لڑکی کی ایک آنکھ مصنوعی ہے اور ایک کان ربر کا ہے۔ ایک ٹانگ بیساکھی لگی ہے۔'' آلو بخارہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

اس وقت پیر صاحب نے اپنی جلالی آنکھیں کھول دیں اور سیٹھ دولت کو قریب بلایا۔

''سیٹھ صاحب ایک خطرناک بدروح اس گھر میں موجود ہے' وہ بلی' کتے یا کسی اور شکل میں بھی ہوسکتی ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے' میں آپ کے بچوں کے لیے چار تعویز دے رہا ہوں یہ وہ ہر وقت اپنے گلوں میں ڈالے رکھیں' اس کے علاوہ چار سیاہ بکرے منگوایئے اور اپنے بچوں کے ہاتھ لگوا کر ذبح کروا کے گوشت غربا و مساکین میں تقسیم کروادیجئے۔ امید ہے وہ خونی بدروح آپ کے گھر سے ٹل جائے گی۔ میرے علم کے مطابق آپ کے ہاتھوں اس کے بچوں کو کوئی نقصان پہنچا ہے جس کا ردعمل سامنے آیا ہے۔''

''میرے ہاتھوں؟'' سیٹھ دولت کے منہ سے نکلا۔ ''میرا کسی بدروح سے کیا واسطہ یا تعلق انسانوں کے معاملات انسانوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جنوں بھوتوں بدروحوں کی باتو الگ ہوتی ہوگی۔'' سیٹھ دولت نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارا علم کبھی جھوٹ نہیں کہتا۔'' پیر کرم علی شاہ نے کچھ ناگواری سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سیٹھ دولت نے انہیں کندھوں سے تھام کر بٹھایا پھر ملازموں کو بھگایا۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد ملازم چار کالے بکرے کانوں سے تھامے اندر داخل ہوئے۔ پیر صاحب نے فیصل' اقبال' عمرانہ اور فرزانہ کے ہاتھ لگوا کر حویلی کے قصاب کے پاس بھجوادیئے۔ اس وقت آلو بخارہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''یاحضرت مجھے ایک عدد کالی مرغی ہی منگوادیجیے۔''

''گستاخ! ناہنجاز...... تمہیں ہر وقت مسخرہ پن ہی سوجھتا ہے' چل دو منٹ کے لیے کان پکڑلے۔'' پیر صاحب نے گرجدار لہجے میں کہا۔

''حضور پہلے مرغی تو منگوایئے پھر مرغا بن جاؤں گا۔'' آلو بخارہ نے کچھ ایسے مسخرے پن سے کہا کہ پیر صاحب بھی ہنس دیئے۔

''اچھا شغل چھوڑو اور یہ بوتلوں میں بند پانی سیٹھ صاحب کے بچوں کے کمروں میں چھڑک کے آ۔'' سیٹھ صاحب نے ایک ملازم کو آلو بخارہ کے ساتھ کردیا۔ جب وہ لوگ اپنے کام سے فارغ ہوگئے تو سیٹھ دولت نے روپوں کے علاوہ پیر صاحب کو پھلوں کے ٹوکرے دے کر روانہ کیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

آج رات پھر آسمان پر گہرے بادل پھیل گئے تھے بجلی چمک رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے گزرتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی۔ حویلی کے عقبی باغ میں سیٹھ دولت کے کتے حفاظت کے لیے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے' کبھی کبھار وہ کسی چڑیا یا پرندے کو دیکھ کر غراتے اور اچھل کر دبوچنے کی کوشش بھی کرتے' ان کی سرخ آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں۔ حویلی کے محافظ اور گارڈ بھی پوری طرح مستعد تھے' پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق سیاہ بکروں کی کھالیں حویلی کے چاروں کونوں میں لٹکادی گئی تھیں۔ اس وقت کسی الو کی منحوس آواز پرانے درخت سے سنائی دی۔

''اس خبیث کی آواز نحوست کی علامت ہے۔'' پہرے دار نے برآمدے میں کرسی سے اٹھ کر باغ پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے بھی ایک درخت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ مردود اکثر اسی درخت سے چیختا ہوا سنا گیا ہے۔''

''کیوں نہ اس کا قصہ ہی پاک کردیا جائے۔'' پہلے محافظ نے دانت پیس کر کہا۔

''نہیں ہمیں برآمدے سے ہٹنے کی اجازت نہیں' یہاں سے سارے باغ پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔'' دوسرے محافظ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ڈائننگ ہال کے آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی' سیٹھ دولت شطرنج کی بساط پر موجود تھے ان کے مقابل اس وقت ان کا بیٹا فیصل تھا وہ بھی کبھی کبھار شطرنج اپنے دوستوں سے کھیلا کرتا تھا۔

اقبال سامنے صوفے پر بیٹھا کیبل پر چلنے والی کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔

عمرانہ اور فرزانہ ٹیبل پر لڈو بچھائے کھیل میں مصروف تھیں' بظاہر وہ غم کو بھلانے کی کوشش کررہے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کرلیا کہ خونی رشتے کی جدائی کے غم کو بھلانا اتنا آسان نہیں۔ سکندر ان کے تصور میں بار بار آ کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی باتیں' اس کی حرکتیں' اس کا مثالی کردار اس کی سب سے محبت' وہ سب ہی منظر فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے تھے۔ اچانک سیٹھ دولت کے منہ سے نکل گیا۔

''بیٹا سکندر تم اب بچ نہیں سکتے۔'' پھر چونک کر غور سے فیصل کو دیکھتے ہی سکندر کی یاد آنے پر ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

سیٹھ دولت خان تصور سے نکل کر فیصل کی طرف متوجہ ہوئے تو چونک اٹھے یکایک وہ پریشان مضمحل اور خوف زدہ سا دکھائی دینے لگا تھا۔

''بیٹے فیصل خیر تو ہے۔'' سیٹھ دولت نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

''ڈیڈی رات میں نے بھی ایک خوفناک اور سنسنی خیز خواب دیکھا ہے جس کی دہشت بار بار مجھ پر وقفے وقفے سے طاری ہوجاتی ہے' حالانکہ میں خوابوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا یہ عملاً جھوٹے ہوتے ہیں اور نہ ہی میں نے زندگی میں ڈرنا سیکھا ہے۔ میں نے بہت سی خوفناک فلمیں دیکھی ہیں' دوستوں کے شرط لگانے پر قبرستان سے بھی گزرا ہوں لیکن کبھی مجھ پر خوف اور دہشت کا غلبہ نہیں ہوا لیکن اس خواب نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے پھر سکندر صاحب کا خواب دیکھنا اور اس کی خوفناک تعبیر بھی خوف کو مہمیز کررہی ہے۔'' فیصل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''بیٹے تم نے کیا دیکھا؟'' سیٹھ دولت نے بے تابی سے فوراً پوچھا۔

''بس ڈیڈی میرے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے' میں پانی میں تیر رہا ہوں' ڈبکیاں لگا رہا ہوں' غوطہ زنی کررہا ہوں' تیراکی مجھے ویسے بھی بہت پسند ہے۔ اچانک ایک غراہٹ سن کر پانی میں میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں' میں مڑ کر دیکھتا ہوں ایک شیر کے برابر سیاہ درندہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے سطح آب پر کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ میں خوفزدہ ہوکر کنارے کی طرف تیرنے لگتا ہوں' درندہ تیزی سے سطح آب پر گویا اڑتا ہوا میری طرف آرہا تھا' میرے چھکے چھوٹ گئے' خوف سے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ میں ابھی کنارے سے کافی دور تھا کہ وہ سیاہ درندہ میرے قریب پہنچ گیا' اس نے جست مارتے ہوئے منہ کھول کر میری گردن دبوچ لی اس کے منہ میں دو بڑے بڑے خوفناک چمکیلے دانت تھے' میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی جب میں بستر پر بیدار ہوا تو سردی کے باوجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور سامنے کھڑکی کے شیشے پر مجھے دو ننھی ننھی سرخ آنکھیں اپنی طرف گھورتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں' میں ہمت کرکے اٹھا' تکیے کے نیچے سے پستول نکالا شیشے کے سامنے پہنچا تو وہ سرخ آنکھیں غائب ہوچکی تھیں۔''

''بیٹے تمہارا خواب بھی سکندر سے ملتا جلتا ہے یہ بھی درندے کی دھمکی اور بدشگونی پر مبنی ہے۔ تمہاری جان کو خطرہ لاحق ہے لیکن پیر کرم علی شاہ

نے کہا تھا کہ تعویز آپ کے بچوں کے گلے میں پڑے رہے تو کچھ خطرہ نہیں' درندہ قریب بھی آیا تو خود بخود پسپا ہوکر بھاگ جائے گا' اس کے علاوہ سیاہ بکروں کی کھالیں بھی لٹکا دی گئی ہیں۔ دم شدہ پانی بھی حویلی میں چھڑکا گیا ہے' بے فکر رہو میرے لعل! اب وہ درندہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' سیٹھ دولت نے قدرے پُرجوش لہجے میں کہا' فیصل نے گلے میں پڑے تعویز کو ہلا جلا کر اطمینان کا سانس لیا۔

رات کا وقت تھا فیصل اپنے بستر پر بے خبر سو رہا تھا اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اسے شدید بخار محسوس ہونے لگا' اس کا جسم جل رہا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا' اسے پیٹ میں گرانی اور بے زاری کا احساس بھی ہورہا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ نہا کر باغ میں چہل قدمی کیا کرتا تھا۔

باغ کے کتے تو فوراً ہی اسے پہچان کر قدموں میں لوٹنے لگتے تھے' فیصل نہانے کے لیے واش روم میں چلا آیا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے اتارے اور فوارے کے نیچے آگیا' کپڑے اتارتے وقت اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے تعویز کو بھی بخار میں الجھن محسوس کرکے اتار کر شیلف میں رکھ دیا اور نہانے کے بعد تازہ دم ہوکے اس نے کپڑے پہنے تو تعویز پہننا بھول گیا۔ واش روم سے نکل کر وہ کمرے کے بیرونی دروازے سے باہر کاریڈور میں نکلا اور عقبی باغ کی طرف چلنے لگا' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باغ میں چہل قدمی کرکے گرانی معدہ کو دور کرے اس نے کھانا کچھ زیادہ کھالیا تھا۔ آسمان پر بادل پھٹ گئے تھے' بارش رک چکی تھی اور روشن چاند اپنی خواب آور کرنیں باغ پر نچھاور کررہا تھا' منظر بڑا سہانا تھا' ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکوں میں باغ کے پھول خاص کر رات کی رانی کی مہک بسی ہوئی تھی۔ فیصل خوشگوار مہک سانس کے ذریعے سمیٹتا ہوا باغ میں چلا آیا۔ حفاظتی کتے ایک لمحے کے لیے چونک کر غرائے پھر فیصل کی مہک محسوس کرکے وہ ادھر اُدھر سے نکل کر آئے اس کے قدموں میں لوٹنے لگے۔ فیصل کتوں سے بڑا پیار کرتا تھا اس لیے وہ بھی خاص طور پر فیصل کے اردگرد منڈلانے لگتے تھے' فیصل نے ''گو'' کا لفظ کہا اور اشارہ کیا جس کے بعد کتے بکھر گئے۔

فیصل روشن چاند کی خوب صورت سطح کو دیکھتا ہوا گنگناتا ہوا وسطی فوارے اور بڑے تالاب کی طرف بڑھنے لگا جو خاص طور پر اس کی تیراکی کے لیے سیٹھ دولت نے بنوایا تھا' اچانک ایک بھیانک سی غراہٹ عقب سے سن کر فیصل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی ایک بڑی سی گنجان جھاڑی کی اوٹ سے ایک شیر کے قد کا بڑے سے منہ والا خوفناک درندہ نکلا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورنے لگا۔ فیصل کا سانس سینے میں اٹکنے لگا وہ درندہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا اس وقت فیصل نے انگلی منہ میں دے کر سیٹی بجائی تو باغ کے سارے محافظ کتے دوڑتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔ انہوں نے خوفناک درندے کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنا شروع کردیا۔ عقبی برآمدے کے محافظ بھی تیزی سے اس طرف آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی بندوقیں تھیں۔ کتوں نے درندے کو گھیر لیا لیکن درندے نے ذرا بھی پروانہ کی اور جیسے ہی ایک کتا حملہ آور ہوا اس نے

اپنا پنجہ مار کر کتے کا پیٹ پھاڑ دیا‘ کتے کے منہ سے بڑی کراہ سی نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا‘ باقی کتوں نے غضبناک ہو کر اس پر حملہ کر دیا لیکن درندے پر ان کے حملے کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے ایک کتے کو دور اچھال پھینکا اور دوسرے کتے کی گردن چبا ڈالی‘ کتے کی بھیانک چیخ سے باغ گونج اٹھا۔

مسلح محافظوں نے کتوں کو پسپا ہوتا دیکھ کر اس درندے پر فائر کھول دیا لیکن فیصل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ درندے پر کوئی اثر نہ ہوا تھا اور وہ برابر آگے بڑھ رہا تھا‘ فیصل بھاگنے لگا بے خیالی میں وہ تالاب کی طرف ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔ ایک محافظ نے دلیری سے درندے کے قریب جا کر اسے بندوق کا بٹ گھما کر مارا لیکن اس کا بٹ ہوا میں ہی رک گیا اور درندے اس کا بندوق والا ہاتھ پنجے میں دبوچ کر بازو سے الگ کر دیا‘ محافظ کی خوفناک چیخ سے ماحول کانپ اٹھا۔ فیصل یہ منظر دیکھ کر خوف سے خود بخود تالاب میں جا گرا اور الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

شیر کے جسم کا خوفناک سیاہ درندہ اپنی سرخ سرخ انگارہ آنکھوں سے فیصل کو گھورتا ہوا پانی میں اتر کر گویا اڑتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت سیٹھ دولت اور فیصل کے بھائی بہنیں بھی بیدار ہو کر بھاگتے اس کی طرف آ رہے تھے جیسے وہ تالاب کے قریب پہنچے فیصل کی خوفناک چیخ نے ان کی بھی چیخیں نکلوا دیں۔ فیصل کی گردن ادھر پڑی تھی اور اس کا جسم پانی میں ڈوب رہا تھا‘ سطح آب پر سرخی پھیل گئی تھی ان کی آنکھوں کے سامنے خوفناک شیر نما درندے نے سطح آب سے جست کی اور ایک گھنے درخت پر جا کر غائب ہو گیا۔

❀……❀……❀

فیصل کی لاش تالاب سے نکلوا کر بستر پر چادر سے ڈھک دی گئی تھی انسپکٹر عمران پورا واقعہ سن رہا تھا۔ پوری تفصیل سے آگاہ ہونے کے بعد وہ سیٹھ دولت اور اقبال کے ساتھ اس کمرے میں آیا جہاں عمارت میں جگہ جگہ لگائے گئے کیمروں کی تصاویر اسکرین پر دیکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کمرا تاریک سا تھا انسپکٹر عمران نے سوئچ دبایا تو ماحول جگمگا اٹھا‘ اسکرین کو روشن کیا گیا سسٹم چالو ہوا تو مووی کیمروں کی اتری ہوئی تصاویر اسکرین پر دکھائی دینے لگیں۔ انسپکٹر عمران نے کنٹرول بورڈ سے بٹن دبا کر ایک منظر کو دیکھا جس میں کمرے سے نکل کر بھاگتی ہوئی چھوٹی سی بلی جو یقیناً فرزانہ کی سونیا تھی‘ اچانک بڑھتے بڑھتے شیر کے قد کے برابر خوفناک درندے میں تبدیل ہو گئی پھر وہ سامنے بیرونی دروازے سے لپٹ گئی اور اس کی چٹخنی گرا کر اسے ہینڈل سے کھول کر باہر عقبی باغ کی طرف نکل گئی‘ یہ رات کا منظر تھا۔

اب انسپکٹر عمران سیٹھ دولت اور اقبال کی طرف متوجہ ہوا اور پھٹی پھٹی نظروں سے بلی باندھے بلی کو درندے میں تبدیل ہوتا دیکھ رہے تھے۔

”یہ…… یہ کیا ہوا؟“ سیٹھ دولت کی آواز انسپکٹر عمران کو کسی اندھے کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

”سیٹھ صاحب اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا ہے‘ فرزانہ کی معصوم بلی کے اندر کوئی بدروح سما گئی ہے‘ جو اسے خوفناک درندے میں تبدیل کر کے آپ کے بیٹوں کی گردنیں چبا چکی ہے لیکن بے فکر رہیں اب اس کی موت آ گئی ہے اور یہ میرے ہاتھوں ہی آئے گی۔“ انسپکٹر عمران نے پُرجوش لہجہ میں کہا اور پھر اپنے گلے میں لٹکے قرآن مجید والے لاکٹ کو چوم کر چھوڑ دیا‘ لاکٹ پھر گلے میں اپنی جگہ پر دکھائی دینے لگا یہ چھوٹا سا مکمل قرآن مجید تھا جو سونے کے سنہری خول میں بند تھا۔ اسے انسپکٹر عمران کی والدہ کے پیر بابا سمرقند ملتانی نے پہنایا تھا کہ شاید کبھی اسے مجرموں سے ٹکراتے ہوئے روحانی قوت کی ضرورت پیش آ جائے اور آج یہ موقع آ چکا تھا۔

”انسپکٹر صاحب سمجھ میں نہیں آتا آخر اس بدروح کو میرے بچوں سے کیا دشمنی ہے‘ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔“ سیٹھ دولت نے سوچتے ہوئے کہا اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

”سیٹھ صاحب اس سوال کا جواب بھی امید ہے جلدی مل جائے گا اور میں تو اس خونی بلی یا درندے کو ختم کر کے ہی جاؤں گا۔“ انسپکٹر عمران نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ اسی وقت بجلی سی کوند گئی اور کمرے میں دائیں جانب آتش دان پر رکھی تصویر کے پیچھے سے فرزانہ کی بلی نے غرّا کر باہر نکلتے ہوئے انسپکٹر عمران پر چھلانگ لگا دی جب وہ انسپکٹر عمران کے اوپر جھپٹی تو وہ خوفناک درندے میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن لاکٹ سے نکلنے والی چمک اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی انسپکٹر عمران نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے دور اچھال پھینکا‘ لاکٹ کی چمک مسلسل اس کی آنکھوں میں تکلیف پیدا کر رہی تھی وہ غرّا کر پلٹی اور بھاگ نکلی دروازہ اس کی ٹھوکر سے زور سے کھل گیا اور وہ فرش پر دوڑتی چلی گئی۔

سیٹھ دولت اور اقبال پریشان ہو کر انسپکٹر عمران کی گردن دیکھنے لگے‘ انسپکٹر عمران نے کوٹ کا موٹا اونچا کالر گرا دیا۔ سیٹھ اور اس کا بیٹا چونک اٹھے‘ انسپکٹر عمران کے گلے میں لوہے کا فولادی گلوبند چڑھا ہوا تھا جس میں درندے کے دانت گھس نہیں سکے تھے۔

”انسپکٹر عمران آپ واقعی کمال کے آدمی ہیں اور بلاوجہ ہی مشہور نہیں ہیں اس وقت بدروح کو پسپا کرنا آپ کا ہی کام ہے اگرچہ یہ آپ کے پیشے سے مختلف معاملہ ہے۔“ سیٹھ دولت نے انسپکٹر عمران کے گلے پر چڑھے گلوبند کو پُرتحسین نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جب بھی کبھی کسی بھی مسئلے میں کودا ہوں تو اسے حل کیے بغیر کبھی سانس نہیں لیا۔“ انسپکٹر عمران نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

”آپ کی یہ ترکیب بہرحال بہت کمال کی تھی۔“ آفتاب نے متاثرہ لہجے میں کہا اس وقت کہیں دور سے شیشہ ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انسپکٹر عمران کے پیچھے دوسرے بھی بھاگ کھڑے ہوئے‘ سیٹھ دولت چونکہ شکاری تھا اس لیے وہ دوڑتے ہوئے انسپکٹر عمران کے قریب قریب ہی تھا۔ ایک ملازم نے اشارے سے بتایا کہ شیشہ کدھر ٹوٹا ہے۔ اب سیٹھ دولت آگے ہو لیا دو تین مقامات سے گزر کر وہ سب سیٹھ دولت کے کمرے میں داخل ہوئے تو چونک کر سامنے بڑی کھڑکی کے چکنا چور شیشے کو دیکھنے لگے جو کئی مقامات سے توڑا گیا تھا۔

سیٹھ دولت کے ساتھ ہی انسپکٹر عمران اور اقبال بھی اندر داخل ہوئے‘ ملازم باہر رک گئے۔ اس وقت کمرے پر طائرانہ نگاہ گھماتے ہوئے سیٹھ دولت کی نظر بستر کے سامنے شمالی دیوار پر جم

کررہ گئی‘ سیٹھ حیرت اور خوف کی کیفیت میں مبتلا ہوکر آگے بڑھا انسپکٹر عمران بھی فوراً نزدیک چلا گیا۔

دیوار پر سیٹھ دولت کی فیملی کی تصویر لگی ہوئی تھی لیکن اس کے بچوں کی تصاویر کے اوپر ایک چمکیلے سفید کاغذ پر سرخ رنگ کی سنسنی خیز اور خوفناک عبارت درج تھی جوں جوں سیٹھ دولت خان عبارت پڑھتا گیا اس کا رواں رواں کھڑا ہوتا چلا گیا چہرے پر خوف اور اضمحلال سے جھریاں سی پڑ گئیں اس نے انگلی سے عبارت کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر عمران اونچی آواز میں عبارت پڑھنے لگا جو کافی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی‘ الفاظ یہ تھے۔

’’سیٹھ دولت خان یاد کرو‘ موضع شاہ پور کے جنگل سے واپس لوٹتے ہوئے تم نے جنگل سے آبادی کی طرف آنے والی سڑک پر موڑ مڑتے ہوئے بلی کے پانچ کھیلتے ہوئے بچوں کو گاڑی کے ٹائروں کے نیچے بے دردی سے کچل دیا تھا‘ وہ میری اولاد تھی میرے لخت جگر تھے۔ انہیں بلی کے بچے بن کر کھیلنے کا شوق تھا۔ ماما کا جذبہ انسانوں اور جنات سب میں ایک جیسا ہوتا ہے‘ یہ ایک فطری کیفیت ہے میں واقعی بدروح ہوں اور سونیا کے جسم میں داخل ہوکر اسے خوفناک انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہوں۔ میں تمہارے بھی پانچوں بچوں کو مار کر سکون کا سانس لوں گی اور تم بھی میری طرح اولاد کی جدائی کی آگ میں جلو گے۔ اس سے میری روح کو کچھ شانتی مل جائے گی کہ میں نے اپنے بچوں کے قاتل سے انتقام لے لیا۔‘‘ عبارت کے نیچے شیر نما درندے کی سیاہ تصویر تھی جس کے کھلے منہ میں صرف دو بڑے بڑے دانت تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا۔

’’اب کیا ہوگا؟‘‘ سیٹھ دولت نے سوچتے ہوئے فکر مند لہجے میں کہا۔

’’انسپکٹر عمران! وہ محض ایک حادثہ تھا میں جیسے ہی جنگل سے آبادی کی طرف آنے والی سڑک کا ایک موڑ مڑا اچانک ہی بلی کے بچے میری کار کی زد میں آگئے تھے مجھے ان کے مرنے کا دکھ ہوا تھا لیکن رات کا وقت تھا اور پھر وہ اچانک ہی سامنے آگئے تھے یہ محض ایک اتفاقیہ حادثہ تھا لیکن اب وہ بدروح میرے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گئی ہے اور دو کو ہلاک کرچکی ہے۔‘‘ سیٹھ دولت کی آواز میں کرب سے سسکی سی شامل ہوگئی اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ کر گالوں پر پھسلنے لگے دو جوان بیٹوں کی موت کا غم واقعی گہرا گھاؤ ہوتا ہے۔ انسپکٹر عمران بخوبی اس بات کا احساس اور شعور رکھتا تھا اس نے سیٹھ دولت کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

’’سیٹھ صاحب میں اب اس خوفناک بدروح کو مار کر ہی اس حویلی سے جاؤں گا تاکہ وہ آپ کی کسی اور اولاد کو نشانہ نہ بنا سکے۔‘‘ ان الفاظ کے ساتھ انسپکٹر عمران نے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کو چوما اور پھر اپنی جیکٹ کی ایک خفیہ جیب سے چپٹی سی ڈبیہ نکالی اس کا ڈھکنا اتارا‘ اس میں چار چار انچ لمبی تیز چمکدار چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر عمران نے لاکٹ اتار کے میز پر رکھا اور قرآنی لاکٹ کے گرد موجود چھوٹے چھوٹے ہکس میں تیز دھار چھریوں کے پچھلے حصوں پر موجود گول دائرے کی صورت میں گھومے ہوئے کڑے میں پھنسا کر جکڑ دیئے‘ اب لاکٹ کے گرد تیز دھار خطرناک چھریاں نصب ہوچکی تھیں۔

انسپکٹر عمران نے لاکٹ کی زنجیر میں ایک لمبا مضبوط فیتہ ڈال دیا اور پھر کچھ قرآنی دعائیں خاص ترتیب سے پڑھنے لگا‘ یہ پیر سمرقند بابا ملتانی نے بتائی تھیں کہ انہیں مخصوص طریقے سے پڑھنے والے کی مشکل اور دشواری حل ہوجائے گی۔ مشکل خود بخود آگے بڑھے گی اور پھر قرآنی چمک سے کرنوں سے ٹکرا کر نیست و نابود ہوجائے گی۔ انسپکٹر عمران لمبے فیتے کی مدد سے قرآنی لاکٹ کو گھماتا ہوا ساری حویلی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ سونیا کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی‘ انسپکٹر عمران جانتا تھا کہ بلی میں بدروح ہے جو کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ فرزانہ کو خاص طور پر منع کردیا گیا تھا کہ سونیا کہیں بھی نظر آئے تو اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرے اور جب نظر آئے تو فوراً انسپکٹر عمران کو موبائل فون پر اس کی اطلاع کردے۔ گھر کے ملازم بھی انسپکٹر عمران کے ساتھ سونیا کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے سب ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے‘ گھر کے کمرے‘ واش روم‘ اسٹور روم‘ باغ...... غرضیکہ ہر جگہ صوفوں کے نیچے‘ پلنگوں کے نیچے‘ الماریاں ہر جگہ کھنگال لیا وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی۔

❁......❁......❁

ادھر سونیا میں چھپی بدروح سیٹھ دولت کی حویلی سے نکل کر ماورائی قوت سے لڑتے ہوئے چند منٹوں میں موضع شاہ پور کے جنگل کے وسط میں واقع پرانے قلعے کے اندر واقع مندر کے بڑے ہال میں کالی دیوی کے پیکر بت کے پیروں میں بیٹھی بڑبڑاتے ہوئے کوئی منتر پڑھ رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے بدروح جھومتے جھومتے کالی دیوی کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس وقت اچانک کالی دیوی کے ہاتھ میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے بدروح کے سر پر ہاتھ پھیرا‘ بدروح اٹھ کر ادب سے کھڑی ہوگئی۔ بدروح کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھوں میں پانچوں بچوں کی لاشیں تھیں۔ اس وقت کالی دیوی کے منہ سے آواز نکلنے لگی۔

’’جاؤ جاکر اپنا انتقام پورا کرو‘ کالی طاقتیں تمہارے ساتھ روانہ کی جارہی ہیں۔‘‘

❁......❁......❁

لاکٹ کی حرکت سے بابا سمرقند ملتانی اپنے حجرے میں صورت حال سے آگاہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے موکلات کو انسپکٹر عمران کی مدد کے لیے روانہ کردیا۔

❁......❁......❁

صبح کا سورج طلوع ہوچکا تھا‘ سورج کی نارنجی کرنوں سے سیٹھ دولت کا باغ جگمگا اٹھا تھا‘ باغ کے درخت اور پھولدار پودے ہوا کے جھونکوں سے ہلکورے لے رہے تھے۔ سبزے پر شبنم موتیوں کی مانند جگمگا رہی تھی۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں کی سریلی آوازوں کا دلکش نغمہ سنائی دے رہا تھا‘ کچھ پالتو کبوتر بھی اڑتے ہوئے منظر کی خوب صورتی میں اضافہ کررہے تھے۔

فرزانہ صبح کی سیر کی بے حد شوقین تھی‘ وہ سیر کے ساتھ ورزش اور سوئمنگ بھی کیا کرتی تھی یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ فرزانہ مورنی کی چال چلتی ہوئی کبوتروں کی پرواز دیکھتی ہوئی تالاب کی طرف آنے لگی۔ تالاب کے کنارے ضرورت کی تمام اشیاء ایک الماری میں موجود تھیں جیسے ہی فرزانہ تالاب کی طرف بڑھتے ہوئے ایک گھنی جھاڑی کے پاس سے گزری اس کی سونیا جو اس کی

تاک میں تھی' جھاڑی کے عقب سے باہر نکلی اور دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگی۔

لیکن عین اسی وقت جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھتے انسپکٹر عمران نے بلی کو دیکھ کر زور سے لمبے فیتے کی مدد سے قرآنی لاکٹ گھمایا جس میں تیز دھار چھریاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک چھری بڑی ہوتی ہوئی بلی کے کان کو تھوڑا سا کاٹتے ہوئے گزر گئی' بلی نے چیخ کر رخ بدلا اور انسپکٹر عمران کو گھورنے لگی' اس کے کان سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بڑی بھیانک آواز میں منہ کھول کر غرائی جس میں دو بڑے نوکیلے خوفناک دانت دکھائی دے رہے تھے۔ فرزانہ چونک کر بلی اور انسپکٹر عمران کو دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھی اور ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپ کر تماشا دیکھنے لگی۔

بلی شیر کے برابر قد آور ہو کر انسپکٹر عمران پر جھپٹ رہی تھی اس کے منہ سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ انسپکٹر عمران بار بار لمبے فیتے کی مدد سے لاکٹ گھما رہا تھا۔ بلی آگے بڑھتی لیکن لاکٹ کی چھری کے کٹ لگنے سے پھر پیچھے چلی جاتی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا' وہ بڑی بھیانک اور خوفناک دکھائی دے رہی تھیں' فرزانہ درخت کے پیچھے چھپی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

خوفناک بدروح شیر کی جسامت میں ہونے کے باوجود اب زخمی ہو کر پیچھے ہٹ رہی تھی اس وقت باغ کی فضا میں کچھ سیاہ دھوئیں کے مرغولے سے اڑ اڑ کر کہیں سے آئے اور پھر سیاہ انسانی شکل کی خوفناک ماورائی وجود انسپکٹر عمران کی طرف بڑھنے لگے۔ بلی یہ دیکھ کر خوشی سے چلائی لیکن اسی وقت سبز رنگ کا ایک سیلاب سا باغ کی فضا میں آ گیا اور پھر سبز رنگ سے انسانی وجود منتشر ہو کے اڑتے ہوئے کالے خوفناک سایوں کے سامنے پہنچنے لگے' کچھ ہی دیر میں فضا میں خوفناک آوازوں اور چمکتی ہوئی بجلیوں کی روشنی کے ساتھ دونوں ماورائی وجودوں کا ٹکراؤ ہونے لگا۔ بالکل انسانوں کی طرح جسم ٹکرانے لگے' ان اور ٹانگیں بھی چلنے لگیں۔ دونوں وجودوں کے ٹکرانے سے بڑی بھیانک کڑک سی سنائی دینے لگی جس سے فرزانہ تو بے ہوش سی ہو گئی۔ انسپکٹر عمران بھی دم بخود رہ گیا' خوفناک بلی آنکھیں پھاڑے فضا میں سیاہ اور سبز ہیولوں کے ٹکراؤ کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت سبز قوت غالب آنے لگی' سیاہ وجود مار کھا کھا کر فضا میں الٹے سیدھے گرنے لگے پھر وہ دھوئیں میں تبدیل ہو گئے اور دھوئیں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے' کالی قوتوں کے جسم جھلسنے لگے اس وقت انسپکٹر عمران نے بھاگ کر خوفناک بدروح بلی پر حملہ کر دیا اور اسے مار مار کر تالاب کے کنارے لے آیا ایک شعاع پڑنے سے اس کی قوتیں ختم ہو گئی تھیں۔

انسپکٹر عمران نے چھریوں والا لاکٹ پوری قوت سے اس کے سینے میں اتار دیا وہ بھیانک چیخ مار کر پیچھے تالاب میں جا گری۔ کچھ دیر بعد سیاہ دولت اور اقبال انسپکٹر عمران کے پاس آ کے ان کے ہاتھ چوم رہے تھے۔

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور

جواب:۔ چہار قل شریف صبح و شام پڑھ کر دعا کریں۔

ص۔ ر۔ مرزا...... گجرات

جواب:۔ داخلہ کے لیے ابھی سے شروع کر دیجیے۔ جن کے بارے میں شک ہے "اللھم انا نجعلک فی نحور ھم ونعوذ بک من شرور ھم" پڑھیں (اے اللہ مجھے/ہمیں نجات دے) ان کی نحوست اور ہر فرض نماز کے بعد دعا سے پہلے ہاتھ اٹھائے بغیر 11 بار ہر فرد بھی پڑھ سکتا ہے۔

کرن...... ملتان

جواب:۔ سورۃ عبس بعد نماز عشا 3 مرتبہ روزانہ اپنے ہاتھوں پر دم کریں سر سمیت پورے جسم پر پھیر لیں۔ تیل پر بھی اور اسی طرح دم کریں۔ روزانہ سر پر لگائیں یہ آپ کے تمام جسمانی امراض کے لیے ہے۔ تعلیم کے لیے۔ جس میں دلچسپی ہے اسی میں وقت لگائیں ہر نماز کے بعد "یا فتاح" 11 مرتبہ پڑھیں۔ کامیابی کے لیے ہمیشہ۔

استخارہ آپ خود کریں۔ فیضان کے لیے والدہ سورۃ العصر پڑھیں۔ 1 تسبیح روزانہ اور دعا کریں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

زبیدہ خانم...... لاہور

جواب:۔ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار بعد فجر اول و آخر 3'3 بار درود شریف پڑھیں۔ رشتے کے لیے دعا کریں۔ عرصہ 3 ماہ۔

نسرین اختر...... میانوالی

جواب:۔ مسئلہ نمبر 1:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل اول و آخر 7'7 مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر دم کریں۔ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔ عشاء کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر اپنے اوپر اور شوہر کو تصور میں لا کر دم کریں۔ (دعا بھی کریں)۔

مسئلہ نمبر 2:۔ یا مذل دکان پر بیٹھ کر ایک تسبیح کر لیا کریں۔ یہ پریشانی نہیں ہوگی۔ پڑھتے وقت ان کا تصور رکھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نماز کی پابندی کریں ہر نماز کے بعد سورۃ قریش پڑھا کریں 21 مرتبہ برکت کے لیے۔ بیٹے کے لیے بھی دعا کریں۔

گرمیوں میں ٹھنڈی چیزیں استعمال کریں۔

رینا شاہد...... شورکوٹ شہر

جواب:۔ یا علیم 41 مرتبہ اول و آخر 3'3 مرتبہ درود شریف صبح نہار منہ پانی پر دم کر کے پلائیں اور پڑھنے بیٹھتے وقت 11 مرتبہ پڑھ لیا کریں۔

سدرہ...... شورکوٹ

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ یا فتاح پڑھا کریں۔

عائشہ رحمت علی...... گوجرانوالہ

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ والضحیٰ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت یہ تصور ہو کہ بھائی رابطہ کر رہا ہے۔ اس کا دل اور دماغ گھر کی طرف راغب ہو رہا ہے۔ پابندی سے پڑھیں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ان شاءاللہ

م س ن۔ پ۔ س...... کھڑیانوالہ

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی

کریں جلد اور اچھے رشتے کے لیے۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھیں۔ تصور یہ ہو کہ والدین سنجیدہ ہو رہے ہیں۔ گھر میں کوئی اثرات نہیں۔

س۔خ......خانیوال

جواب:۔ بہن بھی وہی وظیفہ پڑھیں رشتے کے لیے۔ 41 مرتبہ سورۃ العصر بھائی کے سرہانے کھڑے ہو کر پڑھیں جب وہ نیند میں ہو۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

نائلہ اعوان......منڈی بہاؤالدین

جواب:۔ مسئلہ نمبر1۔ سورہ الم نشرح ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

2:۔ شوگر، بلڈ پریشر اور بواسیر کے لیے مسواک پڑھی جاتی ہے آنچل کے ذریعے منگوا لیں۔ (نیم کی مسواک)۔

3:۔ سر پر تیل لگائیں۔

س۔م۔ک۔ن......فیصل آباد

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہو جائے۔

اعجاز علی......لاہور

جواب:۔ انسان کوشش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے اپنے حق میں بہتری کے لیے۔ استخارہ کریں۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر دعا کریں فوج میں شمولیت کے لیے۔

رضیہ......کمبوہ

جواب:۔ بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یٰسین اور 11 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھیں اول وآخر 3'3 بار درود ابراہیمی اپنے لیے دعا کریں۔

ام سالار......جہلم

جواب۔ آیت شفاء کا ورد رکھیں۔ ماہواری کے لیے حکیم صاحب سے رجوع کریں۔

م۔ش......سیالکوٹ

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اپنے دونوں مسئلوں کے لیے دعا کریں۔

http://facebook.com/elajbilquran
www.elajbilquran.com

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے جون 2014ء

نام...... والدہ کا نام...... گھر کا مکمل پتا......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں......

خوش سخن

عمر اسرار

دہشت گردی کے شکار، شہداء کے نام
نوخیز کھلتی معصوم کلیاں
جن کی خوشبو سے
چمن کو بھی مہکنا تھا
سادہ بھولی بھالی، الہڑ دوشیزائیں
جن کے ہاتھوں پہ مہندی کو رچنا تھا
بے بال و پر شاہین بچے
جنہیں آسمان کی وسعتوں کو کھوجنا تھا
لمحوں کے کھیل میں
معصوم کلیاں مسلی گئیں
خون رنگ آنچل
دوشیزاؤں کا نصیب بنے
شہ زور جوان
مرغ بسمل تڑپنے لگے
یہ
وہ مسلمان تھے
جو طلب علم کے حصول کے لئے
ہادی برحق کے
چراغ سے چراغ جلا رہے تھے
معصوم کلیوں کی مسکراہٹ
جھیل آنکھوں کے سپنے
نوجوانوں کی نارسائی
اے ستمگر یہ سوال کرتی ہیں
اے مالکِ ایوانِ اقتدار، یہ سوال کرتی ہیں
قیامت کس کو کہتے ہیں
کیا قیامت کو بھی آنا ہے
بکھرے بازو
برہنہ لاشیں
پائمال آنچل
اے لاشوں کے سوداگر یہ سوال کرتے ہیں
اے بےحمیت مسلمانوں یہ سوال کرتے ہیں
قیامت کس کو کہتے ہیں
کیا قیامت کو بھی آنا ہے

ریحانہ سعیدہ......لاہور

غزل

چھوڑ کے مجھ کو جدا ہو رہے ہو
کیوں مجھ کو آ کر دغا دے رہے ہو
بھٹک جائیں گے ہم تجھ بن اے ساجن
کس جرم کی ہمیں سزا دے رہے ہو
تیری خاطر ہوئے ہیں زمانے میں رسوا
وفا کو ہماری تم جفا دے رہے ہو
نا رہے گا تجھ بن نشاں بھی ہمارا
کیوں ہستی ہماری مٹا دے رہے ہو
نہیں چھوڑا جاتا ہم سفر کو سفر میں
کیوں زمانے کو کوئی اک ہوا دے رہے ہو
یہ آنکھیں ہیں عادی تمہیں دیکھنے کی
کیوں ان کو غم کی گھٹا دے رہے ہو
ریاض کا نہیں کوئی بھی جہاں میں
ہجر کی گلے میں تم گرہ دے رہے ہو

ریاض حسین شاہد......پاکپتن

غزل

تیری خموشی سے دہک اٹھتے ہیں شرارے
کاش کوئی پھر دیکھے آج آنسو ہمارے
غم اٹھائے تھے تیری وفا کے لیے ہم نے
مشکل لحات میں پھر کوئی یوں کس کو پکارے
تیری بے رخی کا برا نہیں مانتے ہم
تو لاکھ کرلے دل پہ ستم ہمارے

بلی تھیں دوریاں بھی قسمت میں
غم کے ماروں کو یوں پھر ملتے نہیں کنارے
کچھ لوگ سزا کے یوں منتظر ہیں جاوید
قسمت والوں کو پھر سے ملتے نہیں سہارے

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

خطا

یہ رت جگے یہ شام غم
میرے ہمنوا مجھے بتا
کیوں لکھ دیے میرے نام یہ
میری آنکھوں میں تیرے خواب تھے
میرے پیار کے جو چراغ تھے
کہاں چھپ گئے کیسے بجھ گئے
کوئی بات ہے،
کیا بات ہے؟
کیوں بھلا دیے سب عہد وہ
جو کیے تھے زلفوں کی چھاؤں میں
میرے گاؤں میں
کیوں پیار سے منہ موڑ کر
میرا غم سے ناتا جوڑ کر
ایسی کون سی ہے خطا میری
کیوں چل دیے مجھے چھوڑ کر

تمثیلہ لطیف...... جودھالہ

غزل

اک عمر جس کے حسن کا دل پر اثر رہا
وہ شخص میرے حال سے یوں بے خبر رہا
پاؤں برہنہ تھے مرے صحرا کی دھوپ تھی
عزم جواں کے ساتھ ہی محو سفر رہا
شوق جنوں میں منزل مقصود مل گئی
حاصل ہوا جو عمر بھر پیش نظر رہا
چہرہ چھپایا چاند نے بادل کی اوٹ میں
وہ حسن بے مثال جب تک بام پر رہا
شہروں میں آ کر خوف کی چادر لپیٹ لی
دشت بلا میں رہ کر بے خوف و خطر رہا
گزرے مشقتوں میں میری زندگی کے دن
کیوں نخل آرزو مرا یوں بے ثمر رہا
وہ قوم کو نہ دے سکا کچھ فائدہ قمر
ذاتی مفاد جس کے بھی پیش نظر رہا

ریاض حسین قمر...... منگلا

غزل

جب کچھ پاس تھا میرے سب ساتھ تھے مر
کچھ نہ رہا پاس تو سب یار بکھر
یہ انوکھے شجر و گل ہیں اس چمن میں ذرا
خزاں کی رت آئی تو جی بھر کے نکھر
دیکھے ہیں میں نے درویش ایسے بھی اس جہاں
ہوا حسن کا ایک ہی وار تو سب شکر و ذکر
کچھ تعجب نہیں کہ ہمسفر نے ہی دغا ہمسفر
دکھ ہے مگر کہ رائیگاں سب میرے سفر
اسلاف کی کچھ تو خوبیاں خود پر عیاں
روندے جن کے قدموں میں کفر کے بحر و بر
جو جھکا ظلم کے آگے تو پھر جھکتا ہی
اٹھایا جب سر کسی نے تبھی ظلم و جبر
ہمیں نہ دو الزام کہ تھے ہم بھی امن کے دا
پر ہوا جب پیٹھ پر وار تو سب امن و صبر
حالات کے ان اندھیروں کو دیکھوں تو لگے فار
شاید کہ روٹھ ہم سے یہ شمس و قمر

عمر فاروق ارشد...... فورٹ ع

ذوق آگہی

عفان احمد

حدیث نبوی ﷺ

شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ دانا اور زیرک شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لیے عمل کرے اور عاجز و درماندہ وہ ہے جو اپنی خواہشات کا غلام ہو لیکن اس کے باوجود اللہ سے اجر و ثواب و مغفرت کی آرزو رکھتا ہو۔ (ترمذی)

انتخاب: حسن اختر پریم...... ناظم آباد

کل اور آج

☆ پہلے اولاد والدین کا سہارا ہوتی تھی اب خسارہ ہوتی ہے۔

☆ پہلے محبوب کو شالا مار باغ دکھاتے تھے اب باغ دکھائے جاتے ہیں۔

☆ پہلے لڑکی کی صورت اور سیرت دیکھی جاتی تھی اب لڑکی کا جہیز۔

☆ پہلے انسان سے محبت کی جاتی تھی اب اس کی جیب سے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

داستان عبرت

اے انسان تو سمجھتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہے گا ایسا بھی نہیں ہو سکتا بلکہ دنیا میں جو آیا اسے بالآخر جانا ہوتا ہے اور ایسے ہی دنیا جلد ہی تمہارا نام بھی زندوں کی فہرست سے نکال کر مردوں کی فہرست میں درج کردے گی۔ والدین تمہاری جدائی میں بہت روئیں گے بالآخر مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے احباب، عزیز و اقارب تمہیں کچھ عرصہ یاد کر کے ہمیشہ کے لیے طاق نسیاں میں رکھ دیں گے تم پر مسرت مٹنے والی بیوی کچھ عرصہ یقیناً غمگین اور سوگوار رہے گی مگر چند روز کے بعد حالات کی سنگینی اور ماحول کی تبدیلیاں اسے روز مرہ کے مسائل میں الجھا دیں گی بچے جن پر تم واری صدقے ہوتے تھے اور وہ بھی آپ سے بہت محبت کرتے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کے ذہن سے بھی تمہارے نقش و نگار محو ہو جائیں گے۔ طوفان باد و باراں تمہاری قبر کی بلندی کو ہموار کر کے تمہارا نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے اور تم چند سال کے بعد ایک بھولے ہوئے خواب کی مانند ہو جاؤ گے۔

چند سال گزرنے کے بعد اس بات کا یقین کرنا مشکل اور ناممکن ہوگا کہ تم بھی دنیا میں آئے تھے اس لیے فکر دنیا چھوڑ کر آخرت کی تیاری کر جہاں ہمیشہ کی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

نادیہ جعفری...... لسبیلہ

نیند

نیند حق تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو جسم و جان کو دن بھر کی کلفت کے بعد راحت و آرام بخشنے کے علاوہ روزانہ انسان کے سامنے خمار موت، عذاب قبر اور حیات بعد ممات کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ خمار موت کی طرح انسان نیند کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بالکل الگ اور بے خبر ہو جاتا ہے عذاب قبر کی طرح خواب کے عالم میں بھی ہولناک واقعات کو دیکھ کر ڈر رہا ہوتا ہے حیات بعد ممات کی طرح جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے تو پھر اپنے آپ کو دنیائے عمل میں موجود پاتا ہے یا حالت سفر میں جب وہ ایک شہر سے گاڑی یا ہوائی جہاز میں سوار ہوتا ہے اور رات پڑ جانے کی وجہ سے سو کر جب صبح کو اٹھتا ہے تو اپنے آپ کو بالکل ایک نئی دنیا میں پاتا ہے۔

سونے کا ادب یہ ہے کہ ہر شخص سر شام اپنے بچوں کو گھر میں روک کے رکھے اور انہیں باہر نہ جانے

دے کہ اس وقت جنات اور شیاطین کا دور اور اثر و تقریب شروع ہوجاتا ہے اور چونکہ انہیں زیادہ نیند کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انہیں کھلا پلا کر سلا دیا جائے مگر خود سرِ شام نہ سو جائیں بلکہ نماز عشا کا اہتمام کریں۔ نماز عشاء سے فارغ ہونے کے بعد خوش گپیوں یا لہو لعب میں اپنا وقت ضائع نہ کریں بلکہ جلد سو جائیں تاکہ تہجد یا صبح کی نماز خراب نہ ہو۔ افضل یہ ہے کہ باوضو سوئیں اور سونے سے قبل محاسبہ کریں۔ توبہ، استغفار اور مسنون دعائیں پڑھیں اور یہ اپنی عادت میں داخل کرلیں تاکہ موت کے وقت اور موت کے بعد جی اٹھنے کے وقت بھی یہ عادتاً زبان پر جاری رہ سکیں۔

سحر خان......کوہاٹ

استاد کی تعظیم

۞ جن اقوام میں استاد کو احترام کا درجہ دیا جاتا ہے وہ اقوام عالم کی راہبری کرتی ہیں۔

۞ یہ مت دیکھو کہ کس استاد کے پاس شاگردوں کی بھیڑ زیادہ ہے بلکہ یہ پرکھو اس کے کامیاب طالب علم کتنے ہیں۔

۞ استاد کی تعظیم معاشرتی ترقی کا زیور ہے۔

۞ اچھا استاد نعمت خداوندی ہے۔

۞ وہی استاد معتبر ہے جو اپنے طالب علموں سے تحمل مزاج رہے۔

۞ اچھا شاگرد اپنے استاد کی لازوال تصنیف ہوتا ہے۔

مصر کے کاشتکاروں کا قصہ

ہارون الرشید کے لیے جب ملکِ مصر پورا فتح ہوگیا تو اس نے فرمایا: اس سرکش فرعون کے خلاف میں اس ملک کا حاکم اپنے کسی ذلیل ترین غلام کو بناؤں گا۔ چنانچہ ایک حبشی غلام خضیب نام کا تھا' ملک مصر اس کو بخش دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس غلام کی عقل اور سمجھ اتنی تھی کہ مصر کے کاشتکاروں کی ایک جماعت نے اس کے پاس شکایت کی کہ ہم نے دریائے نیل کے کنارے پر روئی بوئی تھی' بے وقت بارش ہونے سے برباد ہوگئی۔ اس نے کہا اون بودینی چاہیے تھی تاکہ وہ برباد نہ ہوتی۔ ایک اللہ والے نے بات سنی تو فرمایا: اگر روزی عقل سے بڑھتی تو دنیا میں بے وقوف سے زیادہ تنگ روزی والا کوئی نہ ہوتا' اللہ تعالیٰ بے وقوف کو ایسے طریقہ پر روزی پہنچاتا ہے کہ عقل منداس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

مرسلہ: ثریا شہزاد......گجرانوالہ

دو بھائیوں کا قصہ

ایک سردار کے دولڑکے مصر میں تھے۔ ایک نے علم حاصل کیا' دوسرے نے مال جمع کیا۔ آخر کار ایک بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرا بادشاہ ہوگیا۔ اس کے بعد یہ مال دار اپنے بھائی عالم کی طرف ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ میں سلطنت تک پہنچ گیا اور تو ویسے ہی عاجزی اور غربت میں رہا۔ اس عالم نے جواب دیا: اے بھائی! اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر مجھ پر تجھ سے زیادہ واجب ہے اس لیے کہ میں نے پیغمبروں کی میراث یعنی علم حاصل کیا اور تجھ کو فرعون اور ہامان کی میراث ملی یعنی ملک مصر کی بادشاہت۔

فائدہ: قناعت (تھوڑے پر مطمئن رہنا) بڑی نعمت ہے اسی کے ذریعہ غریب بھائی نے علم نبوت کی دولت حاصل کرلی تھی۔

مرسلہ: عبدالرشید......پشاور

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "وعرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔
"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا" آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیرِ نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

"ارجن!" جگت گرج اٹھا۔ "پانچ منٹ پورے ہونے کے بعد تو کسی کو اپنی آواز سنانے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ جلدی بتا! پولیس چوکی میں حاضر ہونے کی صورت میں مار پیٹ کرنے کا تو نے حکم دیا تھا؟" ارجن سنگھ نے سر جھکالیا۔ "مجھے تیری زبان سے سننا ہے۔ کمشنر صاحب کو بھی سننا ہے...... جلدی زبان کھول۔" جوش میں آکر جگت نے گالی بک دی۔ جگت نے دانتوں کے درمیان زبان دبا کر سرجن صاحب سے کہا۔ "گستاخی معاف کرنا! اگر وہ نہیں بولا تو اس صورت میں مجبوراً میرے پستول کو بولنا پڑے گا۔"

"ارجن سنگھ! تمہیں جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو۔" کمشنر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"صاحب!" ارجن سنگھ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے۔ میں قصوروار ہوں۔ جو کچھ ہوا وہ میرے ہی حکم پر ہوا ہے۔"

"لیکن اے بزدل شخص! تو نے تو مجھ سے راستے میں کچھ اور کہا تھا کہ اس میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں۔" کمشنر ولیم نے دانت پیس کر کہا۔

"جگت! اب پستول رکھ دو۔" ارجن نے جگا کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جگا نے پلٹ کر ایک لمحے کے لیے سرجن کی طرف دیکھا اور بولا۔

"نہیں صاحب! ابھی دیر ہے۔ آپ کو اس شخص کی خباثت کا اندازہ نہیں۔ ابھی کچھ دیر صبر کریں۔" جگت کے ہونٹوں پر خشک سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے کمشنر کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ صرف اتنا ہی سن کر اپنے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کم ظرفی سے گھبرا گئے' ابھی تو آپ کو بہت کچھ سننا ہے۔" ارجن سنگھ گھبرا گیا۔ وہ رحم طلب نظروں سے جگا کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو خدا کے لیے اسے مزید بے آبرو نہ کیا جائے۔

"سرجن صاحب! آپ پولیس چوکی پر دیر سے پہنچے اور اس کا سبب ایک خطرناک کیس تھا۔ ہے نا یہی بات؟" جگت نے دوبارہ سلسلہ کلام جاری رکھتے

ہوئے سرجن کی طرف دیکھا۔ سرجن کی آنکھیں جگت کی بات سن کر حیرت سے پھیل گئیں۔ جگت ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر پھر بولا ''یقیناً میری بات سن کر آپ کو تعجب ہوا ہوگا مگر یہ شخص جس کو آپ لوگوں نے چیف کا عہدہ دیا ہے کس حد تک نیچ ہے اس کا اگر ثبوت چاہئے تو خود اسی سے پوچھ لیں کہ ایک غنڈے نے اس کے حکم پر اپنے دوسرے ساتھی کو چاقو سے حملہ کرکے شدید زخمی کردیا تھا پھر پروگرام کے مطابق اسے اسپتال بھیج دیا تاکہ آپ کو عین وقت پر مصروف رکھا جاسکے۔ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو آپ خود اس کتے سے پوچھ لیں۔'' جگت کے الفاظ میں حقارت تھی۔

جگت کی بات سن کر سرجن کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور کمشنر کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ مگر کسی کے کچھ کہنے سے پہلے جگت کی آواز ایک بار پھر کمرے میں گونجی۔

''مجھے تسلیم ہے میں مجرم ہوں۔ آپ مجھے میرے جرائم کی فہرست بھی سنا سکتے ہیں مگر پولیس کی خاکی وردی پہن کر طاقت کے نشے میں قانون کے ساتھ غداری کرنے والے اپنے ان ظالموں کے ظلم اور جرائم کی کوئی سزا ہے آپ کے پاس؟'' ارجن سنگھ کی خاموشی اس بات کا کھلا ثبوت تھی کہ واقعی وہ مجرم ہے۔ جگت کے الفاظ نے اس پر جیسے سکتہ سا کردیا تھا۔ اچانک اس کے رخساروں پر موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

''ارجن! رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' کمشنر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ابھی اور اسی وقت ملازمت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ اپنی کمر سے بیلٹ اور پستول کھول کر مجھے دے دو۔''

جگت نے اطمینان کی سانس لی۔ اب اس کی انگلی ریوالور کے ٹرائیگر سے ہٹ چکی تھی۔ اس نے کمشنر کو مخاطب کیا۔

''صاحب! میرا پستول بھی اپنے پاس رکھ لیں۔''

کمشنر ولیم نے ایک ہاتھ سے ارجن اور دوسرے ہاتھ سے جگت کا پستول لے لیا۔ ''معاف کیجیے گا مجھے زبردستی کرنی پڑی۔'' جگت نے ہنس کر کہا۔ ''حالانکہ میرے پستول میں ایک بھی گولی نہیں تھی۔ آپ اسے کھول کر دیکھ لیں۔'' جگت کی بات سن کر کمرے میں موجود تینوں افراد چونک پڑے۔ جگت نے اپنے لباس سے چھ گولیاں نکال کر سرجن کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ ''لیجیے! میں نے آپ سے عہد کیا تھا اس لیے پستول خالی کردی۔'' جگت نے مسکرا کر کہا' پھر ارجن سنگھ کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''ایسے بزدل دشمن کے لیے بھرے ہوئے پستول کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

ارجن سنگھ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا جیسے اس کے جسم میں خون نہ ہو۔ سرجن جگت کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''جگا! اب مجھے یہ بتاؤ کہ یہ پستول تم تک کیسے پہنچا؟'' کمشنر نے سوال کیا۔ ان کے ذہن میں کافی دیر سے یہ سوال گردش کررہا تھا۔

''صاحب! آپ پھر قانون کا جال پھیلا رہے ہیں۔'' جگت نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جو لوگ ہنومان کو آزاد کراسکتے ہیں کیا وہ مجھ تک پستول نہیں پہنچا سکتے؟''

جگت کی بات سن کر کمشنر کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے' جنہیں دیکھ کر جگت نے کہا۔ ''آپ یہی بات جاننا چاہتے ہیں کہ پستول کہاں سے آیا؟''

کمشنر نے اثبات میں سر ہلایا۔ جگت نے بستر پر بیٹھ کر عقب والی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات بہت آسان تھی۔ جگت کی بات سن کر وہ تینوں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

''آنے والا مجھے فرار کرانا چاہتا تھا مگر میں سرجن صاحب سے عہد کرچکا تھا۔'' جگت مسکرا کر بولا۔

''پھر پستول اپنے پاس رکھنے کا جرم تم نے کیوں کیا؟'' کمشنر نے پوچھا۔

''آپ مجھے پھر میرے جرائم گنوانے لگے ہیں صاحب! میں فرار ہونا نہیں چاہتا تھا تو میں نے اپنے پاس پستول کیوں رکھ لیا؟ آپ مجھ سے یہی پوچھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو صاف صاف بتادوں کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ پولیس نے ہنومان کو بھی نہ بخشا ہوگا اور اس پر ظلم وستم کی انتہا کردی ہوگی۔ اگر آپ اس کی موت کی خبر لاتے تو اس صورت میں ارجن سنگھ یہاں سے زندہ نہ لوٹتا۔'' جگت نے کہا۔ ''مگر تمہارا پستول تو خالی تھا۔'' کمشنر نے برجستہ نہایت ذہانت سے سوال کیا۔

''یہ صحیح ہے۔'' جگت نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے آپ کے اس قدر جلد لوٹنے کی توقع ہرگز نہیں تھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ممکن ہے عارضی طور پر اس شخص کی زندگی بچ جاتی لیکن دوسری بار جب یہ میرے پاس آتا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔''

ایسی بے لاگ اور سچی گفتگو سن کر ولیم جگا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ جگا کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ راز آج ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جگا ڈاکو لوگوں میں کیوں مقبول ہے؟ کیونکہ وہ عہد کرکے کبھی اس سے منحرف نہیں ہوتا چاہے اس طرح اس کی زندگی ہی کیوں نہ خطرے میں پڑ جائے۔ چند لمحے کے لیے کمشنر اپنے عہدے کو بھول گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر جگا سے ہاتھ ملایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری سچائی کی قدر کرتا ہوں نوجوان۔''

''شکریہ......!'' جگا نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

کمشنر باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھے' پھر دروازے کے قریب پہنچ کر وہ اچانک رکے جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ مڑ کر دوبارہ جگا کے بستر کے قریب آ گئے۔

''مگر ویرو کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟''

جگا سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے چہرے پر فکر کی پرچھائیں سی نظر آئیں۔ ''میں سمجھتا ہوں وہ عدالت میں پیش ہوگی۔'' اس نے جواب دیا پھر اپنے گلے کے تعویذ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''دیکھئے کہیں آپ کے پولیس چیف نے اس کے خلاف بھی کوئی سازش نہ کی ہو اور آپ اس کی سلامتی کا یقین دلائیں تو اس صورت میں......''

''میں اس کی سلامتی کا یقین دلاتا ہوں۔ میں خود اسے لے کر آؤں گا۔'' کمشنر نے جگا کی بات کاٹ کر اسے یقین دلایا۔ جگا کمشنر کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔

''نہیں صاحب! آپ کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ پر مکمل یقین اور بھروسہ ہے۔''

کمشنر ہنس دیا اور پھر وہ کچھ بولے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے ارجن سنگھ بھی گردن جھکائے باہر نکل گیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے گردن گھما کر جگت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں توہین کے انتقام کی چنگاری سلگ رہی تھی۔

❀......❀......❀

بچن سنگھ ساتھیوں کے ساتھ رات کو جنگل والے اڈے پر واپس آیا۔ اس وقت ہنومان نیم بے ہوشی میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کی گرم پیشانی پر بھیگا ہوا

کپڑا بار بار رکھا جا رہا تھا۔ کرپال سنگھ کے ہاتھ بچن سنگھ کو دیکھ کر تھم گئے۔ ہوشیار سنگھ ہنومان کے چہرے پر کوئی دوا لگا رہا تھا۔

"کیوں بچن! خالی ہاتھ؟" کرپال سنگھ کی آواز سن کر ہوشیار چونکا اور ہنومان کی آنکھیں تھوڑی سی کھل گئیں۔ وہ بخار میں ہذیان بک رہا تھا۔ "جگت آ گیا؟ بچن اسے لے کر آیا؟"

مگر بچن کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ جگت نہیں آیا۔ یا پھر وہ لا نہیں سکا۔ بچن نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔ "ہنومان کی حالت کیسی ہے؟ مجھے راستے میں اطلاع ملی کہ تم لوگ بڑی صفائی سے اسے چھڑا لائے ہو۔" بچن نے ہنومان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور چونک گیا۔ "ارے اس کی پیشانی تو جل رہی ہے۔"

ہنومان بے ہوشی میں بڑبڑایا۔ "جگت! تم آ گئے؟ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ کتے' سالے! نالائق!" یہ کہتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے بچن کا ہاتھ تھام لیا۔ "جگت! تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا ناراض ہو؟"

"میں بچن ہوں ہنومان!" بچن نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جگت نہیں آیا۔ شاید وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

کرپال اور ہوشیار سن ہو گئے۔ بے ہوشی میں بھی ہنومان جیسے لرز کر رہ گیا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے کپکپاتے ہاتھ کی مٹھیاں کس گئیں۔

"کیا ان کتوں نے اسے ختم......"

"نہیں' نہیں ہنومان! جگت اچھا خاصا ہے۔ مگر میں اسے لا نہیں سکا۔"

"کیا پولیس کا انتظام بہت سخت تھا۔ جس کے سبب تم ناکام رہے؟" کرپال نے پوچھا۔

بچن کو اس سوال سے ہتک محسوس ہوئی مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ شیخوپورہ سے چلتے ہی تمام راستے بل کھاتا رہا تھا۔ جگت کو اسپتال سے فرار کرانا مشکل اور خطرناک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کام اس نے اپنے ذمے لیا تھا۔ کرپال اور ہوشیار نے اپنی طرف سے ہنومان اور جگت کو پولیس کے قبضے سے چھڑانے کے لیے بچن سے ہاتھ ملائے تھے تو بچن کو بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی ممکن ہے اس بہانے پرانے ساتھی پھر آپس میں ایک ہو جائیں۔ یہ ایسا ہی موقع تھا' اس نے خان ڈوگرا پولیس اسٹیشن سے ہنومان کو چھڑانے کے لیے ہوشیار اور کرپال کو مقرر کیا تھا اور خود اس نے جگت کو چھڑانے کی ذمے داری اپنے سر لی تھی۔ دونوں گروہوں کو تقریباً ایک ہی وقت میں چھاپہ مارنے کا کام کرنا تھا چاہے دو چار آدمی زخمی ہو جائیں یا جان سے چلے جائیں' انہیں بہرحال پولیس کو ایک بار بتا دینا تھا کہ ڈاکوؤں سے بے ایمانی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟ مگر بچن کو قوت آزمانے کا موقع نہیں مل سکا۔ کرپال نے سوال کر کے اس کی مایوسی کو چھیڑ دیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہ کر غصیلے لہجے میں بولا۔

"میں پولیس کے انتظامات کو خاک میں ملانے کے لیے اپنی جان تک کی پروا نہ کرتا مگر اس سے پہلے میرے دل کو ایک عورت کے آنسوؤں نے پگھلا دیا۔"

"عورت؟" کرپال' ویرو کے متعلق کہہ رہا تھا' بچن سمجھ گیا۔ اسے کرپال کی اس بات سے اختلاف تھا کیونکہ وہ بات سننے سے پہلے مداخلت کر دیتا تھا۔

"کرپال! میں چندن کور کی بات کر رہا ہوں۔ بھابی کو پہلی بار دیکھا' کیسے حالات میں ملاقات ہوئی؟" بچن دوپہر کے واقعات کو ذہن میں ترتیب دیتا ہوا بولا۔ "ہمارے پچیس آدمی بھیس بدل کر سرکاری اسپتال کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ میں اسپتال کے دروازے کی نگرانی کرتا ہوا ہوٹل میں بیٹھا

ہوا تھا اور موقع ملنے پر اندر داخل ہونے کے چکر میں تھا۔ چاروں جانب مسلح پولیس گھوم رہی تھی۔ کچھ سادہ لباس والے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسپتال کے پیچھے اپنا ایک ساتھی گھوڑا لیے تیار کھڑا تھا۔ پولیس کمشنر اور انسپکٹر اندر گئے ہوئے تھے ان سب کے باہر نکل جانے کے بعد میرا ارادہ آگے قدم بڑھانے کا تھا۔ اپنا ساتھی لکھی سنگھ کسی مریض کی عیادت کے بہانے اندر چکر لگا آیا تھا۔ اس نے آ کر مجھے اندر کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد میں نے جگت کے فرار کی ترکیب سوچ لی۔" بچن سنگھ چپ ہو گیا۔ کیونکہ ہنومان بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔

"پولیس کمشنر اور انسپکٹر جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے تو میں کھڑا ہونے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسی لمحے دو پولیس والے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ کسی کو شک نہ گزرے اسی لیے میں نے چائے منگوالی اور اخبار کے پیچھے منہ چھپا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ابتدا میں کوئی مطلب کی بات نہیں ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وقت ضائع کر رہا ہوں۔ چائے کی رکابی ہونٹوں پر رکھ کر پہلا گھونٹ گلے سے اتارا تو مطلب کی بات سنائی دی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اسے پھانسی ہو گی۔" ایک سپاہی نے زور دے کر کہا۔

دوسرا اسے ڈانٹ کر بولا۔ "اسے اسپتال میں رکھا گیا ہے۔ یہ بات ہم لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر اسے پھانسی نہیں ہو گی ورنہ وہ خود پولیس کے سپرد کیوں ہوتا؟"

"تم ابھی بچے ہو یار! پولیس کا کام شکاری جیسا ہوتا ہے۔ چالاک جانور گولی سے نہیں مرتا تو اس صورت میں جال پھیلا کر قابو میں کیا جاتا ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وہ زندہ رہا ہے یہ اس کی عورت کا نصیب ہے۔ نہیں تو اسپتال کی بجائے شمشان میں ہوتا۔" درمیان میں چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کچھ الفاظ دب جاتے تھے۔ میں اس وقت چونک پڑا جب ایک سپاہی نے کہا۔

"اس کی عورت کو تم نے دیکھا ہے کیسی جوان ہے۔ میری تو حالت خراب ہونے لگی۔" پھر وہ آگے بولا۔ "اس عمر میں بیچاری بیوہ ہو جائے گی۔" اسی لمحے دوسرے نے کہا۔

"دیکھو...... وہ باہر آ رہی ہے۔"

میں چونک پڑا۔ اسپتال کے دروازے سے ایک عورت باہر نکل رہی تھی۔ چائے تھوڑی باقی تھی اسے چھوڑ کر میں نے کاؤنٹر پر پیسے چکائے اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ بھابی کے موڑ پر جانے کے بعد میں نے تیزی سے قدم بڑھا دیئے۔ دل دھڑک رہا تھا جگت کی بیوی سے ملنے کی جلدی کے ساتھ دل میں یہ ڈر بھی تھا کہ کیا وہ مجھے پہچان لیں گی؟ میری بات سنیں گی؟ انجانے آدمی سے بات کریں گی؟ دوسری جانب پولیس کا خطرہ تھا۔ چندن کور پر خفیہ پولیس کی نظر رہے گی۔ کوئی ضرور ان کی حرکات نوٹ کر رہا ہو گا۔ پھر میں انجانا شخص ان سے بات کروں تو اس صورت میں پولیس کی نظروں میں آ جانا لازمی تھا۔ پولیس کو یہ شک ضرور ہو گا کہ جگت کو فرار کرایا جائے گا یا جگت خود فرار ہونے کی کوشش کرے گا ورنہ اتنے سخت انتظام کی ضرورت نہیں تھی۔ میری قمیص کے نیچے چھ بور کا پستول تھا۔ پولیس کو شک نہ ہو اس لیے ایک چونی دے کر ایک دکان سے ٹوکرا خریدا تا کہ بغل میں ٹوکرا دبا دیکھ کر لوگ مجھے مزدور سمجھیں۔ چندن بھابی نے سبزی مارکیٹ کے قریب چال سست کر لی۔ میں سوچ رہا تھا وہ خریداری کے لیے جا رہی ہیں لہٰذا میرے بھی قدم سست پڑنے لگے۔ اسی لمحے

کسی کی آواز سنائی دی۔ ''اے ٹوکرے والے!'' میں بھڑک گیا۔ گردن گھما کر دیکھا۔ آواز دینے والا سپاہی نہیں تھا بلکہ وہ کوئی بیوپاری دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس زمین پر کپڑے کا چھوٹا سا بنڈل رکھا ہوا تھا۔ وہ بنڈل کی جانب اشارہ کرکے بولا۔ ''اسے اٹھا کر ساتھ چلو! دو پیسے ملیں گے۔'' یہ عجیب سی کشمکش والی بات تھی۔ مزدور کی اداکاری ضروری تھی۔ نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر میں نے کہا۔ ''دو پیسے میں اتنا وزن؟ سیٹھ تم خود ہی اٹھالو پیسے بچیں گے۔''

اسے غصہ آگیا' ''میرے بیٹے! کرتے ہو مزدوری اور مزاج نوابوں کا ہے۔'' جی چاہا اسے چانٹا ماردوں مگر ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ گیا۔ چندن بھابی فروٹ والے کی دکان پر کھڑی ہوکر پھلوں کے بھاؤ پوچھنے لگیں۔ ان سے کچھ دور شانے پر ٹوکرا رکھ کر میں کھڑا ہوگیا مارکیٹ کے دو مزدور میری جانب کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں کہہ رہی تھیں یہ باہر کا آدمی اپنی روزی چھیننے کے لیے کہاں سے آگیا؟ آنکھیں پھیلا کر مجھے ڈرانے والے انداز میں ایک مزدور میری جانب بڑھا۔ جھگڑا ہونے کا امکان تھا مگر اس نازک موقع پر قوت آزمانا درست نہیں تھا۔ چندن کور کی جانب اشارہ کرکے میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ان کے ساتھ ہوں۔'' دکاندار پھل تول رہا تھا۔ میں نے ٹوکرا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ڈال دو!'' چندن کور چونک پڑیں۔ ''مجھے مزدور کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔ بڑی نازک صورت تھی۔ میں نے ہمت کرکے کہا۔ ''میں مزدور نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پہچانا بھابی؟'' وہ غور سے میری صورت دیکھنے لگیں۔ الجھن مزید بڑھ رہی تھی۔ میں نے مزید کہا۔ 'مجھے بھول گئیں؟ میں ہنومان کا بھائی بچن ہوں۔''

آخری الفاظ میں نے سرگوشی میں ادا کیے تھے۔ شا[illegible] بچن کے نام سے وہ مجھے پہچان نہ سکیں لہٰذا ہنومان کا نام استعمال کیا۔ ان الفاظ کا فوری اثر ہوا۔ وہ مجھے پہچان گئیں مگر میں انہیں الجھن میں دیکھ رہا تھا' کیونکہ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے اثرات ابھر آئے تھے۔ دکاندار سے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے انہوں نے جلدی سے پھل تلوائے' مجھے بھی اپنا کام جلدی نمٹانا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اسپتال تک پھل پہنچادوں گا۔'' پھر مزید کہا۔

''میرے بھائی کی طبیعت کیسی ہے؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہیں۔'' مجھے اطمینان ہوگیا۔

''ڈاکٹر نے خوراک کے لیے منع کیا ہے اس لیے پھل لینے آئی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ دوسرے پھل دیکھتے ہوئے بولیں۔ 'مگر آپ......؟'' جواب دینے سے پیشتر میں نے دکاندار کی جانب دیکھا۔

''ارے بھائی! اتنے بہت سارے پھل لیے' پھر کیا ٹوکری نہیں دو گے؟'' میں نے کہا۔ وہ منہ بگاڑ کر ٹوکری تلاش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں چندن بھابی سے میں نے کہا۔ ''میں تین گھنٹے سے چکر لگا رہا ہوں۔ میرے ساتھ بیس آدمی ہیں۔'' چندن بھابی کچھ بوکھلا گئیں۔ ان کے چہرے پر خوف جھلکنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہیں۔ اس دوران ٹوکری میں پھل رکھ کر اپنے سر پر اٹھاتے ہوئے میں نے چندن بھابی کی جانب دیکھا۔ 'چلیے......اب ہم چلیں۔''

ہجوم سے باہر نکلتے ہی ہم اسپتال کی جانب بڑھنے لگے۔ ''یہ ٹوکری رکھنے کے بہانے میں اندر آتا ہوں۔ سب تیاری مکمل ہے۔ کسی کو اطلاع ہونے سے پیشتر ہم انہیں نکال لے جائیں گے۔'' میں نے بھابھی سے کہا۔ ان کے قدم رک گئے۔ میرے سامنے انہوں نے درد بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کی لرزتی ہوئی

پلکوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی رو دیں گی۔''

''کیوں لے جا رہے ہو انہیں؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''وہ لوگ انہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ہم لوگ اس طرح سرگوشیاں کر رہے تھے کہ کسی کو شک نہ گزرے۔

''ظلم سے وہ بچ گئے مگر قانون کے ہاتھ انہیں پھانسی کے پھندے تک دھکیل دیں گے بھابی! انہیں پھنسانے کے لیے یہ جال بچھایا گیا ہے۔'' مگر ان کا جواب سن کر میں سن ہوگیا۔ میری جانب دیکھے بغیر وہ بولیں۔

''وہ زندہ رہے' یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے بچھائے ہوئے جال کو اوپر والا آسانی سے کاٹ دیتا ہے۔ سوال انسان کے تجربے یا بہادری کا نہیں بلکہ قدرت کی دی ہوئی زندگی کا ہے بچن بھائی۔'' بھابھی کی آواز بھاری تھی۔ راستہ کٹ رکا تھا۔ بحث کرنے کا موقع نہیں تھا پھر بھی مجھے کہنا پڑا۔ ''بھابھی! ایسی زندگی سے کیا فائدہ؟ آدمی زندہ تو رہے مگر ساری زندگی جیل میں گزارنی پڑے۔ وہ کچھ خاموش رہیں' پھر ایک گلی میں مڑتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ ''زندگی کا کیا کرنا چاہیے اس کا فیصلہ زندگی دینے والے پر چھوڑ دیں۔'' بھابھی نے کہا۔ ان کے لہجے میں التجا تھی۔ ''کیا ہم خالی ہاتھ واپس لوٹ جائیں؟'' میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔ میرے اس سوال پر ان کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرنے لگیں۔ ''آج پہلی بار ہم گھر کے لوگوں کو سکھ کی امید بندھی ہے۔ پانچ سات سال بعد وہ گھر آئیں گے اس خیال سے ہمارے دل ٹھنڈے ہوگئے ہیں۔ یہ سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں تو آپ انہیں لے جاسکتے ہیں۔'' بھابھی کی آواز میں عاجزی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے

میرے جسم سے کسی نے ساری طاقت چھین لی ہو۔ جگت میری خاطر راچلا کو اس کے شوہر سے چھین کر اغوا کرنے گیا تھا تو اس نے بھی جگت کو خالی ہاتھ لوٹا دیا تھا۔ اب میرے پاس صرف ایک راستہ تھا اس سے پہلے کہ گلی ختم ہو جائے اور اسپتال نظر آنے لگے۔ مجھے وہ کام کرنا تھا۔ ''آپ آگے بڑھیں' میں ٹوکرے کی ڈوری مضبوط باندھ کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ وہ آگے بڑھنے لگیں۔ میں نے ایک کونے میں جاکر ٹوکرا کھولا' لباس کے نیچے چھپا ہوا پستول پھلوں کے درمیان رکھ دیا' پھر اوپر کچھ پھل رکھ کر ڈوری مضبوط کسنے کے بعد جلدی سے ٹوکرا سر پر اٹھا کر ان کے ساتھ ہوگیا۔ ''اب آخری بات...... آپ ایک بار انہیں اطلاع دے دیں کہ ہم یہاں آچکے ہیں۔ اس کا جواب ملنے کے بعد میں چپ چاپ لوٹ جاؤں گا۔'' پھر مزید کہا۔ ''ان پھلوں میں ایک چیز میں نے رکھ دی ہے۔ ان سے کہنا سنبھال لیں۔'' میں نے بھابھی کو سمجھایا۔ بھابھی نے انکار کرنا چاہا مگر میں نے انہیں روک دیا۔ ''اب زیادہ گفتگو کریں گی تو سادہ لباس والوں کو شک ہو جائے گا اور میں گھیر لیا جاؤں گا۔ میرے پاس حفاظت کے لیے بھی اب کچھ نہیں ہے۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ اسپتال کے دروازے پر بھابھی نے ٹوکرا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ''تم ٹھہرو! میں کھلے پیسے لے کر آتی ہوں۔'' انہوں نے کہا اور تیز قدموں سے اندر چلی گئیں۔ گیٹ پر موجود دو سادہ لباس والے مجھے کن اکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں بڑبڑایا۔ ''یہاں تک بوجھ لانے کے صرف اتنے پیسے اور اس کے لیے وقت ضائع کرنا۔'' ان چند لمحوں میں بہت سی نظریں مجھے گھیرنے لگیں۔ پولیس کے درمیان میں اکیلا اور غیر مسلح تھا۔ دو تین ساتھی دور کھڑے ہوئے دیکھ رہے

تھے شاید وہ میرے اشارے کے انتظار میں چوکنے کھڑے ہوئے تھے کسی بھی لمحے صورت حال بگڑ سکتی تھی۔ مگر چندن بھابھی ہانپتی ہوئی میرے پاس آئیں اور میری ہتھیلی پر دو بڑے پیسے رکھ کر بولیں۔

''جا خوش ہوجا' ایک کی بجائے دو پیسے دیئے ہیں۔'' جا'' لفظ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر مسرت جھلک رہی تھی اور وہی لفظ میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ پھر بھی میں نے مسکرا کر اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر دعا دی۔ ''بھگوان تمہارے مریض کو جلد اچھا کروے بہن!'' بس پھر میں چلا آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر' بوجھل قدموں سے چلتا ہوا۔'' بچن سے پوری تفصیل سن کر سب پر خاموشی مسلط ہوگئی۔ کرپال اور ہوشیار بچن کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ہنومان اب سوچکا تھا۔ کرپال خیالات سے چونک کر بولا۔

''مگر یہ بھی ممکن ہے کہ جگت پستول کا استعمال کر کے فرار ہوجائے۔''

بچن نے سرد آہ بھری۔ ''وہ فرار نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے پیر حرکت نہیں کرسکتے۔'' بچن نے جواب دیا۔

''پھر پستول کا کیا استعمال ہوگا؟'' ہوشیار نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' کرپال نے جواب دیا۔

بچن نے محسوس کیا کہ وہ دونوں مغرور ہوگئے ہیں۔ ان کے ساتھ میل ممکن نہیں۔ اس نے فوراً بات گھمائی۔ ''کرپال' ہوشیار! عین موقع پر آپ لوگوں نے ہمارا ساتھ دیا اس کے لیے اگر آپ لوگ برا نہ مانیں تو میں احسان مند ہوں۔ ہنومان بچ گیا' اس کے لیے ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔''

''مگر اب بھی اس کی جان کو خطرہ ہے۔'' کرپال نے کہا۔

''اسے میں دیکھ لوں گا۔ صبح تک کسی ڈاکٹر کو پکڑ لاؤں گا۔ دوا لگوا لوں گا۔'' بچن نے نرم لہجے میں...

کرپال اور ہوشیار کے جانے کے بعد بچن سو... جگت واپس لوٹ آتا تو ممکن تھا سب ایک ہو جا...

❀......❀......❀

دوسرے دن شیخوپورہ کی عدالت میں نا نا... کو پیش کیا تو پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ... نے ویرو کی درخواست کو غور سے پڑھنے کے بعد ... کے کٹہرے میں کھڑی ہوئی ویرو کی جانب دیکھا ... ویرو نے سر جھکا لیا۔

''بہن! کیا یہ درخواست تم نے پڑھی ہے؟''

''نہیں صاحب! میں نے لکھائی ہے۔''

''انگریزی میں لکھوائی ہے؟''

''جی ہاں حضور آپ جلدی سمجھ سکیں اس لیے۔''

مجسٹریٹ کو عورت چالاک نظر آئی پھر بھی ا... نے یقین کرنے کی خاطر سوال کیا۔ ''یہ درخوا... نے اپنی خوشی سے لکھوائی ہے؟ یا پھر کسی نے تمہار... ساتھ زبردستی کی ہے اور تم سے دستخط کرائے ہیں؟''

''حضور! جو کچھ لکھا ہے' میری مرضی کے مطاب... ہے۔'' ویرو کو کرپچن ڈاکٹر نے سمجھا دیا تھا کہ عدا... میں مختصر جواب دینے چاہئیں۔ مجسٹریٹ نے ... حال میں درخواست پڑھ کر سنانے کا حکم دیا۔ کارکن ... درخواست کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے لگا۔

شوہر کے ظلم سے تنگ آ کر گھر چھوڑ گئی تھی ... ایسا نہ ہوتا تو یقیناً خودکشی کر لیتی۔'' عدالت میں ... لوگ گہری نظروں سے ویرو کو دیکھنے لگے۔ مگر ان کے لیے مزید حیرت آگے موجود تھی۔

''حضور والا کے گرد مزید یہ عرض کرتی ہوں ... میں اپنی مرضی سے ڈاکوؤں کے ساتھ رہی ہوں ... انہوں نے میرے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا مگر میر... گھر میں شریف کہے جانے والے میرے ر...

...وں نے مجھ پر ظلم کیا۔''

اس لمحے ویرو نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے ...لیا۔ عدالت میں ہلکا سا شور بلند ہوا۔ مجسٹریٹ نے ...ی کا ہتھوڑا میز پر مار کر آرڈر۔ آرڈر کہا اور ہال میں ...ناٹا پھیل گیا۔

''مجھے حضور والا سے کہنا ہے کہ گھر چھوڑ کر جانے ...ڈاکوؤں کے ساتھ رہنے کی سزا دینا چاہیں تو مجھے ...لاف نہیں مگر اس وقت تک پولیس اور میرے شوہر ...دخل اندازی سے میری حفاظت کی جائے۔''

مجسٹریٹ الجھن میں پڑ گئے۔ ایسا عجیب کیس ...کے پاس پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے شام ...تک کسی فیصلے پر پہنچنے کی خاطر ویرو کے شوہر اور پولیس ...پارٹمنٹ کے نمائندے کو عدالت میں حاضر ہونے ...کا حکم دیا۔ ویرو کے باپ کو بھی بلایا گیا۔ ویرو شام تک ...الت کی بنچ پر بیٹھی رہی۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے مقدمہ تیار ...نے کے لیے مہلت مانگی گئی۔ لہٰذا مجسٹریٹ نے ...رو کو ایک مہر زر کی ضمانت پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ...ہن سنگھ اور ویرو کے باپ کے سر جھک گئے۔ ایک ...یل نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''ویرو کا شوہر ضمانت دینا ...چاہتا ہے۔'' ویرو چونکی۔ اس نے کن انکھیوں سے ...اپنے شوہر کی جانب دیکھا پھر بولی۔

''حضور والا! میں اپنے شوہر کیساتھ جانا نہیں ...چاہتی۔''

''ضمانت پر چھوٹنے کے بعد تم جہاں جی چاہے ...جاسکتی ہو مگر جب کیس شروع ہو' عدالت میں حاضر ...کرنے کی ذمہ داری ضمانت دینے والے پر ہوگی۔''

ویرو سوچ میں ڈوب گئی۔ موہن سنگھ نے اپنے ...وکیل کے کان میں کچھ کہا۔

''صاحب! خاتون اپنے والد کے گھر جاسکتی ہیں۔'' مجسٹریٹ نے ویرو کی سمت دیکھا۔ ویرو اپنے باپ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ اپنے باپ کی آنکھوں سے اس کے ذہن کو پڑھنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ کچھ دیر سوچ کر بولی۔

''حضور! مجھے منظور ہے۔ میں اپنے والد کے گھر جانے کو راضی ہوں۔''

بیس دن بعد عدالت میں ویرو حاضر ہوئی۔ اس کے خلاف کوئی مقدمہ تیار نہیں کیا گیا تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ نے کہا کہ ویرو کا ڈاکوؤں کے ساتھ جرم میں شراکت کے متعلق ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ موہن سنگھ نے عدالت سے کہا۔ ''جو عورت ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر خراب ہوچکی ہے اس کی پرچھائیں بھی میں اپنے گھر میں پسند نہیں کرتا۔''

مجسٹریٹ کو موہن سنگھ کی بات پر تعجب ہوا پھر اس نے اپنی بیوی کو ضمانت پر رہا کیوں کرایا؟ ویرو بھی شوہر کی اس عجیب سی بات پر الجھن میں پڑ گئی۔ عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔

''ویرو پر کسی قسم کا جرم نہیں ہے۔ لہٰذا وہ آزاد ہے اور جہاں چاہے جاسکتی ہے۔''

ویرو کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی' جہاں مجھے جانا ہے وہاں کون جانے دے گا؟ باپ نے ان بیس دنوں کے درمیان طعنے دے دے کر اس کا ذہن الٹ دیا تھا۔ اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک جیل' دوسرا گھر' مگر جیل کے دروازے نہیں کھلے اور جگت کے گھر کے دروازے؟ فی الحال تو وہ بھی بند تھے جب تک کہ جگت آزاد نہ کر دیا جائے۔

❀......❀......❀

پولیس چیف ارجن سنگھ کو برطرف کرنے سے پیشتر چھٹی پر بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ مضبوط ہاتھ پیر والے پٹھان دلاور خان کا تقرر کیا گیا۔ لمبا قد' بھرا ہوا

جسم اور بڑی بڑی آنکھوں والا دلاور خان پولیس کمشنر کا خاص آدمی تھا۔ توڑ پھوڑ کر کے انڈر گراؤنڈ چلے جانے والے انقلابیوں کو کچلنے کے سلسلے میں دلاور خان نے اہم کردار ادا کیا گیا۔ بھگت سنگھ کو پھانسی دینے کے بعد انقلابیوں کی مہم سرد ہوگئی تھی۔ اسی لیے کمشنر صاحب کی مہربانی سے دلاور خان کو شیخوپورہ کے پولیس چیف کا عہدہ ملا۔ جس جس پولیس چوکی میں جگت پر ظلم کیے گئے ان چوکیوں کے صوبیداروں کے عہدے کم کر دیئے گئے۔ ان کا تبادلہ چھوٹے دیہاتوں میں کردیا گیا۔ ایک دن کے قیام کے دوران یہ سب کام نمٹانے کے بعد لاہور واپس لوٹتے ہوئے کمشنر ولیم' سرجن صاحب کے ساتھ رات گئے تک بیٹھے رہے۔ جگت کے ماضی سے واقف ہونے کے بعد اس علاقے سے کمشنر کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''پھر بھی سرجن! اس کے نام پر جو قتل وغارت 'ڈاکے اور لوٹ مار ہوئی ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔'' وہسکی کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پولیس کمشنر نے کہا۔ ''چار چھ دن میں عدالت میں کیس داخل کرنا ضروری ہے۔''

سرجن صاحب تشدد کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا تشدد کے ذریعے کسی شخص کو راہ راست پر نہیں لایا جاسکتا۔ غیر قانونی تشدد کرنے والے مجرموں پر انصاف کے نام پر تشدد کرنے کا طریقہ انہیں اچھا محسوس نہیں ہوا۔ سگار کے دھویں کو ہوا میں منتشر کرتے ہوئے وہ کمشنر کی جانب دیکھنے لگے۔

''قانون ہاتھ میں لینے والا مجرم جب قانون کے جال میں پھنس جاتا ہے تو اس سے انتقام لیا جاتا ہے۔ یہ بات ہم بہت عرصے سے محسوس کررہے ہیں۔'' سرجن نے کہا۔

''مگر مجرم کو سزا نہ ملے تو ہر شخص جرم کی جانب راغب ہوجائے گا۔ یہ آپ کیوں بھول ر[...] سرجن؟'' کمشنر نے مسکرا کر کہا۔

''سزا پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' سر[...] بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر سزا [...] انسان کو راہ راست پر آجانا چاہیے۔ تشد[...] باندھنے والے انسان کو اچھا شہری بنانا انصاف[...] والوں کا فرض ہوتا ہے۔ اس بات کو آپ [...] کریں گے کمشنر صاحب۔''

''صرف میرے قبول کرنے سے سب [...] نہیں سکتا۔ یہ میں سمجھ رہا ہوں۔ اگر آپ [...] پڑتے تو اس صورت میں خطرناک جگا [...] پولیس کے ہاتھ کبھی نہ آتا۔ پولیس نے اس [...] جو برتاؤ کیا ہے' وہ غلط تھا لیکن......'' سرجن [...] بات غور سے سن رہے تھے۔ ''لیکن'' کے الفاظ [...] رک گئے۔ سرجن نے کمشنر کو تیز نظروں سے [...] کچھ نہیں بولے۔

''ہمیں تو اب اسے انصاف کے حوا[...] ہوگا۔ اس کے خلاف قتل کے چار مقدمات در[...] انہیں نہیں بھلایا جاسکتا۔''

سرجن کی بھویں تن گئیں۔ ہونٹوں کے [...] دبا ہوا سگار گرنے کی حد تک لٹکنے لگا۔ اس لی[...] سرجن نے جلدی سے ایش ٹرے میں جھاڑی [...] پولیس ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے دلائی گئی [...] دہانی؟ کیس کمزور کر کے سزا دلانے کی ضمانت [...] ہوگا؟ میرے درمیان میں آنے کا مطلب کیا [...] سرجن صاحب نے کہا۔

''بس یہی غلط ہوگیا ہے۔'' اپنے گلاس میں [...] انڈیلتے ہوئے کمشنر کہنے لگا۔ ''ارجن سنگھ دراصل [...] نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو کسی بہانے اپنے را[...] کا کانٹا دور کرنا تھا۔''

ارجن سنگھ کا ذکر کر کے ہمیں آج کی شام [...] غارت نہیں کرنا چاہیے۔'' سرجن نے برا سا [...]ا کر کہا۔

[...]پھر مجھے عدالت کی کارروائی میں دخل دینا ہوگا۔'' [...] بڑایا۔

[...]میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے مگر میں آپ سے [...]ل کا طالب ہوں۔'' اب سرجن خاص نکتے [...]کیا۔ ''مجھے یہ انصاف قانون کی کتابوں سے نہیں [...] ایک انسان کے دل سے چاہیے۔'' کمشنر اس [...]ت دوست ڈاکٹر کی باتیں سننے لگا۔ ''آپ کی [...] نے بہادری کا مظاہرہ کر کے جگا کو گرفتار کیا [...]تو رحم کا سوال ہی نہیں تھا مگر وہ خود آپ کے پاس [...] اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جانے ابھی اس کے ہاتھوں [...] لوگ مرتے اور اسے گرفتار کرنے کے چکر میں [...] کے کتنے آدمی اپنی جانیں گنواتے؟ ان سب [...]وں سے ہم بچ گئے۔ اس کے بدلے میں اسے [...]ہا ہی صحیح انصاف ہوگا۔''

[...]لیم صاحب نے اوپر تلے تین گھونٹ حلق کے نیچے [...] لیے۔ ''تمہاری تمثیلیات میرے دل کو لگتی ہے۔ کل [...]ال میں ہاتھ میں پستول ہونے کے باوجود اس [...] کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے [...] وہ دلیر جوان ہے۔'' کمشنر نے جواب دیا پھر سر ہلا [...] بولا۔ ''نہیں نہیں...... قانون کو اس طرح جامد نہیں [...]ا چاہیے۔'' سرجن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''عدالت [...] کیس چلنے دو۔ میں گورنر صاحب کو اس سلسلے میں [...] بتاؤں گا۔ اگلے ماہ ان سے ملاقات ہوگی۔'' کمشنر [...] مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا اور کھڑا ہوگیا۔

''ویری کائنڈ آف یو کمشنر......'' سرجن نے ولیم [...] مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضور والا! گورنر کی [...]مت میں میری طرف سے بھی عرض کیجیے گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ کی بات ٹھکرائیں گے نہیں۔'' کمشنر مسکرادیا۔

اس کے بعد کمشنر باہر کی جانب بڑھا۔ سرجن اسے گیٹ تک چھوڑنے گئے۔ دونوں نے ایک بار پھر گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ انجن کے شور کیساتھ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور پھر دوڑنے لگی۔ سرجن جاتی ہوئی جیپ کی سرخ بتی کو دیکھنے لگے مگر شاید دونوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ قدرت کے کھیل تیار ہوتے ہیں اور یہ ان کی آخری ملاقات ہے......!

❀......❀......❀

عدالت میں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ باہر بھی اژدہام تھا۔ مسلح پولیس کا سخت پہرہ لگا ہوا تھا۔ صرف شیخوپورہ کے ہی نہیں بلکہ اطراف کے دیہاتوں سے بھی لوگ جگا ڈاکو کو دیکھنے آئے تھے۔ ''جگا ڈاکو پولیس کے حوالے ہوا ہے۔'' یہ خبر اخبارات میں شہ سرخیوں میں چھپی تھی۔ اس خبر سے پورے پنجاب میں ہلچل مچ گئی۔ بہت سے لوگ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ زمینداروں' ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی کوئی چال ہے کیونکہ اس کی پارٹی اب بھی ڈاکے ڈال رہی تھی۔ جگا کسی وجہ کے بغیر اکیلا اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کرنے سے رہا۔ جگا ڈاکو کا نام احترام سے لینے والے لوگ بھی اس واقعے کو پراسرار سمجھ رہے تھے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ بہت سے لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ویرو نے اس کا ذہن پلٹ دیا ہے۔ کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا جگا اپنے شاگردوں سے لڑ کر پولیس کے حوالے ہوا ہے۔ پولیس اس سے تنگ ہوگئی تھی لہٰذا اسے معافی کا بہانہ کر کے اپنے جال میں پھنسالیا۔ باقی کیس وغیرہ سب دکھاوا ہے۔

عدالت کے ہال میں داخلے کے لیے خاص اجازت لینی ضروری تھی۔ جن لوگوں کا کیس سے کوئی

تعلق نہ تھا وہ بھی اس ہال میں نظر آ رہے تھے۔ بہت ساری عورتیں بھی ہال میں موجود تھیں۔ عدالت میں عورتوں کی اتنی بڑی حاضری کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہر آنکھ میں تجسس جھلک رہا تھا۔ دیکھیے جگا کیسا دکھائی دیتا ہے؟ ہر دل میں جگا کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ سیکڑوں آنکھیں پھیل گئیں جب پولیس وین میں سے ایک جوان پیروں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود کودا۔ بیڑیوں کی کھنکھناہٹ سے ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ ہر زبان پر ایک ہی لفظ تھا...... ''جگا''

سب کے ذہنوں میں ڈاکو کی جو تصویر تھی۔ اس کے مطابق جگا کو بھرے ہوئے قد اور خوفناک چہرے، سرخ آنکھوں اور بڑی بڑی مونچھوں والا خوفناک انسان ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو اس سے مختلف حسین اور نوعمر لڑکا تھا۔ کیا اس نے سارے پنجاب کو دہلایا تھا۔ پولیس کو جس نے دو سال تک ناکوں چنے چبوائے تھے' یہ وہی جگا ڈاکو ہے؟ ہر ذہن یہی سوچ رہا تھا۔ مگر اس کے متعلق جو کچھ سنا تھا' اسے دیکھ کر سچ دکھائی دینے لگا۔ کتنی شرافت ہے اس کی رفتار میں' معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ سب کو کیسا دیکھ رہا ہے؟ اسے مسلح پولیس کی پروا نہیں۔ نہ عدالت میں ہونے والی سزا کا خوف ہے۔

نیا پولیس چیف دلاور خان وین کے اگلے دروازے سے باہر آیا۔ جگت ان کے عقب میں عدالت کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ بیڑیاں ایک مخصوص آہنگ کے ساتھ بجنے لگیں۔

جگت کو جاتے دیکھ کر بچن کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے منہ سے آہ نکلی۔ ہتھکڑی اور بیڑی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جگت کو دیکھ کر اس کا خون گرم ہو گیا۔ ''اس دن اگر چندن بھابھی درمیان میں نہ آ جاتیں تو اپنے دوست کا یہ حال نہ ہونے دیتا۔ کسے پتہ اب وہ کب ان زنجیروں سے چھٹکارا پائے گا؟ نہیں نہیں' یہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔'' وہ سر ہلا کر بڑبڑایا۔ ''میں موقع ملنے پر اسے ہتھکڑی اور بیڑی سمیت اٹھا لے جاؤں گا۔ اگر نہیں مانے گا تو بے ہوش کر کے لے جاؤں گا۔ چاہے کوئی مداخلت کرے' مجھے اس کی پروا نہیں۔'' بچن کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

عدالت میں ہلکا سا شور بلند ہوا اور خاموشی چھا گئی۔ بڑے گھر کی عورتیں جگا کو دیکھ کر ایک دوسرے سے دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''ارے یہ تو بالکل نوجوان ہے۔ کیا اس نے قتل کیے ہوں گے؟ دن دیہاڑے ڈاکے ڈال کر ساہوکاروں کی تجوریاں خالی کرنے والا یہی جگا ہے؟''

مجسٹریٹ' ہال میں داخل ہوا۔ سب نے کھڑے ہو کر اس کا احترام کیا۔ بھری ہوئی عدالت میں ایک نظر ڈال کر اس کی نظریں مجرم پر جم گئیں۔ وہ بھی آج صبح سے ایسے خطرناک مجرم کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ جگت اس کی جانب دیکھ کر صرف مسکرا دیا۔ اس نے نہ تو سلام کیا' نہ ہی اپنا سر جھکایا۔ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے جگت نے پہلی بار عدالت میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ پہلی بنچ پر نانا' بابو' ماما ہزارہ کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ مگر دوسری جانب ویرو کے شوہر موہن سنگھ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ موہن سنگھ نے سر جھکا لیا۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ الزامات پڑھ کر سنائے جانے لگے۔

''جگت سنگھ عرف جگا ڈاکو ولد سوہن سنگھ قوم جاٹ رہائش رتیا گاؤں عمر بائیس سال۔ تین سال پہلے پڑوس میں رہائش پذیر موہن کے بھائی کو قتل کر کے فرار ہو گیا اور زور آور سنگھ کا نقلی نام اختیار کر کے فوج میں شامل ہوا۔ رائفل کی ٹریننگ حاصل کر کے تین فوجی ساتھیوں کے ساتھ فوجی جیپ میں فرار ہوا۔

اپنے گاؤں آ کر آدھی رات کو گہرے اندھیرے میں چھت پر سوئے ہوئے موہن سنگھ کے دو بھائیوں اور بھتیجے کو گولی مار دی۔ اس کے بعد باقاعدہ قانون شکنی کی راہ اختیار کر لی۔''

سب لوگ غور سے ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھ جگت کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات تلاش کر رہی تھی مگر انہیں جگت کے چہرے پر بے پروائی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان سب باتوں کے لیے تیار ہو کر کٹہرے میں کھڑا ہوا تھا۔ پرسکون اور بے پروا۔ پھر سرکاری وکیل نے اس کے ڈاکوں کا حوالہ دینا شروع کیا۔ اس کے ڈالے ہوئے ڈاکوں کی تفصیل بتانی شروع کی اور لٹے ہوئے مال کی رقم بتائی جانے لگی۔ پولیس کے ساتھ جھڑپوں کی تفصیل بتائی گئی اور پولیس کے مطابق اس کے ہاتھوں کیے گئے قتل کی تفصیل بتائی گئی تو اس وقت جگت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جگا کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ کٹہرے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ سوالیہ نظروں سے اس نے وکیل صفائی کی جانب دیکھا۔ اسے نظر سے ہی جواب دیا گیا۔ ''مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے بعد جگت نے پہلے کی طرح چہرے پر بے پروائی طاری کر لی۔

اس کے بعد ثبوت پیش کرنے کے لیے مہلت مانگی گئی۔ وکیل صفائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مجسٹریٹ نے ایک ہفتے کی تاریخ دی۔ کٹہرے سے ہٹ کر باہر جانے سے پہلے جگت نے نانا کی جانب ایک بار دیکھا۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ نانا جگت سے آنکھیں چار نہ کر سکے۔

عدالت سے نانا سیدھے سرکاری اسپتال پہنچے۔ سرجن سے ملاقات کے لیے انہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ جگت کو تو جیل میں رکھا جا رہا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ آئیں گے۔ کیا عدالت میں کیس شروع ہو گیا؟'' سرجن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ انہوں نے نانا کا سرخ چہرہ دیکھ لیا تھا پھر بھی بے پروائی کے اظہار کے طور پر سگار جلانے لگے۔

''صاحب! انہوں نے سب الزامات جگت کے سر رکھے ہیں۔'' نانا ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے مگر وہ زیادہ دیر ضبط نہ کر سکے۔ ''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ پولیس ڈبل چال چل رہی ہے۔ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر وہ اپنا کام کر گزریں گے۔''

''آپ جگت پر لگائے ہوئے الزامات سن کر مشتعل ہو گئے ہیں شاید۔'' سرجن سگار کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولے۔ ''مگر اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نانا نے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''مطلب یہ کہ تمہارے نواسے کے کارنامے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ پولیس آفس میں اور اخبارات کے صفحوں پر اس کے علاوہ لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے جرائم کو اس طرح چھپانا ممکن نہیں ہو سکتا۔'' سرجن نے انہیں سمجھایا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب...... جب پولیس یہ الزامات لگا چکی ہے تو سزا کیسے کم ہو گی؟''

''الزام لگانا تو آسان ہے مگر انہیں ثابت کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے پھر گواہوں کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ قانون اندازوں کو نہیں مانتا بلکہ اسے ثبوت چاہئیں۔''

پھر بھی نانا خاموش رہے۔ انہیں اس بات سے تسلی نہیں ہوئی۔ سرجن نے مزید کہا۔ ''ہمارے وکیل

کومخالف پارٹی کے کمزور پوائنٹ حاصل کر کے صفائی پیش کرنا ضروری ہے۔"

"اس کے باوجود پولیس کے پاس طاقت' دولت اور اثر سب کچھ ہے۔ شاید فیصلہ ہمارے خلاف ہو جائے۔" نانا جملہ پورا نہیں کر سکے اور ان کا جسم انجانے خوف سے لرز گیا۔

"اس کے لیے انتظام کیا جا چکا ہے۔" سرجن نے کہا۔ پھر ارد گرد نظریں گھما کر بولے۔ "بات دل میں رکھنا...... پولیس کمشنر بذات خود گورنر صاحب کو اس سلسلے میں سمجھائیں گے پھر کیس اتنی حد تک آگے نہیں بڑھے گا۔" سرجن کے آخری الفاظ پر نانا کی تسلی ہوگئی۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میری تو جان نکل گئی تھی۔" نانا کے بوڑھے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایسی سنجیدہ بات میں اس طرح کی جلد بازی ٹھیک نہیں۔ ہفتہ باقی ہے۔ میری یہ آخری کوشش ہوگی۔ چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان کی بازی ہی کیوں لگا دینی پڑے۔"

دوسری بار جگت عدالت کے کٹہرے میں حاضر ہوا۔ آج بھی ہجوم تھا۔ ہر طرف سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ نامعلوم آج کیا ہوگا؟ جگت کے نانا اور بابو بھی آئے تھے۔ ویرو کا شوہر بھی حاضر تھا۔ وہی اس کیس کا اہم گواہ تھا۔ مجسٹریٹ کے ہال میں داخل ہونے سے پیشتر دلاور خان سرکاری وکیل سے گفتگو کر رہا تھا پھر کچھ دیر بعد مجسٹریٹ آ گیا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر فائل کھولی' پھر اس کی نظریں عدالت کے ہال کا جائزہ لینے لگیں۔ اس نے مجرم کی جانب دیکھا مگر جگت کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر دکھائی نہ دیا۔ کارروائی شروع ہوگئی۔ سرکاری وکیل نے گواہوں کے نام لیے۔ موہن سنگھ' سابق پولیس چیف سنہا 'ارجن سنگھ' رتیا گاؤں کا صوبیدار اس کے علاوہ کچھ انجانے نام لیے گئے۔

"پندرہ بیس منٹ بعد جگت کو سمجھا دینا وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے پولیس ڈیپارٹمنٹ کھٹک جائے۔ جو ہو رہا ہے اسے خاموشی سے دیکھتا رہے۔" سرجن نے نانا سے کہا۔ نانا سر ہلانے لگے۔

❁......❁......❁

"نہیں ہنومان...... یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میری جگہ تم ہوتے اور جگت کو اس حالت میں دیکھتے تو وہاں لاشیں بچھا دیتے۔" بچن انتہائی غصے میں کہہ رہا تھا۔

'ہنومان نے اسے جگت کو دیکھنے بھیجا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "ایک بار تم جگت کو دیکھ آؤ' میں تمہاری آنکھوں سے اسے دیکھنے کی تسکین حاصل کرلوں گا۔ کون جانے قسمت مین اسے دیکھنا لکھا بھی ہے یا نہیں؟"

بچن بپھرا ہوا واپس لوٹا اور ضد کرنے لگا۔ "میں اسے پولیس کے پنجے سے چھڑا کر ہی دم لوں گا۔"

"اس طرح جلد بازی نہ کرو بچن۔" ہنومان نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی کوئی حرکت نہ کرو جس کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پھنس جائیں۔ پولیس یہ سمجھ رہی ہوگی کہ جگت کے ساتھی اسے آزاد کرانے کی بھرپور کوشش کریں گے اس لیے ظاہر ہے انہوں نے تمام انتظامات کیے ہوں گے۔ اور جگت کو اس صورت میں چھڑا کر لانا بچوں کا کھیل نہیں۔"

"تم مجھے اشتعال دلانا چھوڑو ہنومان' ایک بار میں بھی اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکا ہوں۔ چندن بھابی نے درمیان ہی سے مجھے واپس کر دیا۔ اب جگت دوسری بار عدالت سے سیدھا یہاں آئے گا۔

❁......❁......❁

ایک سپاہی ہانپتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ اس نے دلاور کے کان میں کچھ کہا۔ پولیس چیف فوراً چونک کر

سیدھا ہو گیا۔ سرکاری وکیل کو قریب بلا کر اس سے بھی دلاور نے کچھ کہا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہاں سے بات مجسٹریٹ کے کانوں تک پہنچی۔ وہ بھی چونک گیا۔

عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ کچھ انہونی بات ہوگئی ہے شاید۔ وکیل اور عدالت میں موجود لوگ ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" اندر اندر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ مجسٹریٹ نے میز پر لکڑی کا ہتھوڑا بجا کر "خاموش' خاموش" کی آواز لگائی۔ سب چپ ہو گئے۔ پھر مجسٹریٹ کی آواز سنائی دی۔

"آج عدالت کی کارروائی جاری نہ رہ سکے گی۔" پھر کچھ دیر رک کر بولا۔ "پنجاب کے پولیس کمشنر پر کسی نے بم پھینک کر ان کی جان لے لی۔"

"اوہ...... اوہ......" کی آوازیں ہال میں سنائی دیں۔ نانا کو اس اطلاع سے سخت دھچکا لگا۔ وکیل سے انہیں مزید معلومات ملیں۔

"کمشنر صاحب گورنر صاحب سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے کہ کسی انقلابی جوان نے ان پر گرنیڈ پھینکا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ وہ جوان فرار نہ ہو سکا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔" وکیل نے بتایا۔ یہ سن کر نانا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے کشتی ڈوب گئی ہے۔ جگت کو بچانے کے سلسلے میں جس کا سہارا تھا اب وہ سہارا ہی ختم ہو چکا تھا۔

جگت کو فوراً عدالت سے باہر لے جایا گیا۔ پولیس جیل لوٹنے سے پہلے اس نے ایک نام سنا۔ وہ یہ سن کر چونک پڑا۔ "پولیس کمشنر کو ہلاک کرنیوالا شخص گرد بخش سنگھ تھا۔" جگت پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور پھر جگت کی آنکھوں میں گرد بخش کا چہرہ گھوم گیا۔ گرد بخش سے جگت کی ملاقات فوج میں تربیت کے دوران ہوئی تھی۔ گرد بخش سنگھ سکھ رجمنٹ میں تھا۔ بھگت کے شاگرد نے آزادی کی جنگ جاری رکھی تھی۔ انقلابیوں کو کچلنے والے پولیس کمشنر سے اس نے انتقام لے لیا تھا۔ اچانک جگت کے ہونٹ ہلے۔

"شاباش گرد بخش!" مگر اسی کے ساتھ اسے اپنے تصور میں منہ پر سیاہ کپڑا بندھا ہوا اور پھانسی کے پھندے سے لٹکتا ہوا گرد بخش نظر آیا تو اس کے ہونٹوں سے سرد آہ نکل گئی۔ "بے چارہ گرد بخش......" وہ بڑبڑایا۔

لاہور کی شارع عام پر کار میں بیٹھ کر گورنر سے ملاقات کے لیے جانے والے پولیس کمشنر پر پھینکے گئے گرنیڈ نے صرف پنجاب میں ہی نہیں پورے ہندوستان میں ہلچل مچا دی۔ اس دھماکے نے بہت سے غلام ذہنوں کو چونکا دیا' وہیں کچھ ذہنوں میں گڑبڑ پیدا کر دی۔ جگت پر چلنے والا مقدمہ' بچن کا جگت کو چھڑانے کا پلان' جگت چھوٹ کر جلدی گھر آ جائے گا۔ اس کے گھر والوں کی یہ امیدیں اور ویرو کے دل میں مچلنے والے ارمان سب کچھ اس بم دھماکے سے لرز اٹھے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا۔

پولیس کمشنر ولیم کے قتل کی خبر نے سول سرجن کو کچھ گھنٹوں کے لیے ساکت کر دیا۔ دل کو مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے ایک اہم آپریشن ہاتھ میں لیا مگر مریض کے پیٹ کو چاک کرتے جیسے ہی انہوں نے دوسرے ہتھیاروں کی جانب ہاتھ بڑھائے ان کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ نرس اور ڈاکٹروں نے سرجن کو آپریشن ٹیبل پر کبھی اتنا نروس نہیں دیکھا تھا۔ اسسٹنٹ سرجن کے سپرد کیس کر کے وہ آپریشن روم سے باہر نکل گئے۔ بے چین دل سے وہ گھر لوٹ گئے۔ میز پر پڑی ہوئی ڈاک پر نظر گئی۔ تین چار لفافوں کے ساتھ ائرمیل والا لفافہ الگ نظر آ رہا تھا۔ آسٹریلیا میں تعلیم حاصل کرنے والے پوتے کا خط پڑھنے کی خوشی دل میں جاگی' مگر

پھر دل بھر آیا۔ وہ جس کرسی پر بیٹھے تھے اسی جگہ ایک ماہ پہلے ولیم نے ان کے ساتھ بیٹھ کر شام گزاری تھی۔ آخری ملاقات کی یاد تازہ ہوگئی۔ بحث اور دلیلیں یاد آ گئیں۔ دل اور بے چین ہوگیا۔ غم بھلانے کے لیے وہسکی پینے کی خواہش ہوئی مگر کمشنر کی موت کے احترام کے خیال سے انہوں نے اپنی خواہش دبا دی۔ دل بہلانے کے لیے آخر انہوں نے ڈاک پر توجہ مرکوز کی۔ لفافوں پر بھیجنے والوں کے نام پڑھ کر وہ کھڑے ہونا چاہتے تھے کہ اسی لمحے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ انہوں نے جلدی سے آخری والا لفافہ اٹھا کر غور سے دیکھا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہاتھ لرزنے لگے۔ بائیں طرف کے کونے پر لکھا تھا۔ "فرام جیک ولیم پولیس کمشنر پنجاب (لاہور) ایک جھٹکے کے ساتھ سر جن کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر الفاظ کی جانب دیکھتے رہے، پھر آہستہ سے لفافے کا کنارہ پھاڑ دیا۔ جلدی سے اندر کا خط نکالا، تہہ کھول کر اوپر کے حصے پر تاریخ دیکھی جو اگلے دن کی تھی۔ خط پڑھتے ہوئے ان کا دل دھڑکنے لگا۔

"پیارے اینڈرسن......" صاحب نہیں لکھتا کیونکہ یہ میرا خاص خط ہے۔ آخری ملاقات میں ہمارے تمہارے درمیان سے "صاحب" کا لفظ ہٹ گیا تھا وہ تو یاد ہوگا...... جدا ہونے کے بعد خط لکھنے کی کئی بار خواہش ابھری۔ دل میں خیالات کا طوفان زور کر رہا تھا، اسے ٹھنڈا ہونے کا مجھے انتظار کرنا تھا۔ خیالات کا دھارا تھم جائے اور ذہن پرسکون ہو جائے تو خط لکھنا بہتر تھا۔

پندرہ سال کی کارکردگی کے بعد پیچھے مڑ کر ماضی میں جھانکنے کی خواہش ہوئی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں پولیس کی تعلیم حاصل کر کے حکومت برطانیہ کی خدمت کے سلسلے میں ہندوستان آیا۔ تب میں جوشیلا نوجوان تھا۔ ہندوستان میں بڑھتے ہوئے جرائم کو ختم کر کے لوگوں کا دل جیت لینے کی آرزو دل میں تھی۔ میرے خیال میں انہی دنوں ایک ادھیڑ عمر کا شخص موہن داس کرم چند گاندھی مشرقی افریقہ سے وطن کی خدمت کرنے کے لیے ہندوستان آیا تو مجھے اس کے اصولوں پر ہنسی آئی تھی لیکن پندرہ سال بعد مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے، اتنے کم عرصے میں وہ اپنے ملک کا مہاتما گاندھی بن گیا اور میں اس ملک کے ایک صوبے کا معمولی سا پولیس کمشنر بن سکا۔ اسے اس کے ملک کے کروڑہا انسانوں کا پیار ملا مگر مجھے کیا ملا؟ حکومت برطانیہ کے خطابات، لوگوں کی ظاہری خوشامد اور باطن میں نفرت۔ شاید یہ پڑھ کر تمہیں ہنسی آئے گی کہ وہسکی پی کر یہ خط تحریر کر رہا ہوں مگر یہ اس کا اثر نہیں، تمہارے ساتھ اس شام کی بحث کے بعد میرے اصول جیسے انگڑائیاں لے کر میرے سامنے آ گئے ہیں مگر افسوس! گئی ہوئی جوانی انگڑائی لے کر واپس نہیں آئے گی اس لیے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے سنبھالنے کی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ آخری پانچ سالوں کی کارکردگی نے مجھے بڑے انعامات دلائے ہیں۔ اب وہ پانچ سال مجھ سے جواب طلب کر رہے ہیں۔ ملک میں حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کی جدوجہد کرنے والے ہر باغی کو میں نے اپنا دشمن مان لیا۔ میں انہیں کچلنے کے کام میں لگ گیا۔ اس میں کچھ ایسے نوجوان بھی تھے جن کی مسیں بھی ابھی نہیں بھیگی تھیں۔ ایک باغی آج بھی میرے ذہن کے دریچے میں موجود ہے جو سخت تشدد کے باوجود بھی نہیں مانا اس لیے اس کے لمبے بالوں کو باندھ کر اسے چھت سے لٹکا دیا گیا۔ اس کے جسم کا سارا بوجھ اس کے بالوں پر تھا۔ پھر نیچے آگ جلائی گئی، اس کی پشت پر ہنٹر مارے گئے مگر وہ آخر تک کہتا رہا۔ "انقلاب زندہ باد...... آزاد وطن زندہ باد۔" نہ اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے نہ ہی اس کا پتہ بتایا۔ اس بلکتے اور سسکتے ہوئے نوجوان کا آخری نعرہ بھی آزادی تھا۔

پولیس چیف ارجن سنگھ کی ہدایت پر جگا ڈاکو اور اس کے ساتھی پر جو مظالم ہوئے یہ سن کر میں نے اسے جنگلی کہا تھا مگر یہ خط پڑھ کر تمہارے ذہن میں بھی میرے لیے یہی لفظ آئے گا۔ میرا ضمیر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ اپنے ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں۔ وطن کی آزادی حاصل کرنے کے لیے موت کو گلے سے لگا رہے ہیں مگر انہیں کچل کر تو کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟ کچھ نئے القابات، اونچی کرسی یا اور کچھ؟ اپنے ضمیر کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کئی بار گورنر صاحب کے نام استعفیٰ لکھ کر میں پھاڑ چکا ہوں۔ پتہ نہیں کل جب میں ان سے ملنے جاؤں گا تو میرے کوٹ کی جیب میں استعفیٰ ہوگا بھی یا نہیں؟ اگر استعفیٰ نہ دوں تو سمجھ لینا کہ میں نے یہ سب کچھ جذبات میں ڈوب کر لکھا تھا۔ ہاں، تمہارے سپرد کیا ہوا کام ضرور کردوں گا۔ جگا نے اب تک درحقیقت کتنے قتل کیے ہیں؟ یہ میں نہیں جانتا، مگر فرض کے نام پر میں نے جو قتل کیے ہیں ان کا حساب شاید جگا سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ جگا کی سزا میں کمی کے وعدے کے بعد ہی میں گورنر صاحب کو اپنا استعفیٰ پیش کروں گا۔ آپ قطعی فکر نہ کریں۔ اگر استعفیٰ منظور ہوگیا تو کچھ دن کے لیے تمہارے ہاں آرام کی غرض سے آؤں گا، پھر میں وطن لوٹ جاؤں گا، مجھے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے۔

تمہارا ولیم۔"

خط پورا کرتے ہی سر جن کی آنکھیں برسنے لگیں۔ دوپہر سے رکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ ایک موڑ پر آ کر پولیس کمشنر کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ کمشنر کی موت سے سر جن کے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے خط تہہ کر کے میز کی دراز میں رکھ دیا پھر کچھ دیر بعد وہ ولیم کی بیوہ سے تعزیت کے سلسلے میں لاہور روانہ ہوگیا۔

❁......❁......❁

دوسرے دن نانا وکیل کو لے کر پولیس جیل میں جگت سے ملاقات کے لیے گئے۔ وکیل صفائی کو کیس کی تیاری کے سلسلے میں جگت سے ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔ دونوں کو ملاقات کے کمرے میں لے جایا گیا۔ چھوٹے سے کمرے کے درمیان دونوں دیواروں کے حصے کرتی ہوئی لوہے کی جالی تنی ہوئی تھی۔ لوہے کی جالی اس طرح لگی ہوئی تھی کہ ملاقاتی اور قیدی کے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ رہے۔ نانا کی نظریں جالی کے پار دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ جگت کچھ دیر بعد آ گیا۔

ہاتھ پیروں میں بھاری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں بازوؤں پر رسی کس کر باندھی گئی تھی جس کا سرا تھام کر ایک سنتری دروازے میں کھڑا ہوگیا۔ لوہے کی جالی پر دونوں ہاتھ رکھ کر جگت مسکراتا ہوا کھڑا رہا۔

"گھر پر سب ٹھیک تو ہیں؟" اس نے گھر کے حالات پوچھے، پھر گلے میں بندھے ہوئے تعویذ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "ماں کو ہمت دلانا، کہنا تمہارے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"یہی سوچ کر ہم نے ہمت کر لی ہے۔" نانا بولے۔ "مگر کمبخت گردبخش کو عین موقع پر بم پھینکنا سوجھا۔" جگت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر ان میں غصہ جھلکنے لگا۔

"نانا! اس کے خلاف بات کرنے کے لیے آپ کی زبان نے کیوں حرکت کی؟ سارا دیش اس کے

نام پر فخر کر رہا ہے۔"

"جگت! تمہیں پتہ ہے؟ کمشنر صاحب گورنر صاحب سے مل کر تمہارے لیے سفارش کرنے جا رہے تھے۔ اس وقت......"

"مجھے کچھ نہیں سننا نانا!" جگت نے منہ بنا کر کہا۔ "گرو بخش کے متعلق اگر کچھ کہنے آئے ہیں تو میں لوٹ جاتا ہوں۔" نانا حیرت سے جگت کو دیکھے جا رہے تھے۔

"مطلب یہ کہ تم ہمیں بولنے بھی نہیں دو گے؟" نانا غصے میں بولے۔ "ہم تمہارے بچاؤ کے لیے خون کا پانی کر رہے ہیں اور تم ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہو۔"

"آپ کو یہ بات ذرا سی لگتی ہوگی۔" جگت نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "مگر نانا! گرو بخش کے بھی آپ کی طرح ایک نانا ہیں۔ میری طرح اس کے بھی ماں باپ ہیں۔ مجھ سے صرف دو یا تین سال بڑا ہوگا۔" جگت رک گیا۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ "مگر میری طرح باپ دادا کی دشمنی کا انتقام لینے کے لیے وہ باغی نہیں ہوا بلکہ اپنے وطن کی آزادی کی خاطر برطانیہ جیسی عظیم حکومت سے ٹکر لی ہے۔ آپ یہ بات کیوں بھول رہے ہیں؟"

ایک خطرناک ڈاکو کی زبان سے ایسے الفاظ سن کر پولیس والا چونک گیا۔ اس نے رسی کے کنارے کو کھینچ کر کہا۔ "جگا آہستہ بول۔"

"اب دوسری باتیں چھوڑ کر ہم کام کی باتیں کریں۔" وکیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "صفائی کے لیے ہماری جانب دو مضبوط گواہ ہوں تو کام آسان ہو جائے گا۔"

جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ وکیل نے اسے سمجھایا۔ "موہن سنگھ کے تین بھائیوں اور بھتیجے کے قتل کا کیس خطرناک ہے۔ ان کی دشمنی مشہور ہو رہی ہے۔ پہلے بھی مار دھاڑ ہو چکی تھی۔ چاہے تمہارے ہاتھوں انہیں قتل ہوتے کسی نے دیکھا نہ ہو مگر حالات اور واقعات ہمارے خلاف جاتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں آپ ہی کوئی راہ نکالیں۔ قانون کی گتھیوں کے متعلق ہم بالکل انجان ہیں۔" جگت نے کہا۔

وکیل کو تعجب ہوا یہ شخص اتنا بے پروا اور پرسکون کیوں ہے؟ اس نے پھر دھیمے لہجے میں سمجھایا۔ "مثال کے طور پر پہلے قتل کے وقت تم گاؤں میں موجود نہیں تھے، تم اپنے نانا کے گھر جس وقت قتل ہوا اس لیے موہن سنگھ نے تمہاری عداوت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تم پر الزام تراشا۔ تمہیں پتہ چلا، تم مارے ڈر کے نانا کے گھر سے فرار ہو کر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ نانا بھی گواہی میں یہی کہیں گے۔" وکیل کہہ رہا تھا۔

جگت ہنس دیا۔ "واقعی بڑا اچھا پوائنٹ تلاش کیا ہے۔"

وکیل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "آہستہ بولو!" پھر وکیل نے کہا۔ "اب رہی دوسرے تین قتلوں کی بات۔ اس میں تم اکیلے نہیں تھے۔" وکیل آنکھ مار کر بولا۔ "تمہارے تین ساتھیوں نے قتل کیا تھا۔ ان کے نام لے دو۔ اس طرح صفائی مکمل ہو جائے گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" جگت نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

"مگر وہ تینوں تمہارے ساتھ تھے یہ بات سب جانتے ہیں۔ پولیس بھی جانتی ہے پھر نام لینے میں کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض ہے وکیل صاحب!" جگت نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جن لوگوں نے ساتھ دیا، میں ان پر الزام رکھ کر کس طرح فرار حاصل کر سکتا ہوں؟"

"مگر جگت! انہیں ان کے جرائم کی سزا ملنے کا فی

الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نانا نے اسے سمجھانا چاہا۔

"پھر بھی میں ان سے غداری نہیں کر سکتا۔" جگت نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

وکیل پریشان ہو گیا۔ "ایسا کرو گے تو تمہارا دفاع کس طرح ہو سکے گا؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں عمر قید یا پھانسی کا ڈر نہیں ہے۔" وکیل نے سخت لہجے میں کہا۔

'ایسا کہہ کر آپ مجھے پگھلا نہیں سکیں گے وکیل صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ میرے لیے کتنی محنت کر رہے ہیں پھر بھی زندہ رہنے کی خاطر بے ایمانی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟" نانا نے پوچھا۔

"آپ پولیس سے کہیں کہ انہوں نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کریں۔"

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ وکیل نے جاتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی جگت سنگھ! تم سوچنا شاید میری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔" وہ لوگ چلے گئے۔

گھر جا کر نانا نے داماد اور بیٹی پر اپنا غصہ اتارا۔ "اس لڑکے کا دماغ گھوم گیا ہے۔ اپنے مفاد کو نہیں سمجھتا اور ہر بات پر ضد کرنے لگتا ہے۔" چندن دھڑکتے ہوئے دل سے اندر والے کمرے میں باتیں سن رہی تھی۔ ان حالات میں گھر کے لوگ دھڑکتے دل سے دن گزار رہے تھے۔ سب کے سر پر فیصلے کی تلوار لٹک رہی تھی۔ نانا کو سب سے زیادہ بے چینی تھی کیونکہ ان کے ہی ایماء پر جگت نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا تھا۔

"کس بات کی ضد کر رہا ہے میرا جگت؟" ماں جی نے اپنے باپو سے پوچھا۔ نانا نے پوری تفصیل بتائی۔ گرو بخش کی بات بھی بتائی۔

"گرو بخش کا نام لیا تو وہ تقریر کرنے لگا۔" کچھ دیر مٹھیاں کستے ہوئے نانا ٹہلتے رہے۔

"صفائی کے لیے گواہ کھڑے کرنے ہیں۔ ابھی تک تو میں ایک ہی ہوں اور وکیل کہتا ہے کہ میں اس کا رشتے دار ہوں لہٰذا عدالت میری گواہی کو اتنا وزن نہیں دے گی۔ گواہی کے لیے رشتے دار نہیں تو کیا دشمن آئیں گے؟" نانا بڑبڑاتے ہوئے اچانک کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر اچانک مسرت جھلکنے لگی۔ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر دھیمے لہجے میں بولے۔ "مایا کور! ہماری ایک ایسی دشمن ہے جو ہماری طرف سے گواہی دینے آئے گی۔"

"کون؟" ماں جی اور سوہن سنگھ نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ویرو......!" نانا نے جواب دیا۔ ویرو...... جس کا نام لیتے ہوئے ہمیشہ نانا کو غصہ آ جاتا تھا اب وہ نام انہیں اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی بات سن کر سب چونک گئے۔

"ویرو؟" سوہن سنگھ نے کہا۔ "وہ کیا گواہی دے گی؟"

"گواہی کے متعلق تو اسے وکیل صاحب سمجھائیں گے۔" نانا پرمسرت لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "پہلے اس سے معلوم کر لو وہ عدالت میں گواہی دے گی؟"

نانا، ماں جی اور سوہن سنگھ کی نظریں چندن کور پر جم گئیں۔ ان کی بات کا اشارہ وہ سمجھ گئی۔ ابھی دو دن پہلے چندن نے ویرو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو اس کی ساس نے کہا تھا۔

"تمہارے سسر اور میرے باپو یہ پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نام سنتے ہی وہ گرم ہو جائیں گے۔ اور اس وقت وہ تینوں ویرو کے پاس جا کر گواہی دینے کے لیے سمجھانے کے سلسلے میں عاجزی کر رہے تھے۔

"بہو! تم ویرو کو سمجھا سکو گی۔ ایک چکر لگا آؤ۔" ماں جی نے کہا۔

"ان کے بھلے کے لیے مجھے جہاں بھی جانا

پڑے ضرور جاؤں گی۔ اسے سمجھاؤں گی ماں جی۔" چندن نے نظریں جھکا کر کہا۔ "کل صبح ہو آؤں گی۔"

"کل کیوں ...... آج ہی چلی جاؤ۔ ابھی دوپہر ہے۔ شام سے پہلے لوٹ آؤ گی۔" نانا جلد باز ہو رہے تھے۔ "ویسے بھی میں دھرم پور جا رہا ہوں' تمہیں چھوڑتا جاؤں گا۔"

"بہتر ......" کہتی ہوئی چندن باورچی خانے میں چلی گئی۔

❀......❀......❀

"ویرو بہن! آپ کے یہاں کوئی مہمان آئی ہیں۔" پڑوسی کی لڑکی نے باڑے میں آ کر کہا۔

اس وقت ویرو باڑے میں برتن صاف کر رہی تھی۔ فوراً ہاتھ دھو کر گھر میں آ گئی۔ چندن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرت رقص کرنے لگی۔

"آؤ چندن! آؤ بیٹھو۔" چندن نے اسے اپنا نام لیتے سن کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اس لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ویرو سمجھ گئی۔ یہ جان کر کہ کون آیا ہے' سارا گاؤں چونک اٹھے گا۔ "اری لڑکی! تو اب جا میرے سسر کی رشتہ دار آئی ہے۔ آرام سے گپ لگائیں گے۔"

ویرو کی ذہانت پر چندن خوش ہو گئی۔ اتنی دیر میں اس کے لیے چارپائی پر رضائی پھیلاتے ہوئے ویرو نے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ' بہت دن سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم ناراض ہو گی۔ نہیں تو صورت دکھانے ضرور آتیں۔"

"ویرو بہن! تم سے میں ناراض نہیں ہو سکتی۔" چندن نے ویرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ویرو پہلے سے زیادہ کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس نے پانی پی کر کہا۔ "سردار جی کو میں ڈانٹ پلاؤں گی۔ اتنا عرصہ ساتھ رکھا اور پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھلایا۔ دیکھو تو تم کتنی کمزور ہو رہی ہو۔" چندن نے ویرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ویرو نے محسوس کیا کہ چندن یہ الفاظ ایسے ہی ادا کر رہی تھی کیونکہ اس کی آواز میں طنز نہیں تھا۔ وہ ہنس دی۔ "ڈاکوؤں کے ساتھ کھانے کی کیا کمی؟ کمزور تو باپ کے گھر آ کر ہو گئی ہوں۔" ویرو کی مسکراہٹ کے پیچھے چندن کو اس کا دکھ جھلکتا نظر آیا۔

"میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں بہن! ہم عورتوں کا یہی مقدر ہے کہ دکھ جھیل کر سکھ پانے کے لیے تڑپنا۔" چندن کی آواز بھرا گئی۔ ویرو نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"میں تو اپنی کہانی سنانے بیٹھ گئی۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ جگت سنگھ کے کیا حال ہیں؟"

جواب دینے سے پیشتر چندن نے گھر میں چاروں طرف دیکھا۔ "کیا اور کوئی گھر میں نہیں ہے؟"

"نہیں ...... باپو کھیت پر گئے ہیں ...... چھوٹی بہن ماموں کے پاس رہتی ہے۔ کیونکہ میری بدنامی کی وجہ سے کوئی اس کا ہاتھ نہیں تھامتا۔ اس لیے ماموں نے رشتہ تلاش کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ رک گئی' پھر بولی۔ "مگر ان کے کیا حال ہیں؟"

چندن نے دیکھا ویرو کو جگت کے متعلق بڑی فکر تھی۔ "وہ ٹھیک ہیں۔ میں اسپتال میں ان کے ساتھ رہی مگر اب وہ جیل میں ہیں۔" چندن نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ تو کچھ دن کی بات ہے چندن۔" ویرو نے اس کی ہمت بندھائی۔ "فیصلہ ہونے کے بعد وہ گھر آ ہی جائیں گے۔"

"کسے معلوم؟" چندن نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تم ان کے متعلق بے چین ہو اسی طرح انہیں تمہاری فکر ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم اسپتال آؤ گی۔" چندن آگے کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔ ویرو نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ مگر اس نے جب نظریں اٹھائیں تو اسے

چندن کی آنکھوں میں یہی سوال نظر آیا۔ اس نے کہا۔

"عدالت نے مجھے رہا کیا۔ وہاں سے سیدھی خیریت معلوم کرنے کے لیے آنا چاہتی تھی مگر ......"

"مگر کیا؟" وہ چپ ہو گئی تو چندن نے سوال کیا۔

"تمہارے نانا نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟" یہ کہتے ہوئے ویرو رونے لگی۔

"نانا نے ایسا کہا؟" چندن بڑبڑائی۔ پھر دل میں سوچا۔ "اب میں اس سے کس منہ سے گواہی دینے کے لیے کہوں؟"

"کیا سوچ رہی ہو چندن؟" ویرو نے اس کے ذہن کو بیدار کیا۔ "نانا کی بات کا میں نے برا نہیں مانا۔ میری وجہ سے تمہارے گھر میں کافی جھگڑا ہوا۔ اب اس جھگڑے کو بڑھانا ٹھیک نہیں تھا۔" چندن کافی دیر تک خاموش رہی۔ ویرو اس کے لیے لسی لے آئی۔ "رات کا کھانا کھا کر ہی جاؤ گی۔" ویرو نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

"نہیں ویرو بہن!" لسی کے دو چار گھونٹ لے کر چندن نے کہا۔ "تمہارے باپو کے آنے سے پہلے ہی میں چلی جاؤں تو بہتر ہے۔ میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔ میں تمہارے پاس ایک کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔"

"میں پرائی ضرور ہوں مگر دشمن نہیں جو کچھ کہنا ہے بلا کھٹکے کہو چندن! کہیں غلطی ہو گئی ہو گی تو معافی مانگ لوں گی۔"

"نہیں بھئی! معافی کی کوئی بات نہیں۔" چندن نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہارے پاس کچھ مانگنے آئی ہوں۔"

"میرے پاس مانگنے والی بات نہیں' بلکہ مجھ سے تو بغیر پوچھے لے لینے کا تمہیں حق ہے۔" اب چندن کو اطمینان ہوا۔ "ویرو بہن! تم جانتی ہی ہو کہ عدالت میں ان پر تمہارے دیوروں کے قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ان کی صفائی کے لیے گواہوں کی ضرورت پڑے گی۔" چندن رک گئی۔ ویرو دھڑکتے دل سے سن رہی تھی۔ "نانا اور باپو کی گواہی کا وزن نہیں پڑے گا۔ تمہارے جیسی کوئی باہر کی ......"

"کیوں ہچکچا رہی ہو چندن!" ویرو نے کہا۔ "میں گواہی دینے ضرور آؤں گی۔"

"مگر تمہارے شوہر اور باپو وغیرہ ......"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ شوہر کا گھر چھوڑ چکی ہوں۔ ضرورت پڑنے پر باپ کا گھر بھی چھوڑ دوں گی۔" ویرو پرجوش لہجے میں بولی۔ "انہوں نے پہلا قتل میری وجہ سے کیا ہے۔" ویرو سسکیاں لے کر رونے لگی۔

چندن اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "بہن! میں سب کچھ جانتی ہوں۔" ویرو چونک پڑی۔ وہ آنکھیں خشک کرتی ہوئی چندن کو غور سے دیکھنے لگی۔ چندن نے پھر کہا۔ "ہاں ویرو بہن! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم دونوں کے درمیان کتنی محبت ہے وہ بھی میں جانتی ہوں۔" چندن کے الفاظ میں ٹھہراؤ تھا۔

ویرو لرز گئی۔ کیسی محبت ہے یہ جاننے کے باوجود چندن کے لہجے میں کسی قسم کی کڑواہٹ نہیں تھی جو بات اس کے دل میں مچل رہی تھی وہ ہونٹوں پر آ گئی۔ "چندن! اپنے شوہر کے ساتھ کوئی پرائی عورت بھاگے' اس کے ساتھ طویل عرصے رہے پھر بھی ......" ویرو کی زبان رک گئی۔

"پھر بھی مجھے کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ کہنا چاہتی ہو تم ویرو؟" چندن نے ہنس کر کہا۔

"اثر ہوا بھی ہو گا تو بھی تم غالباً اسے برداشت کر گئی ہو گی۔"

"تم بھول رہی ہو ویرو بہن! تمہارا پیغام میں نے ہی پہنچایا تھا انہیں۔" چندن نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔ "مگر یہ سب باتیں فرصت میں ہوں گی۔ آج تو

صرف اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ ضرورت پڑنے پر گواہی دینے آؤ گی؟"

"چندن! تم گواہی دینے کی بات کرتی ہو؟ میں جان بھی دے سکتی ہوں۔" چندن کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

"فی الحال یہ خیال رہے کہ بات باہر نہ جائے۔ کسی کو پتہ چلا کہ تم گواہی دینے جارہی ہو تو پریشانی بڑھ جائے گی۔"

"تم بے فکر رہو! میں سب مصیبتوں کا مقابلہ کر کے عدالت میں آؤں گی۔" ویرو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ چندن جانے سے پہلے اس سے لپٹ گئی۔

"بھگوان ہم سب کی مصیبتوں کا جلدی خاتمہ کرے۔"

چندن کور کے جانے کے بعد ویرو بہت دیر تک بیتی ہوئی یادوں کے سیلاب میں بہتی رہی۔

❀......❀......❀

تین ماہ کے طویل انتظار کے بعد فیصلے کا دن آپہنچا۔ بار بار پڑتی ہوئی تاریخیں جیسے فیصلے کے دن کو دور کرتی محسوس ہو رہی تھیں مگر یقیناً ہر تاریخ فیصلے کے قریب تر ہو رہی تھی۔ گواہیاں، دلیلیں، قانونی گتھیاں، ثبوت ان سب نے جگا کی قسمت کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ گاؤں گاؤں، گھر گھر اس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا یہی اندازہ تھا کہ پھانسی یا عمر قید ہوگی۔ کچھ پرامید نظر آرہے تھے۔ عدالت میں پہلی بار قدم رکھنے والی ماں جی اور چندن کور عورتوں کی علیحدہ بینچ پر جسم سکیڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں جیسے پتھر کی دو تراشی ہوئی مورتیاں ہوں۔ جگت کو بڑی سزا ہوئی پھر؟ اس خوف کے زیر اثر انہوں نے تین ماہ تڑپ کر گزارے تھے۔ وہ عرصہ عمر قید سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے یہی بھیانک خیال ان کے ذہن کو ڈس رہا تھا۔ بڑی منتیں مرادیں، لاکھ کوششیں کرنے کے باوجود دل انہی خیالات میں غلطاں رہتا تھا۔ دونوں کو عدالت میں نہ آنے کے لیے نانا نے بہت سمجھایا۔ "وہاں عورتوں کا کام نہیں، اگر غلط فیصلہ ہوا تو برداشت نہیں ہوگا۔" نانا نے دونوں سے کہا تھا۔

"باپو! اگر غلط فیصلہ ہوا تو گھر بیٹھے بھی دل ڈوب جائے گا آنکھیں بند ہو جائیں گی۔" ماں جی نے بھرائی ہوئی آواز میں دلیل دی۔ "اس سے بہتر ہے کہ جگت کی صورت دیکھ کر مر جاؤں تو روح کو ٹھنڈک ہوگی۔"

چندن نے دوسرے طریقے سے دلیل دی۔

"نانا جی! شاید وہ رہا ہو جائیں گے۔ اس صورت میں ہمیں دیر سے خبر ہوگی اور ہماری جان آدھی رہ جائے گی۔ لہٰذا ہمارا وہاں جانا ضروری ہے۔"

"بہتر ہے تم لوگ آجاؤ۔" نانا نے تنگ آکر کہا۔ "مگر دل کو مضبوط رکھنا ہوگا۔"

یہی وجہ تھی کہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح بیٹھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ گیارہ بجے سے پہلے عدالت پوری طرح بھر گئی۔ نانا کے برابر سوہن سنگھ اور ہزارہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسچین ڈاکٹر جگت کے وکیل سے کوئی مشورہ کر رہے تھے۔ پولیس چیف ارجن سنگھ اور ویرو کا شوہر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ درمیان میں ہنس دیتے۔ پولیس کی جانب سے سب سے مضبوط گواہی انہی دونوں کی تھی۔ ارجن سنگھ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ کمشنر ولیم کے قتل کے بعد وہ جوش میں آگیا۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے جگا کو اس نے خونی، حیوانی، ڈاکو ٹھہرایا۔ اس کے ہاتھوں لوگوں پر کیے گئے ظلم اور تشدد کے علاوہ پولیس کے انفار مروں پر کیے گئے ظلم کا بیان اس نے ڈرامائی انداز میں کیا کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بغیر پوچھے جب اس نے کہا کہ پولیس کی

گولی سے بچ جانے والے اس راکشس کو قانون کے پنجے سے نہیں بچنا چاہیے تب مجسٹریٹ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "ارجن سنگھ! تم گواہ ہو، وکیل نہیں۔ پولیس چیف کی حیثیت سے تم جو نہ کر سکے اس کا جلاپہ مت کرو۔"

مجسٹریٹ کے ان الفاظ سے عدالت میں موجود لوگ ہنسنے لگے۔ اس طرح ارجن سنگھ کی زوردار گواہی کا اثر آدھا رہ گیا۔ ویرو کے شوہر نے رونی صورت بنا کر بیان دیا۔ "میرے تین بھائی اور بھتیجے کا قتل جگا کے سوا کسی نے نہیں کیا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔ میری بیوی پر بھی اس کی بری نظر تھی۔ میری غیر حاضری میں میرے گھر آکر وہ اسے بہکاتا تھا، جھوٹا لالچ دے کر وہ میری بیوی کو گھر سے اغوا کر کے لے گیا۔ اب بھی اس کی دھمکیوں کی وجہ سے ویرو سچی بات کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے عدالت میں گواہی دینے سے روکنے کے لیے اس کے ڈاکو ساتھیوں نے موت کی دھمکی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پولیس کی حفاظت مانگی ہے۔ ویرو کو اس شخص نے یہی سکھایا تھا کہ میرے کھانے میں زہر دے۔ مجھے اس کا پتہ چلا، لہٰذا میں نے ویرو کو سزا دی اور اس پر گہری نظر رکھتا تھا۔" شوہر کی ایسی جھوٹی گواہی سن کر ویرو شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کی قسم کھا کر بھی تھوڑا جھوٹ بولوں گی۔ ویرو کی گواہی عدالت کے ہال کی بجائے مجسٹریٹ کے چیمبر میں لی گئی۔ جگت کے گھر سے اپنے اچھے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے وہ بولی۔

"جگت کی ماں نے میرے ساتھ محبت کا اظہار کیا تھا ایسی محبت مجھے میرے گھر والوں سے نہیں ملی۔ جگت نے دھرم پور سے واپس آنے کے بعد بھی کبھی ہم سے دشمنی نہیں رکھی۔ میرا شوہر مجھ پر ظلم کرتا تب وہ مداخلت کرتے۔ اس کی وجہ سے میرے شوہر کو اس پر غصہ تھا۔ میرا شوہر اس حد تک شکی مزاج تھا کہ مجھے میرے دیوروں کے ساتھ بھی گھر میں اکیلا نہیں رہنے دیتا تھا۔ میرے گھر میں شرابی دوست جوا کھیلنے آتے۔ ان کی مجھ پر بری نظر تھی۔ اس کی میں جب شکایت کرتی، وہ مجھے جانوروں کی طرح مارتا۔ گروی رکھے گئے مکان اور کھیت چھڑانے کی خاطر میری عصمت کا سودا کرتے ہوئے بھی میرا شوہر نہیں ہچکچایا۔ وہ اور اس کی چاچی مجھے برباد کرنے پر تیار ہو گئے۔ تب مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔"

"مگر برسات کی رات کو تمہارے دیور کا قتل جگت سنگھ ہی نے کیا تھا؟" سرکاری وکیل نے سوال کیا تو ویرو چند لمحے کو خاموش ہو گئی۔ پھر گہرا سانس لے کر بولی۔

"نہیں...... وہ قتل میرے شوہر کے ہاتھوں ہوا تھا۔"

سننے والے چونک گئے۔ مجسٹریٹ اور دوسرے حاضر لوگوں کے علاوہ خود جگت لرز گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مجسٹریٹ نے اسے روک دیا۔ ویرو نے جان بوجھ کر جگت کی طرف نہیں دیکھا۔

"ایک ڈاکو کو بچانے کی خاطر تم اپنے شوہر پر اس کے سگے بھائی کے قتل کا الزام لگا رہی ہو۔" سرکاری وکیل نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔ "حضور والا! عدالت کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ لہٰذا اس کی بات کا نوٹس نہ لیا جائے۔"

"نہیں حضور والا!" جگت کا وکیل فوراً بولا۔ "اس کی پوری بات سنے بغیر ایسا اندازہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ میں کچھ اور سوالات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

مجسٹریٹ نے منظوری دے دی۔ پہلے قتل کی

صفائی کے لیے ملنے والے اتنے مضبوط پوائنٹ کے متعلق وکیل صفائی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ جوش میں آ گیا۔ اس نے ویرو سے سوال کیا۔

"ہم...... تو اس رات تمہارے دیور کا قتل تمہارے شوہر نے کس طرح کیا تھا؟"

سرکاری وکیل نے پھر قانونی پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا۔ "جناب والا! ویرو کے شوہر نے کس طرح قتل کیا تھا اس طرح کا سوال نہیں کرنا چاہیے۔" مجسٹریٹ نے یہ پوائنٹ منظور کرلیا تب جگت کے وکیل نے سوال دوسری طرح کیا۔

"اس رات تمہارے دیور لکھن کا قتل کن حالات میں ہوا تھا؟"

سرکاوی وکیل ہتھیلیاں مسلنے لگا۔ ویرو نے کسی جانب دیکھے بغیر کہا۔ "لکھن اس شام پیٹ دکھنے کا بہانہ کر کے کھیت سے گھر آ گیا تھا۔ میرا شوہر موسم کی پہلی بارش کا نشہ کرنے گیا ہوا تھا۔ جب میرے دو دیور جیل میں تھے، لکھن نے مجھے برسات میں نہانے کی غرض سے چھت پر بھیج دیا۔ اتنی دیر میں صدر دروازہ اندر سے مضبوطی سے بند کردیا' نیچے آ کر کمرے میں کپڑے تبدیل کررہی تھی' تب عقب سے آ کر اس نے میرے منہ پر دوپٹہ باندھ دیا اور ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی لے کر مجھے اپنا آپ اپنے سپرد کردینے کا مطالبہ کیا تھا۔"

ویرو رک گئی۔ سب بڑے غور سے اس کا بیان سن رہے تھے۔ سب لوگ چونک گئے۔ جگت کے ادھیڑ عمر کے وکیل نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔ "پھر کیا ہوا بہن؟ ہچکچائے بغیر جو کچھ کہنا ہے کہہ دو! سچائی جاننے کے لیے ہم سب بے چین ہیں۔"

ویرو نے سرد آہ بھری۔ "لکھن کی آنکھوں میں ہوس کی آگ بھڑک رہی تھی۔ میں لرز گئی۔ اس سے بچنے کے لیے میں نے بھرپور کوشش کی اور اس کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔ وہ الٹ گیا۔ اتنی دیر میں جلدی سے میں نے دوپٹہ کھول لیا اور مدد کے لیے چلانا چاہتی تھی کہ اسی لمحے صدر دروازے کی زنجیر کھڑکائی گئی۔ دوڑ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے انہیں باہر کھڑے دیکھا۔ لکھن کے ساتھ مجھے اکیلے پا کر وہ غصہ ہوگئے۔ پھر میں نے سچی بات بتائی تو دونوں بھائیوں کے درمیان گرم باتیں ہوئیں۔"

ویرو پھر رک گئی۔

سرکاری وکیل پرجوش انداز میں کھڑا ہوگیا۔ "جناب والا! یہ جھوٹی کہانی اسی جگہ روک دی جائے۔ یہ عورت کسی کہانی کا پڑھا ہوا باب دہرا کر عدالت کا وقت برباد کررہی ہے۔" مگر مجسٹریٹ نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ جگت کے وکیل نے ویرو سے سوال کیا۔

"اور سوہن سنگھ نے اپنے بھائی کا قتل کر کے اسے سزا دی؟"

ویرو نے ایک بار پھر جگت کی جانب دیکھ کر نظر پھیر لی۔ "جی ہاں...... پیٹ میں لاتیں پڑنے سے لکھن کے پیٹ میں گڑبڑ ہورہی تھی۔ رات دو تین بار وہ ضروریات سے فراغت پانے گیا۔ چوتھی بار آدھی رات کے وقت میرا شوہر ہتھیار لے کر اس کے پیچھے جانے کو تیار ہوگیا۔ میں نے اسے بہت روکا۔ ایسا کر کے پکڑے جاؤ گے۔ تمہارے بغیر میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟" ویرو کا بیان جاری تھا۔

"پھر بھی موہن سنگھ لکھن کے پیچھے گیا؟" وکیل صفائی نے پوچھا۔

"جی ہاں...... مجھ سے کہا کہ وہ قتل کا الزام جگت کے سر ڈال دے گا۔ پرانی دشمنی کی وجہ سے سب مان لیں گے۔ اس بہانے دشمن بھی کیفر کردار تک پہنچ جائے گا۔ یہ سن کر میں لرز گئی۔ میں انہیں روک نہیں سکی۔ کچھ دیر بعد کام ختم کر کے' وہ واپس لوٹا تب اس کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں تھا۔ البتہ اس کے کپڑوں پر خون کے داغ تھے۔ تیزی سے لباس تبدیل کر کے کچھ دیر وہ ستانے لگا' پھر پڑوسیوں کو بیدار کر کے ساتھ لیا اور لکھن کی تلاش میں نکل گیا۔" ویرو سسکیاں لے کر رونے لگی۔ سب یہ سمجھنے لگے کہ عرصے تک دل میں چھپائی ہوئی بات اور اس کے شوہر کے ہاتھوں کیے گئے قتل کی بات ظاہر کرتے ہوئے اسے دکھ ہورہا ہے۔ مگر جگت سمجھ گیا کہ ویرو کیوں رو رہی ہے۔ اس کی صفائی کی خاطر گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر جھوٹ بولتے ہوئے اس کی روح کو صدمہ پہنچا تھا۔ جگت کا جی چاہا کہ وہ ظاہر کردے کہ ویرو جھوٹ بول رہی ہے۔ لکھن کو میں نے قتل کیا ہے مگر ایسا کہہ کر وہ ویرو کو جھوٹا ثابت کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا وہ خاموش رہا۔ احسان مند نظروں سے اس نے ویرو کی جانب دیکھا۔

اس کے بعد سابق پولیس چیف سنہا کی گواہی تھی۔ بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے وہ گواہوں کے کٹہرے میں آ کر رک گیا۔ بیٹھنے کے لیے اسے اسٹول دیا گیا۔ مجرم کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے جگت کی جانب ہمدردی سے پرمسکراہٹ پھینک کر وہ بیٹھ گیا۔

"میں شیخوپورہ کا پولیس چیف تھا۔ اس وقت جگت' لکھن سنگھ کو قتل کر کے رات ہی فرار ہوگیا تھا۔ ہم نے اسے بہت تلاش کیا مگر اس کا پتہ نہیں ملا کیونکہ وہ نقلی نام سے فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ گاؤں میں آنے والی ڈاک پر ہماری گہری نظریں تھیں جس کی وجہ سے ہمیں اس کا پتہ مل گیا۔ فوج میں اس نے اپنا نام زور آور سنگھ رکھا تھا۔ اس نام سے اس کے دوست ہنومان کے پاس ایک خط آیا۔ یہ خط امرتسر کی سکھ رجمنٹ کی چھاؤنی سے لکھا گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی گرفتاری کا منصوبہ بنایا مگر بدقسمتی سے جب تک میں اسے گرفتار کرنے کے لیے امرتسر پہنچا اس عرصے میں وہ اپنے تین فوجی ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے جیپ میں فرار ہوگیا۔ میں شیخوپورہ واپس لوٹا۔ اس وقت اطلاع ملی کہ موہن سنگھ کے دو بھائیوں اور بھتیجے کو چھت پر سوتے ہوئے گولی ماردی گئی ہے۔ رائفلوں کے دھماکے سن کر گاؤں کے لوگ جاگ گئے۔ افسروں کے لباس میں شکار کے لیے جیپ میں بیٹھ کر آئے ہوئے چار افراد کو لوگوں نے دیکھا مگر......"

"اس کا مطلب ہے فوج سے فرار ہو کر جگت سنگھ ساتھیوں کے ساتھ گاؤں آیا اور چھت پر سوئے ہوئے تینوں افراد کو قتل کر کے بھاگ گیا۔ یہی کہنا چاہتے ہیں آپ؟" سرکاری وکیل نے پرمسرت انداز میں سوال کیا مگر اس نے جس طرح سوچا تھا سنہا صاحب کی جانب سے اس کے برخلاف جواب ملا۔

"جگت سنگھ فوج سے فرار ہو کر اپنے گاؤں دشمنوں کو قتل کرنے آیا تھا یا ماں باپ کو ملنے یہ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ موہن سنگھ کے دونوں بھائیوں کو سوا برس کی قید کی سزا ہوئی تھی لہٰذا وہ جیل سے رہا ہوچکے ہوں گے اس کا پتہ شاید جگت سنگھ کو بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی جب یہ تین ساتھیوں کے ساتھ گاؤں میں آیا' اسی دوران موہن سنگھ کے بھائی اور بھتیجا شوٹ ہوئے تھے۔ یہی بات ثابت کرتی ہے کہ قتل اس کے ہاتھوں ہوا تھا مگر......" سنہا رک گئے۔

"مگر کیا......؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"رائفلوں کے جو دھماکے ہوئے تھے......" سنہا نے بات جاری رکھی۔ "انہیں ایک ساتھ سنا گیا۔ یہ گاؤں کے لوگوں نے میری تحقیقات کے دوران

بیان میں لکھوایا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تین آدمیوں کے ہاتھوں تین قتل ہوئے ہیں۔"

"تم بھول رہے ہو سنہا!" سرکاری وکیل نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "کہ جگت سنگھ کے ساتھیوں کو موہن سنگھ کے بھائیوں سے عداوت نہیں تھی بلکہ وہ انہیں پہچانتے بھی نہیں تھے پھر ان کے ہاتھوں قتل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ قتل اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ہوا ہے۔" سنہا نے کہا۔ "مجھے تو صرف اتنا کہنا تھا کہ تین قتل ایک وقت میں ہوئے ہیں جن کی وجہ سے رائفل کا دھماکہ سن کر دوسرے دو کو بیدار ہونے کا موقع نہ مل سکا۔" اس پوائنٹ کے وزن پر جگت کے وکیل نے سوال کیا۔

"سنہا جی! پولیس چیف کی حیثیت سے آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے کہ بغاوت شروع کرنے سے پہلے عام طور پر ایک شخص کے لیے ایک خطرناک جرم کرنا ضروری ہوتا ہے؟ کیا یہ ڈاکوؤں کا اصول ہے؟"

"اصول تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ سلامتی کی خاطر وہ لوگ ایسی شرط ضرور رکھتے ہیں جس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ساتھی پھوٹ نہ جائے یا پولیس سے مل کر اطلاع دینے کی ہمت نہ کر سکے۔" سنہا نے بتایا۔

"جناب والا! اس پوائنٹ کو نوٹ کیا جائے۔" کہہ کر وکیل صفائی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

لوٹ اور ڈاکے کے کیس میں گواہی دینے والے منکر ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے نام دیئے گئے تھے ان سب کو بچن کی جانب سے دھمکی ملی تھی کہ اگر جگا کے خلاف گواہی دی تو تم لوگوں کی خیر نہیں۔ نئے پولیس چیف دلاور خان نے سب کو ہمت دلائی۔ "تمہارا بال بیکا نہیں ہونے دوں گا۔" پھر بھی بات آگے نہیں بڑھی۔ لہٰذا پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اپنے آدمیوں کو گواہی پر آگے بڑھانا پڑا۔ آخری دن دونوں جانب کے وکیلوں نے اپنے اپنے پوائنٹ پر دلیلیں دیں۔ سرکاری وکیل نے آخر میں عدالت سے عرض کرتے ہوئے کہا۔ "جگت سنگھ عرف جگا کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ اس کے ہاتھوں ہونے والے قتل اور ڈاکے انسانیت اور قانون کی نظر میں قابل نفرت ہیں۔"

جگت کے وکیل نے لمبی دلیلوں کے آخر میں اس بات پر زور دیا کہ "ملزم پر جن چار قتل کا الزام ہے ثابت نہیں ہو سکا۔ پہلے قتل کے متعلق ویرو کی گواہی دوسری بات بتا رہی ہے جبکہ دوسرے قتل اکیلے آدمی نے نہیں کیے۔ لہٰذا میرے موکل کو شک کا فائدہ ملنا چاہیے۔ انسانیت کی نظر میں بھی جگت اپنے طور پر پولیس کے حوالے ہوا ہے۔ غلط راہ پر چلنے والا شخص اگر صحیح راستے پر آنے کی کوشش کرے تو اسے اس کا فائدہ ضرور ملنا چاہیے۔ اس پر رحم کیا جائے۔"

آخر میں مجسٹریٹ نے جگت سے پوچھا "تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "نہیں جناب والا! مجھے کچھ نہیں کہنا۔" اس کے وکیل کو جگت پر غصہ آ گیا۔ کم از کم اسے رحم کے لیے درخواست کرنی چاہیے تھی۔

"مقدمے کی کارروائی یہاں ختم ہوتی ہے" مجسٹریٹ نے اعلان کیا۔ "آج سے گیارہویں دن فیصلہ سنا دیا جائے گا۔"

اور گیارہواں دن آ پہنچا...... گیارہ بجتے ہی مجسٹریٹ عدالت کے ہال میں داخل ہوا۔ عدالت میں موجود لوگ احترام میں کھڑے ہو گئے۔ یہاں کی رسم سے انجان چندن کور چونکی۔ اس نے آس پاس گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ماما ہزارہ نے

آنکھیں دکھائیں، ماں جی کی جانب اشارہ کیا، وہ اب تک سر جھکائے بت بنی بیٹھی تھیں۔ چندن نے شانے ہلا کر انہیں بیدار کیا۔ ماں جی خوفزدہ ہو گئیں۔ سر اٹھا کر انہوں نے دیکھا کہ سب کھڑے ہو کر پھر بیٹھ رہے تھے۔ مجرم کا کٹہرہ خالی تھا۔ ماں جی نے پھر سر جھکا لیا۔

جگت سنگھ عرف جگا کا نام پکارا گیا تب ماں جی اور چندن کور کے جسموں میں حرکت ہوئی۔

بیڑیاں کھنکھنائیں۔ سب چونک گئے۔ ماں جی کا دل دھڑکنے لگا۔ تین ماہ سے بیٹے کی صورت دیکھنے کے لیے ترستی ہوئی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ جگت ہلکے قدموں سے چلتا ہوا کٹہرے میں داخل ہوا۔ ماں جی کو دیکھ کر اس کے لب مسکرائے۔ پلکیں جھپکنے لگیں۔ ماں جی تڑپ گئیں۔ ان کے لب کپکپائے اور آنکھیں برسنے لگیں۔ جگت نے سر ہلا کر اشارتاً کہا۔

"ماں! رو نہیں۔ تم جگا کی ماں ہو۔"

مجسٹریٹ، وکیل اور دوسرے لوگوں کی نظریں محسوس کرتے ہوئے ماں جی نے سر جھکا لیا۔

"یہ لوگ اس کے جگر کے ٹکڑے کو جی بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتے۔" ماں جی کا دل رو رہا تھا۔

مجسٹریٹ نے فیصلے کے کاغذات میز پر پھیلائے۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے...... ماں جی بھیگی آنکھوں سے بار بار جگت کی جانب دیکھ رہی تھی۔ چندن نے دھڑکتے دل سے مجسٹریٹ کیا پڑھ رہے ہیں یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی مگر یہ اس کی سمجھ سے باہر کی بات تھی کیونکہ وہ انگریزی زبان میں فیصلہ پڑھ رہے تھے۔ درمیان میں کبھی کبھی جگا کا نام بھی آتا رہا۔ سننے والے چونک اٹھتے۔ قانونی پیچیدگیاں شروع ہونے پر وہ پھر اس طرح بیٹھ جاتے۔

کرسچین ڈاکٹر غور سے ٹھہرے ہوئے انداز میں فیصلے کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے مگر وہ بھی اندازہ نہیں کر سکے کہ آخر میں مجسٹریٹ اپنے طور پر کیا فیصلہ دیں گے؟ ایک کے بعد ایک ورق الٹتا جا رہا تھا۔ ویرو کی گواہی کا جب ذکر آیا تو موہن سنگھ لرز گیا۔ مگر مجسٹریٹ نے اس کی گواہی کو زیادہ اہمیت نہ دینے کے متعلق کہا، لہٰذا اسے اطمینان ہو گیا۔ ویرو کی گواہی کے مطابق لکھن کا قتل موہن سنگھ نے کیا ہے یہ بات مانی نہیں جا سکتی۔ گواہ کے اس کے شوہر سے تعلقات اب بگڑ چکے ہیں یہ صورت حال عدالت کے درمیان میں ہے۔ لکھن کا قتل تین سال پہلے ہوا تھا پھر ویرو نے اب تک اس بات کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔

سنہا کی گواہی کی تعریف کرنے کے بعد انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے ایک وقت میں مختلف رائفلوں سے قتل کیے گئے ہوں، لیکن اس کے لیے بھی جگا ذمہ دار ہے۔ کیونکہ مرنے والوں کے ساتھ اسے عداوت تھی۔ فیصلے کا آخری صفحہ آ گیا۔ تب عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ مجسٹریٹ نے گہرا سانس لے کر پڑھنا شروع کیا۔

"جگت سنگھ جگا کے جرائم خطرناک ہیں۔ اسے شک کا فائدہ دے کر رہا کرنا ممکن نہیں۔ قانون میں ایسے مجرموں کے لیے سزا کی گنجائش ہے۔ ایک ساتھ اتنے قتل اور ڈاکے ڈالنے والے کے لیے موت یا عمر قید کی سزا ہونی چاہیے مگر......" مجسٹریٹ لمحے بھر رک گئے۔ سننے والوں کے دل حلق میں آ گئے۔ "مگر یہ سب ہونے کے باوجود ثبوت مکمل نہ ہوں تو انصاف کرنا کافی مشکل ہو جاتا ہے پھر بھی جو گواہیاں دی گئی ہیں ان کو غور سے دیکھتے ہوئے ......کوڈ کی کالم 302 کی رو سے مجرم جگت سنگھ عرف جگا کو میں چاروں قتل کا مجرم ٹھہراتا ہوں اور انہیں چار

قتل کے جرم میں ہر قتل کے پانچ سال کے حساب سے کل بیس سال سخت قید کی سزا کا حکم کرتا ہوں۔"

عدالت کا ہال کانپ اٹھا۔ "اوہ......اوہ......" کی آوازیں ابھریں۔ ماں جی چیخ مار کر چندن سے لپٹ گئیں۔ بہو ساس کے شانے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ دوات پر سے قلم اٹھا کر مجسٹریٹ نے فیصلے کے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد زور دے کر پن توڑ دی۔ یہ دیکھ کر چندن کا دل بیٹھنے لگا۔ مجسٹریٹ نے مجرم کی جانب دیکھا۔ سزا سن کر جگت کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ اصلی حالت پر لوٹ آیا پھر وہ مجسٹریٹ کی جانب دیکھ کر پرنفرت انداز میں مسکرایا۔ کٹہرے سے اس کا ہاتھ بلند ہوا۔ تب سب نے سمجھا کہ وہ مجسٹریٹ کو سلام کرے گا مگر وہ اپنی پتلی مونچھ کے کنارے کو بل دیتے ہوئے دانت پیس کر مجسٹریٹ کو گھورنے لگا۔ کرسچین ڈاکٹر جلدی سے کھڑے ہو گئے اور جگت کے وکیل کو لے کر مجرم کے کٹہرے کے پاس گئے۔

"افسوس جگت! ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "مگر تم ہمت نہ ہارنا، ہم ہائی کورٹ میں اپیل دائر کریں گے۔"

جگت پھیکے انداز میں مسکرایا، مگر کچھ بولا نہیں۔

دلاور خان تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ باہر عدالت کے میدان میں شور مچ گیا تھا لہٰذا اسے فکر ہو رہی تھی۔ جگت لکڑی کے کٹہرے سے باہر آ کر مسلح سپاہیوں کے درمیان چلتا ہوا وہاں سے باہر جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ماں جی بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ پھیلا کر روتی ہوئی اس کی جانب جھپٹیں۔ کرسچین ڈاکٹر اور چندن نے انہیں بازوؤں سے تھام لیا تب وہ زمین پر گر پڑیں۔ موہن سنگھ کے علاوہ سب کی آنکھیں ماں کی تڑپ دیکھ کر بھیگ گئیں۔

دوسرے دن لاہور کی جیل کا دیوہیکل دروازہ کھلا بیڑیوں سے جکڑے ہوئے جگت ڈاکو کو دیکھنے کے لیے جیل کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ تب سب کو یقین تھا کہ بیس سال سے پہلے جگت یہ دروازہ کھلتا نہیں دیکھ سکے گا۔

جگت کو پتہ نہیں تھا کہ کچھ دن پیشتر کمشنر کے قتل کے مجرم گرد بخش کو پھانسی کی سزا سنا کر اسی جیل میں رکھا گیا ہے۔

❀......❀......❀

بیس سال...... مجسٹریٹ کے یہ الفاظ چندن کور کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ فیصلہ سنے دو دن بیت گئے تھے پھر بھی اسے معلوم ہوتا جیسے کچھ لمحات پہلے سنا ہو۔ عدالت ایک فرد کو سزا دیتی ہے مگر اس فرد کے ساتھ بندھے ہوئے دوسرے افراد کو بھی ایک یا دوسری طرح وہ سزا بھگتنا ہوتی ہے۔ اس کا کوئی خیال کرتا ہے؟" دو دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ ماں جی کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ ہر بات میں سرد آہ بھر کر کہتی ہیں۔ "بھگوان! اب تم مجھے کب تک زندہ رکھنا چاہتے ہو ابھی مجھے کیا کیا دیکھنا باقی ہے؟" جیسے جوان بیٹا مر گیا ہو اس طرح گاؤں کی عورتیں ماں جی کے پاس تعزیت کرنے آ رہی تھیں۔ چندن کور جھنجلا گئی۔ وہ سب اس کی جانب ہمدردانہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ وہ نظریں جیسے اس سے کہہ رہی ہوں۔

"بہن! تیری زندگی خراب ہو گئی۔ جوبن ویران ہو گیا۔ خالی گود اب کبھی نہیں بھرے گی۔ بیس سال کے بعد تم ماں بننے کے قابل نہیں رہو گی۔"

دن کو آنسو پی کر چندن رات کی خاموشی میں دکھے دل سے رو دیتی۔ کبھی مکان کے باہر نظریں جمائے گھنٹوں کھڑی رہتی۔ کھڑکی کی سلاخیں اسے جیل کی یاد دلاتی تھیں۔ اس نے کبھی جیل دیکھی نہیں

تھی پھر بھی سنی ہوئی باتوں کے اندازے پر جیل اس کی نظروں سے سامنے آ جاتی۔ سیاہ پتھر کی بلند دیواریں، بڑے بڑے دیوہیکل دروازے، چھوٹی کوٹھڑیاں، لوہے کی سلاخوں کے دروازے، اندر بند کیا ہوا قیدی لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، بندھے ہوئے ہاتھوں سے سلاخیں تھامے کھڑا ہوگا۔ جیل کے گھبرا دینے والے اندھیرے میں گھر والوں کو یاد کر رہا ہوگا مگر نہیں، کہتے ہیں جیل میں سخت مزدوری کرائی جاتی ہے۔ سارا دن چکی پیس کر، پتھر توڑ توڑ کر تھکا ہوا شخص کسی کی یاد میں کس طرح جاگ سکتا ہے؟

سردی میں بھی چندن کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تیرنے لگیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے اس نے اپنا سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ بے شمار ستارے لرزتے ہوئے نظر آئے۔ چندن محسوس کرنے لگی جیسے آسمان ایک بڑی جیل ہے اور ستارے اس میں بند کیے ہوئے قیدی۔ چاند ان سب کی چوکیداری کرتا ہوا آسمان میں چکر لگا رہا ہے۔ بے چارے ستاروں سے وہ سخت مزدوری کرا رہا ہے۔ دور ایک تارا ٹوٹا اور چندن لرز گئی۔ ٹوٹتا ستارہ تڑپا، پھر اچانک بجھ گیا۔ آسمان کی جیل والوں نے اسے پھانسی دی ہوگی۔ چندن یہ خیال برداشت نہیں کر سکی گھبرا کر اس نے کھڑکی بند کر دی۔ سر تا پا چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ تب اس کے کانوں میں کسی کے بگڑے ہوئے الفاظ سنائی دیے۔ موہن سنگھ کی جھگڑالو چاچی چھت پر کھڑی بلند آواز میں کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہائی کورٹ میں جانے سے اس کی سزا کم ہو جائے یہ کس نے کہا؟ ہمارے گاؤں کا ایک آدمی سزا کم کرانے کی لالچ میں ہائی کورٹ میں گیا وہ بے چارا مارا گیا۔ سزا بڑھ گئی اور پھانسی پر چڑھ گیا۔"

ایسے زہریلے الفاظ چندن کے دل میں زخم کر گئے۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کانوں پر دبا لیں مگر اس وقت اس کے ذہن سے وہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح ٹکرا رہے تھے۔ کان دبانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اسے یہ سب برداشت کرنا پڑے گا ورنہ بیس سال بعد گھر کا آدمی چھوٹ کر جب واپس لوٹے گا تب تک گھر کے افراد زندہ لاشیں بن چکے ہوں گے جس گھر کا سکھ پانے کی خاطر وہ اپنے آپ پولیس کے سپرد ہوئے اور سزا بھگت رہے ہیں وہ گھر شمشان جیسا بن جائے گا۔ اس صورت میں اسے سکھ کیسے ملے گا؟ کرسچن ڈاکٹر فیصلے کے دن گھر آئے تھے۔ تب ماں جی سے انہوں نے کہا تھا۔

"جگت کی ماں تم سب بھگوان پر اعتماد کرو سب اس پر چھوڑ دو۔ اس کی سزا کم کرانے کے لیے ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے کریں گے۔ انسان جرم کرے تو اس کا بدلہ ملنا چاہیے۔ یہاں کی عدالت نہیں تو آسمان کی عدالت میں یہ بدلہ ضرور ملتا ہے۔" پھر جاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"جگت سنگھ جب رہا ہو کر آئے گا تو اس کے سارے جرم دھل چکے ہوں گے وہ ایک صحت مند انسان بن کر گھر لوٹے گا کیا یہ کم مسرت کی بات ہے؟"

یہ سن کر ماں جی بڑبڑا اٹھیں۔ "مگر یہ دیکھنے کے لیے میں زندہ نہیں رہوں گی ڈاکٹر صاحب۔"

"نہیں، نہیں مایا کور۔" کرسچن ڈاکٹر اپنی جھریوں دار ہتھیلیاں ماں جی کے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی بھگوان کے ہاتھ کی بات ہے۔ انسان نہیں بلکہ اعتماد مضبوط ہے۔"

صبح جب بیدار ہوئی تو چندن کور کا جسم تھکا ہوا تھا مگر دل میں نامعلوم پھرتی محسوس ہونے لگی۔ رات کو جیل جیسا دکھائی دینے والا آسمان صبح حسین نظر آنے لگا۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں ایسے

کہہ رہی تھیں کہ انسان نہیں، یقین مضبوط ہے۔ جسم کی سستی اور دل کی مایوسی جھٹک کروہ نیچے آ گئی۔

لسی کے مٹکے میں گولا گھومنے کی آواز سن کر ماں جی چونک گئیں۔ مگر خاموشی سے بستر میں پڑی رہیں۔ کچھ دیر بعد باورچی خانہ میں برتن کھڑکنے لگے۔ چولہا جلایا گیا تو اپلے کے دھوئیں کی بدبو آنے لگی۔ آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے ماں جی سوچ رہی تھیں۔

''اچانک گھر میں زندگی کہاں سے آ گئی؟'' اسی لمحے چندن کور پیالہ لے کر آ گئی۔

''ماں جی اٹھیے راب پی لیجیے۔'' چندن کی آواز میں انوکھی بات تھی ماں جی انکار نہیں کرسکیں۔

شانے تھام کر چندن نے ماں جی کو بٹھایا اور جلدی سے پانی کا لوٹا اور بڑی سی پلیٹ لائی۔

''لیجیے منہ صاف کر لیجیے۔'' جیسے ماں بچے کو پیار سے ڈانٹ رہی ہو، اس طرح چندن کہہ رہی تھی۔ ماں جی مگر...... مگر کہتی رہیں مگر چندن نے زبردستی انہیں راب پلادی۔

سوہن سنگھ کو لسی کا پیالہ دے کر اسی طرح سے کہا۔

''میں پراٹھے بنالاتی ہوں۔ بغیر کھائے آپ باہر نہیں جائیں گے۔''

گردوارے سے واپس لوٹ کر چندن نے ساس سسر کو ناشتا کرایا تب ماں جی بول اٹھیں۔

''بہو بیٹی! تم بھی ساتھ کھالو۔''

''نہیں ماں جی، میرے لیے الگ ناشتا بنا ہے۔''

سوہن سنگھ اور ماں جی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بہو کی حرکت انہیں آج پراسرار نظر آنے لگی مگر بے چاری بہو کا دل نہ دکھے اس لیے وہ کچھ بولے نہیں۔ چندن ناشتہ کرنے بیٹھی تب ماں جی باورچی خانے میں جا کر دیکھنے کا تجسس روک نہیں سکیں۔ بہو کی تھالی میں دو پراٹھے، پیاز کے دو ٹکڑے اور تھوڑا سا نمک دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

''چندن! سبزی اور دال کم پکائی تھی جو اس طرح روکھے پراٹھے کھانے لگی ہو؟'' پھر ڈانٹ کر بولیں ''اور لسی صبح ہی بنائی ہے پراٹھے پر مکھن لگانا بھول گئی کیا؟''

جیسے چوری پکڑی گئی ہو اس طرح چندن گردن جھکالی۔ مگر خاموش رہنا مناسب نہیں تھا۔

''ماں جی سبزی اور دال بہت ہے مکھن بھی ہے۔'' چندن نے کہا۔

''پھر۔'' ماں جی نے متعجب لہجے میں کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں۔'' چندن دھیمے لہجے میں بولی۔

''آج سے میری یہی خوراک رہے گی۔''

''مگر کیوں؟'' ماں جی نے بلند لہجے میں پوچھا۔

''ہم بوڑھوں کو اچھا کھلا کر تم روکھا کھانا چاہتی ہو تو یہ نہیں چلے گا۔ سمجھیں، ہاں ایک آدھ چیز کی منت لینے کی ممانعت نہیں ہے۔''

چندن روکھا پراٹھا چباتی ہوئی بولی۔

''اس میں منت کی بات نہیں ماں جی، جیل میں آپ کے بیٹے کو ایسا کھانا ملتا ہے۔''

اب ماں جی کو خیال آیا کہ اپنی خوراک الگ پکانے کو چندن نے کیوں کہا تھا۔ پانی کے گھونٹ سے نوال حلق میں اتارتی ہوئی چندن سے انہوں نے پوچھا۔

''تمہیں کس نے کہا جیل میں ایسا کھانا ملتا ہے؟''

''میں پوچھ آئی ہوں۔'' چندن نے سر جھکا کر کہا ماں جی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔

''کس سے پوچھ کر آئی ہو؟''

''گردوارے سے واپس لوٹتے ہوئے سکینہ چاچی کے گھر گئی تھی۔''

سکینہ...... مگر اسے کیا خبر؟

''ان کا بیٹا ممدو سات سال کی جیل کاٹ کر آیا ہے۔ جیل والے روٹی اور پیاز کے دو ٹکڑے کھانے میں دیتے ہیں۔ کہتا تھا کہ آٹے میں سیمنٹ ملا کر روٹی پکائی جاتی ہے۔'' چندن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر اس نے کہا۔

''ماں جی آپ کے ڈر کی وجہ سے میں نے اس میں سیمنٹ نہیں ملائی۔''

''اچھی بات ہے پھر مجھے بھی ایسا ہی کھانا دینا۔'' ماں جی کھڑی ہو کر بولیں۔

''وہ تمہارا شوہر ہے مگر میرا بیٹا بھی ہے۔'' چندن کیا بولتی۔

لاہور کی جیل میں کھانے کی گھنٹی بجنے لگی اور بھوکے قیدیوں کے چہروں پر روشنی پھیل گئی۔ جگت کان تیز رکھ کر کوٹھڑی کے دروازے کے قریب بیٹھا ہوا تھا پہلے دو دن تو اس نے کھانے کی پروا نہیں کی۔ دس بائی بارہ کی کوٹھڑی میں اس کا دل گھبراتا تھا۔ ایک کونے میں پتھر کی بڑی چکی تھی۔ گھنٹوں کھڑے رہ کر اس وزن دار چکی کو گھماتے ہوئے اس کے پیر ٹوٹنے لگتے۔ بازو شل ہو جاتے۔ رائفل تھامنے والے ہاتھوں میں چکی کا ڈنڈا تھامنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ دوڑنے والے پیر کھڑے کھڑے سن ہو جاتے تھے۔ پتھر کی دیوار پر ہاتھ مار کر وہ چیخ اٹھتا۔

''بیس سال تو کیا میں بیس دن بھی یہ برداشت نہیں کرسکوں گا۔'' کرسچن ڈاکٹر نے نصیحت کی تھی۔

''جگت دھیرج رکھنا ہمت نہ ہارنا، مگر بیس سال اس جہنم میں رہنے کی ہمت کیسے رہ سکے گی؟ اس بات کا یقین دو دنوں میں ہو گیا پہلے دن اس نے میٹ سے کہا۔

''مجھے حاجت ہو رہی ہے، دروازہ کھولو۔''

تب وہ میٹ اسے غور سے دیکھنے لگا جگا ڈاکو کی جگہ دوسرا قیدی ہوتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا۔ پھر بھی وہ مسکرایا۔

''نمبر نو سو ساٹھ، حاجت کے لیے اندر ہی انتظام ہے کونے میں ڈبہ پڑا ہے وہ اسی کے لیے ہے۔''

جگت کو ابکائی سی آنے لگی۔ کونے میں پڑے ہوئے ڈبے کو زور سے لات ماری۔ دیوار سے ٹکرا کر ڈبہ مڑ گیا۔ دانت پیستا ہوا وہ بڑبڑایا۔

''سالا...... یہ کیسا انتظام ہے جہاں کھانا سونا، وہیں حاجت۔'' ڈپٹی جیلر نے شام کو آ کر اسے سمجھایا۔

''نو سو ساٹھ اس قدر جلد باز مت بنو، کچھ دن برداشت کرلو۔ شیخو پورہ سول اسپتال کے سرجن صاحب نے سوپر صاحب سے تمہارے لیے خاص سفارش کی ہے لہٰذا تمہارے لیے علیحدہ انتظام کیا جائے گا۔'' پھر اسے وارننگ بھی دی۔

''تب تک تم کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرو گے۔ جیل کے رجسٹر میں تمہارے نام کے نیچے سرخ روشنائی سے لکیر ڈالی گئی ہے۔ وہ خطرناک قیدی کی نشان ہے یہی وجہ ہے کہ تمہیں پھانسی والی کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔''

تب جگت سمجھ گیا اس کے اندر آنے کے بعد بھی باہر والے ہاتھ باندھ کر بیٹھے نہیں رہے۔ اس کے انتظام کے متعلق سفارش چل رہی ہے۔ یہ جان کر اسے اطمینان ہوا۔ ویسے تو ڈاکو کی زندگی میں کہاں دکھ نہیں اٹھایا؟ کئی بار بھوکا رہنا پڑا ایک بار مردے کی چتا پر بکرا پکا کر کھایا۔ کوئی سنے تو اسے الٹی آ جائی۔ اسے جیل کی زندگی برداشت کرنی پڑے گی۔ نہیں تو فرار کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔

باہر کے دروازے کا تالا کھڑکا، کھانا دینے والا میٹ بغل میں روٹی کا ڈبہ دبائے سامنے کھڑا تھا۔ سنتری نے تالا کھولا۔ ہر کوٹھڑی کے باہر کھلا چوک

جیسا حصہ ہوتا ہے۔ جس کے اوپر مضبوط سلاخوں کی چھت ہوتی ہے۔ چوبیس گھنٹے بند قیدی کو صبح و شام آدھا آدھا گھنٹہ اس چوک میں ٹہلنے کی چھوٹ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھڑی کا تالا کبھی نہیں کھلتا۔ روٹی، پانی وغیرہ بھی چوک میں کھڑے رہ کر اندر کی کوٹھڑی کی سلاخوں میں دی جاتی ہے۔ جگت نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ پسند کی چیز چھین لینے کی قوت رکھنے والا جگا ڈاکو روٹی کے ٹکڑے کے لیے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اس میٹ کو اپنی ذات پر جہاں فخر محسوس ہوا وہاں شرم بھی آئی۔ بھوک بڑے بڑے طاقتوروں کو بزدل بنا دیتی ہے۔ یہ اس نے کئی بار دیکھا تھا مگر ایسا حسرت ناک منظر بھی اسے آج دیکھنے کو ملا تھا۔ چوک کا فولادی دروازہ بند ہوا تالا لگایا گیا اور سنتری کے عقب میں چلتا ہوا میٹ دوسری کوٹھڑی کی جانب بڑھ گیا۔ جگت نے پراٹھے کا پہلا ٹکڑا منہ میں رکھا اسی لمحے کسی کی گرج سنائی دی۔

''نہیں چاہیے تمہارا یہ کھانا جا کر کتے کو کھلا دو اور اپنے صاحب کو کہہ دو کہ میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔''

جگت فوراً کھڑا ہو گیا۔ ان دو دنوں کے دوران اس نے سوچا تک نہیں تھا کہ برابر والی کوٹھڑی میں کون ہے۔ دروازے کی سلاخوں پر زنجیر مار کر وہ بھی گرجا۔

''ارے میٹ' یہ کون بکتا ہے؟ روٹی نہیں کھاتا ہے تو بھوکا مر جا لیکن کمبخت چور، ڈاکو کو کیوں گالیاں دیتا ہے؟'

برابر والی کوٹھڑی سے وہی آواز سنائی دی۔

''تو کون ہے درمیان میں دخل دینے والا؟ سارا جیل والوں کو مسکہ لگاتا ہے؟''

جگا کی مٹھیاں کس گئیں۔ ''زبان سنبھال بے وقوف۔'' جگا غصے میں گرجا۔ ''میں ہوں تیرا باپ جگا ڈاکو۔''

اور اس کے بعد دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ سنتری اور میٹ چکرا گئے۔ جگا ڈاکو کا نام سنتے ہی جیسے اس قیدی کے لبوں پر تالا لگ گیا۔ جگت کو بھی حیرت ہوئی۔ وہ شخص اچانک چپ کیوں ہو گیا؟'' کون ہے' پھانسی کی کوٹھڑی کا قیدی ایسا بزدل نہیں ہوتا۔ کیا وہ اسے پہچانتا ہوگا؟ پندرہ منٹ میں جیل میں بات پھیل گئی قید نمبر 958 بھوک ہڑتال پر ہے۔ جیلر صاب دوڑتے ہوئے آ گئے۔ جگت کو یہ ہنگامہ دیکھنے کا لطف آیا۔ جیلر سے وہ قیدی کہہ رہا تھا۔

''میں سیاسی قیدی ہوں مجھے اچھا کھانا ملنا چاہیے۔ رہنے کے لیے اچھی جگہ ملنی چاہیے۔ میں بھوکا مر جاؤں گا مگر یہ ظلم برداشت نہیں کروں گا۔''

جیلر اسے سمجھانے لگا دونوں کے درمیان انگریزی میں دلیلیں ہونے لگیں۔ اس وقت جگت چونکا۔ وہ کوئی تعلیم یافتہ قیدی تھا جیلر نے بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ جگت سے رہا نہ گیا لہٰذا اس نے پوچھا۔

''جیلر صاحب یہ کون نواب کا بچہ جیل میں آیا ہے۔''

''ارے بھائی مصیبت ہے پھانسی پر لٹکنے سے پہلے ہماری ناک میں دم کر دے گا۔'' جیلر نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''پولیس کمشنر کو قتل کرنے والا انقلابی ہمارے نصیب میں کہاں لکھا تھا۔''

یہ سن کر جگت حیرت زدہ ہو گیا۔ برابر والی کوٹھڑی میں گرو بخش بند ہے؟ جیلر کو جگت کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ ورنہ ایک دوسرے کی جان پہچان والے خطرناک قیدیوں کو برابر میں رکھنے کا خطرہ وہ کبھی مول نہ لیتا۔ جگت کو اب خیال آیا کہ اس کا نام سن کر برابر والا کیوں چپ ہو گیا تھا۔ دو دن سے پرانے دوست پڑوسی ہونے کے باوجود دونوں میں

سے کسی کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ گرو بخش کی صورت دیکھنے کی اسے خواہش ہوئی۔ مگر وہ کیوں بھوک ہڑتال کر رہا ہے؟ اسے پھانسی دینے کا دن مقرر ہو گیا ہے۔ یہ سب جاننا پڑے گا۔ اس کے باوجود کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ گرو بخش سے اس کی گہری دوستی ہے۔ اب یہ کوٹھڑی چھوڑ کر اس سے دور بھی نہیں جانا کچھ دیر بعد ماحول پرسکون ہو گیا۔ لہٰذا جگت اپنی اور گرو بخش کی کوٹھڑی کی درمیانی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس طرح دیوار کو تھپتھپایا جیسے وطن کی محبت میں اس کی پیش کی ہوئی قربانی کی داد دے رہا ہو، ساتھ ہی ہتھکڑی کی زنجیر کھنکھنائی اسے فوراً دوسری جانب سے اسی طرح کا جواب ملا۔ جگت کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے پھر دیوار پر زوردار ہاتھ مارا۔ پڑوس سے جواب ملا وہ اس طرح دیوار سے سینہ ٹکا کر کھڑا ہو گیا جیسے لمبے عرصے کے بعد اپنے پیارے دوست سے مل رہا ہو۔ پرمسرت انداز میں اس کا دل دھڑکنے لگا۔ شام کو جیل سپرنٹنڈنٹ میکلین صاحب آئے۔ انہوں نے گرو بخش کو بہت سمجھایا۔ سیاسی قیدی کی حیثیت سے انتظام کے مطالبے کے لیے درخواست لکھنے کی تجویز بتائی۔ چار چھ دن میں اوپر سے جواب آئے۔ اس صورت میں ممکن حد تک چھوٹ چھاٹ دینے کی تیاری بتائی۔ مگر گرو بخش اپنی ضد پر اٹل رہا۔

''میں درخواست نہیں لکھنا چاہتا تم گورے ہمارے دیش کے مالک بن بیٹھے ہو مگر میں تمہارے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔ جب تک میرا مطالبہ منظور نہیں ہوگا اس وقت تک بھوک ہڑتال جاری رہے گی۔''

سپرنٹنڈنٹ صاحب سر جھکائے ہوئے چلے گئے۔ جیل کا معمولی قیدی ہنگر اسٹرائیک کا ہتھیار اٹھا لے تو جیل والے بوکھلا جاتے ہیں جبکہ وہ تو انقلابی قیدی تھا۔ پھر وہ بھی پھانسی والا۔ سوپر صاحب کی نیند حرام ہو گئی۔ انہوں نے وارننگ دے دی۔

''بات باہر نہیں جانی چاہیے ورنہ اخبار والے رائی کا پربت کر دیں گے۔'' روٹی کے وقت جیل کا ڈاکٹر عجیب قسم کے ہتھیار لے کر آ پہنچا۔ کمپاؤنڈر کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی۔ دوسرے ہاتھ میں جالی دار کٹوری تھی۔ ان کے ساتھ ڈپٹی جیلر اور ایک میٹ تھا۔ گرو بخش کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اسے باہر چوک میں لایا گیا۔ فرش پر اسے لٹایا شانے کے نیچے ٹیک کے لیے باردانے کا تھیلا تہہ کر کے لگایا۔ میٹ نے اس کے پیر تھام لیے۔ گرو بخش نے پیر اچھال کر اسے دور دھکیلنے کی کوشش کی مگر اس کے دونوں ہاتھ بھی بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ جیل کے ڈاکٹر نے اپنا ایک گھٹنا اس کے ایک شانے پر رکھ کر اسے دبایا۔ گرو بخش شور کرنے لگا۔

''نہیں، نہیں میں ایک قطرہ بھی منہ میں نہیں جانے دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے دانت بند کر لیے جگت اپنی کوٹھڑی کی سلاخیں تھام کر دھڑکتے دل سے سن رہا تھا۔ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی کچھ کر سکتا تھا اسے افسوس ہونے لگا۔ گرو بخش نے دانت بند کر لیے مگر جیل کے ڈاکٹر کو اس سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی۔ انہیں تو ناک کے راستے خوراک پیٹ میں روانہ کرنا تھی۔ جالی دار کٹوری کے ساتھ جڑی ہوئی ربر کی نلکی دوسرے کنارے پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گرو بخش کے ناک پر انہیں جما کر اس نے ڈپٹی جیلر کو کہا۔

''اب کٹوری میں آ بجیکٹ ڈالنا شروع کر دیں۔''

انڈے اور موسمی کے رس والا دودھ نلکی میں بہنے لگا۔ ناک میں آ بجیکٹ گیا تو گرو بخش بوکھلا اٹھا۔ اس نے زور کر کے ناک پر سے نلکی ہٹانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس طرح کی حرکت کرنے سے

دودھ کی دھار اس کے رخسار پر بہنے لگی۔ جگت سنگھ جیسی اس کی مونچھ بھیگ گئی۔ داڑھی تو اس نے بم پھینکنے سے پہلے ہی صاف کرادی تھی۔

آدھا پیالہ دودھ اس کے پیٹ میں گیا ہوگا کہ گرد بخش بری طرح مشتعل ہوگیا۔ اس نے ہاتھ پیروں کا ایک ساتھ زور لگا کر ڈاکٹر کو دور دھکیل دیا۔ اس کے دھکے سے ڈپٹی جیلر کے برابر پڑی ہوئی بالٹی الٹ گئی۔ سارا دودھ فرش پر پھیل گیا۔ گرو بخش کے چہرے پر فتح مندانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے پیشانی کا پسینہ خشک کیا۔

"جوان اگر تم ہنگامہ کرو گے تو ہمیں ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں خوراک دینا پڑے گی۔" ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

"اگر ایسی زبردستی کرو گے تو میں زبان دانتوں میں کچل کر مرجاؤں گا۔" گرد بخش نے جوابی دھمکی دی۔ ڈاکٹر اور ڈپٹی اترے ہوئے چہروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"اب کیا کریں؟"

شام کے وقت جگت کو اس کے سیل سے ٹہلنے کی خاطر باہر نکالا گیا۔ سلاخوں کی چھت سے اس نے آسمان پر پھیلی ہوئی شفق کی سرخی دیکھی جیسے آسمان پر گلابی رنگ بکھیر دیا گیا ہو۔ دن میں دو بار اسے آسمان دیکھنا نصیب ہوتا تھا۔ پنجرے میں بند شیر کی طرح وہ اس چھوٹے سے بارہ فٹ کے چوک میں ٹہلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ برابر والی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور جگت کے کان چمک گئے۔ سنتری دوسری کوٹھڑیاں کھولنے لگا۔ اتنی دیر میں اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"گرد بخش۔"

"بول جگت۔" اس نے دیوار کے قریب آکر کہا۔

"یہ بھوک ہڑتال کا کیا ڈرامہ ہے؟" جگت نے بے چینی سے مگر دھیمے لہجے میں پوچھا۔ کچھ دیر تک جواب نہیں ملا۔ سنتری اب آخری کوٹھڑی کھول رہے تھے۔ جگت نے پھر سوال کیا۔ "جلدی بتا یہ کیا ڈرامہ ہے؟"

"جگت یہ ڈرامہ نہیں ترکیب ہے، فرار ہونے کی ترکیب تم خاموشی سے دیکھتے رہو تمہارے بھی کام آئے گی۔" گرو بخش نے کہا۔ اسی لمحے سنتری کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"کمبخت بھوکا مرجائے گا چھوڑ دے یہ بھوک ہڑتال۔" جگت، گرو بخش کو ڈانٹنے والے لہجے میں بولا۔ گرد بخش بغیر جواب دیے خاموشی سے ٹہلنے لگا۔

گرو بخش کی ہڑتال نے جیل میں ہلچل پیدا کردی۔ چوری، لوٹ، خون جیسے جرائم کی سزا بھگتنے والے جیل کے قیدی انقلابی کی بہادری سے پگھل گئے۔ اندر ہی اندر سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"اپنا دیس بند ہو، اس طرح بھوک سے تڑپے، اس حالت میں ہم کو کھانا کس طرح بھاتا ہے؟ ایسا کہنے والوں کے جواب میں کچھ لوگ نکتہ چینی بھی کرتے کہ "اسے پھانسی کی سزا مل چکی ہے مہینے دو مہینے میں پھانسی لگ جائے گی پھر اتنے تھوڑے عرصے کے لیے کھانے پینے کا یہ لڑکا کیوں شکایت کررہا ہے؟"

"گرد بخش کی ہمدردی میں ہم بھی بھوک ہڑتال شروع کردیں۔" اس پر اشارہ بھی ہوا اس پر اختلاف بھی ہوا۔ سارا دن سخت محنت مزدوری کررہے ہیں اور بھوکے کس طرح رہ سکتے ہیں؟ آدھا گھنٹہ روٹی لیٹ ہوجائے اس صورت میں جمعدار کے نام سے گالیوں کا طوفان مچانے والے بھوک ہڑتال کس طرح کرسکتے ہیں؟

سب سے بڑا ڈر تھا انجام کا۔ جیل کے قانون کے

مطابق ہڑتال کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ جن قیدیوں کے اچھے چال چلن سے ان کی سزا میں تھوڑی بہت راحت ملی ہو ان پر کراس کا نشان لگ جاتا ہے۔ دو مہینے رشتہ داروں کا منہ دیکھنے اور ان سے دو باتیں کرنے کا راستہ بھی بند ہوجاتا ہے۔ جیلر کی آنکھوں میں آجاتے ہیں۔ اس صورت میں چوری چھپے بیڑی یا دوسرے نشے کی عادت ہونے پر پکڑے جانے پر سخت سزا بھگتنے کی باری آجاتی ہے۔ گرو بخش جیسے پھانسی کے قیدیوں کو چاہے نقصان نہ ہو مگر جو جیل کے دن کسی گڑبڑ کے بغیر کاٹ رہے تھے اور واپس لوٹنے کی خواہش میں زندہ تھے ان کے لیے یہ ناقابل برداشت بات تھی جیسے راستے چلتے ہوئے سانپ کو ہاتھ میں پکڑ لیا جائے۔

اس طرح قیدیوں کی متحدہ بھوک ہڑتال کی بات ہوا میں رہ گئی۔ مگر اس سے ایک فائدہ ہوا۔ ایسی ہلچل نے جیل کی فضا میں سنسنی پھیلا دی۔ جیل افسران کی ناک قیدیوں میں بغاوت کی بو پاکر پھولنے پچکنے لگی۔

"گرو بخش کی ضد کے سامنے کچھ نرمی اختیار کرنے میں ہمارا کیا بگڑتا ہے؟" ایسی دلیلیں دی جانے لگیں انگریز سوپر صاحب کی نیند اور بھوک حرام ہوگئی تھی کیونکہ اخبار ان کے پیچھے پڑ چکے تھے۔

"لاہور جیل میں محب وطن گرو بخش پر تشدد ہورہا ہے۔" "ڈیڑھ آنکھ والے جیل سپرنٹنڈنٹ میکلین کی حاکمیت۔" ایسی خبریں صبح شام سوپر صاحب کے دل پر چرکے لگانے لگیں۔ اس کے باوجود گورنر نرمی اختیار کرنے کو راضی نہیں تھا۔ پولیس کمشنر ولیم کے قاتل سے نرم برتاؤ کیسا؟ گرد بخش کی ضد کے جواب میں اس نے پھانسی کا دن جلدی مقرر کردیا اور حکم نامہ شائع کردیا۔

"آج سے بارہویں دن اسے پھانسی دی جائے۔"

جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لیے اس حکم سے مشکلات بڑھ گئیں۔ نیم جان قیدی کو پھانسی کس طرح دی جائے؟ ممکن ہے پھانسی کے دن سے پہلے ہی گرو بخش کا دم ٹوٹ جائے؟ اس صورت میں سخت آفت آجائے جیل کوڈ کا اصول ہے کہ جسے گلے میں رسی ڈال کر پھانسی دی جانی ہو اسے کسی اور طریقے سے نہیں مرنا چاہیے۔ اسی لیے تو اس پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ پھانسی کا قیدی قدرتی یا غیر قدرتی موت سے پہلے مرجائے اس صورت میں قانون کا شکار چھن جاتا۔ دو سال پہلے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا پائے ہوئے ایک قیدی نے نجانے کس طرح رسی کا انتظام کرلیا۔ وہ جیل میں ہی لٹک گیا تھا مگر سوپر صاحب کے نصیب اچھے تھے کہ اس کی جان بچ گئی۔ سنتری نے اسے بچا لیا فوراً ہی اس کا میڈیکل ٹریٹمنٹ کیا گیا۔ اسے صحت یاب کرنے کے لیے میکلین صاحب بوکھلا گئے تھے جیسے وہ اپنے سگے بیٹے کو موت کے منہ سے بچانا چاہتے ہوں۔ ایک ہفتہ بعد اسے پھانسی دے کر اپنا فرض ادا کرنے والی روح نے فتح کا فخر محسوس کیا۔

یہی وجہ تھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو گرد بخش کی فکر ستا رہی تھی۔ بارہویں دن پھانسی دینے کا حکم سنانے کے لیے وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا گرد بخش کی کوٹھڑی پر پہنچ گیا۔

پہرے پر موجود سنتریوں نے زور دار سلیوٹ دے کر سوپر صاحب کا استقبال کیا۔ اپنی کوٹھڑی میں چکی پیستے ہوئے جگت کے ہاتھ رک گئے۔ جوتوں کی آہٹ سے اسے پتا چل گیا کہ بڑے صاحب آرہے ہیں۔ گرد بخش کی کوٹھڑی کی جانب چھوٹے بڑے صاحبوں کی بار بار آمد ہورہی تھی۔ وہ لوگوں کی بات

چیت اور چہروں کے تاثرات سے حالات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ آج سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ہاتھوں میں سرکاری کاغذات دیکھ کر اس کا تجسس بڑھ گیا۔ پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اشارہ کیا۔ اسی لمحے ایک سنتری نے آگے بڑھ کر گرو بخش کے سیل کا دروازہ کھول دیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے جوتے کی آہٹ چوک کے فرش پر ہوئی مگر کمبل اوڑھے سوئے ہوئے گرو بخش کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے آواز دی۔

"قیدی نمبر نو سو اٹھاون آرڈر آ گیا ہے۔"

مگر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تب اسے خوف محسوس ہوا۔ اشارہ کر کے اس نے سنتری کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ سیل میں داخل ہو کر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے گرو بخش کے چہرے پر سے کمبل اتار دیا۔

"شکر ہے سانس چل رہی ہے۔" سوپر بڑبڑایا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح جل رہی تھی۔ پانچ دن کی بھوک ہڑتال سے اس کے چہرے کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ اسے بلایا جلایا جب وہ ہلکی آواز میں کراہا۔ سوپر صاحب کہنے لگا۔

"تمہاری پھانسی کا حکم آ چکا ہے۔ آج سے بارہویں دن...... سمجھے، میں پڑھ کر سناتا ہوں۔"

مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

"بارہویں دن اس کی لاش کو ہی پھانسی دینی پڑے گی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے جمعدار کو اس نے حکم دیا۔

"جاؤ، جلدی سے ڈاکٹر سین کو بلاؤ۔" جگت چونک گیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ معاملہ کافی سنجیدہ ہے۔

"صاحب اس کی حالت کیسی ہے؟" یہ الفاظ اس کے لبوں پر آ کر واپس لوٹ گئے۔ اسے گرو بخش کی فکر ہے اس بات کا سوپر صاحب کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ لہٰذا اس نے دوسرے طریقے سے کہا۔

"بس صاحب پانچویں دن انقلابی ٹھنڈا پڑ گیا۔ سالا پھانسی سے ڈر گیا۔ لہٰذا بھوک ہڑتال کا ڈراما کرنے لگا۔" سوپر کو اس کی بات سننے یا جواب دینے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ پھانسی کا اسے ڈر تھا تو پھر اس نے تاج کو رحم کی اپیل کیوں نہیں کی؟ عمر قید مل جاتی۔ اس صورت میں زندہ تو رہتا۔ ڈاکٹر سین کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسے دھوتی کرتے میں دیکھ کر سوپر سمجھ گیا کہ دوپہر کی نیند چھوڑ کر دوڑا آیا ہے۔ دوسری صورت میں ڈاکٹر کا یہ دیسی لباس میکلین صاحب کو کھٹکتا۔ سین کے "گڈ آفٹرنون" کے جواب میں سوپر نے کہا۔

"اچھا ہوا آپ نے کپڑے تبدیل کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔" پھر ہاتھ میں تھامے ہوئے کاغذات دکھاتے ہوئے بولا۔

"قیدی کو پھانسی کا حکم نامہ سنانے آیا تھا مگر......"

ڈاکٹر سین زیادہ بات سننے کی بجائے سیل میں داخل ہو گیا۔ جمعدار کے ہاتھ سے بیگ لے کر اس میں سے اسٹیتھو اسکوپ نکال کر جلدی سے مریض کو دیکھنے لگا۔ گرو بخش کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ سانس کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ نبض کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ سوپر بے چین نظروں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھ رہا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)